تفسیر الفرقان

مؤلف ڈاکٹر اسلامی محمد طاہر بھٹی المالکی چک قاسمکا

جلد (16)

سورہ طہ (مکمل)

سورہ الانبیاء (مکمل)

سورہ الحج (مکمل)

سورہ المومنون (مکمل)

تفسیر الفرقان

مؤلف ڈاکٹر اسلامی محمد طاہر بھٹی المالکی چک قاسمکا

جلد (16)

سورہ طہ (مکمل)

سورہ الانبیاء (مکمل)

سورہ الحج (مکمل)

سورہ المومنون (مکمل)

جملہ حقوق طباعت واشاعت محفوظ ہیں

نام کتاب======== تفسیر الفرقان

نام مصنف======== محمد طاہر بھٹی چک قاسمکا

جلد نمبر======== (16)

صفحات ======== 500

قیمت ======== 0

ڈاکٹر اسلامی محمد طاہر بھٹی المالکی چک قاسمکا

موبائل نمبر

03477172726 , 03030144460

ایڈریس

چک قاسمکا تحصیل وضلع بہاولنگر، پنجاب پاکستان

E-mail:Tahirbhatti697@gmail.com

فہرست

عنوانات	نمبر شمار
سورہ طٰہٰ	13
وجہ تسمیہ	13
سورہ طٰہٰ کا زمانہ نزول	13
سورہ طٰہٰ کے فضائل	17
مضامین کا خلاصہ	17
حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا آگ کو دیکھنا	24
عصا رکھنے کے کچھ فوائد	30
عصائے موسیٰ کی تاریخی حیثیت	32
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں گرہ کی وجوہ	35
موسیٰ (علیہ السلام) پر اللہ تعالیٰ کا دوسرا احسان عظیم	40
یوم زینت کا مصداق	51
جادوگروں کی تعداد	53

فرعونی کے جادوگروں کا ایمان لانا	58
فرعون کی بیوی کا ایمان لانا	62
زیورات سے بچھڑا بنانے کی تفصیل	75
موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام پر ناراض ہونا	78
قرآن کریم سے اعراض کرنے کا انجام	87
قیامت کا پس منظر	88
شان نزول: (آیت) "ویسئلونک عن الجبال"۔(الخ)	91
قیامت کے روز شفاعت کی نوعیت	93
قرآن مجید کی صفات	96
شان نزول: (آیت) "۔ولاتعجل بالقران"۔(الخ)	97
انبیاء (علیہم السلام) صغیرہ وکبیرہ گناہ نہیں کرتے	104
عذاب میں تاخیر کا سبب	114
شان نزول: (آیت) "ولاتمدن عینیک"۔(الخ)	119
سورہ الانبیاء	130

وجہ تسمیہ	130
زمانہ نزول	131
مضامین کا خلاصہ	132
ماضی میں تباہ شدہ اقوام	144
شرک کا رد	149
فرشتوں کا مکلف ہونا	158
مرتکب کبیرہ کے لیے شفاعت کا جواز	161
شان نزول: (آیت) "۔وما جعلنا لبشر من قبلک"۔(الخ)	165
شان نزول:	172
عجلت کا انسان کی فطرت میں شامل ہونا	173
معاملہ کی تحقیقات	194
ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے والے کا مصداق	197
حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں ڈالنے کا واقعہ	197
حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر آگ کا ٹھنڈا ہونا	199

نمرود اور اس کی قوم کا عذاب سے ہلاک ہونا	201
حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا حضرت لوط (علیہ السلام) کے ساتھ عراق سے شام کی طرف ہجرت فرمانا	202
شام کا برکت والی سرزمین ہونا	203
حضرت اسحاق (علیہ السلام)	206
نوح (علیہ السلام) کی دعا	209
حضرت داؤد (علیہ السلام) کا نام ونسب	211
حضرت داؤد (علیہ السلام) کی فضیلت میں احادیث	212
حضرت داؤد (علیہ السلام) کی وفات	213
حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا نام ونسب	214
حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے احوال اور فضائل	214
حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی وفات	215
انبیاء (علیہم السلام) کا مختلف پیشوں کو اپنانا	219

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے لیے تیز ہواؤں اور نرم ہواؤں کو مسخر کرنا	220
جنات کو حضرت سلیمان علیہ اسلام کے تابع کرنا	221
حضرت ایوب (علیہ السلام) کا نام ونسب	224
حضرت ایوب (علیہ السلام) کو آزمائش میں مبتلا کیا جانا	227
حضرت اسماعیل اور حضرت ادریس (علیہما السلام) کا تذکرہ	233
کیا حضرت ذوالکفل نبی تھے؟	235
حضرت ذوالکفل کو نبی بنانے کا واقعہ	237
سیدنا یحییٰ (علیہ السلام) کا ذکر گرامی	245
حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کے حالات زندگی	245
حضرت مریم علیہا السلام کا تذکرہ	246
بہتر اور تہتر فرقے	250
یاجوج ماجوج کا تذکرہ	255
شان نزول: (آیت) "انکم وما تعبدون"۔ (الخ)	257

سورہ الحج	271
وجہ تسمیہ	271
مقام نزول	271
تعبیر	272
مضامین کا خلاصہ	272
شان نزول: (آیت) "ومن الناس من یجادل"۔(الخ)	278
شان نزول: ومن الناس من یعبد اللہ"۔(الخ)	287
مجوسیوں کا مذہب	292
صابئین کے بارے میں تین قول	293
شان نزول: (آیت) ھذان خصمن"۔(الخ)	297
آخرت میں مومنوں پر چار قسم کے انعامات	301
شان نزول: (آیت) "ومن یردفیہ"۔(الخ)	304
قربانی کی تاریخ	325
شان نزول: (آیت) "لن ینال اللہ لحومہا"۔(الخ)	331

شان نزول: (آیت) "اذن للذین یقتلون"۔ (الخ)	335
شان نزول: (آیت) "۔ وما ارسلنا من قبلک"۔ (الخ)	350
شان نزول: (آیت) "ذلک ومن عاقب بمثل ما عوقب"۔ (الخ)	361
جہاد کا حق کس طرح ادا کیا جائے	380
سورہ المومنون	383
تعبیر	383
وجہ تسمیہ	383
زمانہ نزول	385
مضامین کا خلاصہ	385
شان نزول: (آیت) "۔ الذین ھم فی صلاتھم خشعون"۔ (الخ)	387
رسول کا اپنی قوم کی طرف پیغام پہنچانا اور قوم کا سرکشی سے رد کرنا	416
تکذیب اور تکبر کا انجام	423
حضرت عیسیٰ (علیہ السلام)	426
حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی پیدائش	426

ربوہ کا مطلب	427
انبیاء کرام (علیہ السلام) حلال ہی کھاتے ہیں	430
مومنوں کی تحسین کی پانچ وجوہات	437
انسان کو اس کی طاقت کے مطابق مکلف بنایا گیا ہے	440
شان نزول: (آیت) "۔مستکبرین بہ"۔(الخ)	443
پیغمبر تو صراط مستقیم کی طرف بلاتا ہے	448
شان نزول: (آیت) "۔ولقد اخذنھم بالعذاب"۔(الخ)	449
عرش عظیم کی قدرت	459
برزخ کا معنی	476
قیامت کے دن رشتے ناطوں کا قائم نہ رہنا اور اپنے اپنے حقوق وصول کرنا	478
حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا رشتہ برقرار رہے گا	479
سیدنا حضرت عمر بن خطابؓ کا حضرت ام کلثومؓ سے نکاح	480
حضرت سیدتنا فاطمہؓ کے فضائل اور مناقب کی احادیث	482

پہلا نفخہ اور دوسرا نفخہ	485
منکروں کا اعتراف	490
جہنمیوں کی فریاد	491
دنیا کی زندگی بہت کم معلوم ہوگی	494
پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے	500

سورہ طٰہٰ

یہ سورہ مکی ہے اس میں ایک سو پینتیس آیتیں اور آٹھ رکوع ہیں اور ایک ہزار تین سو ایک کلمات اور پانچ ہزار دو سو بیالیس حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

سورت کی ابتداء لفظ طٰہٰ سے ہوئی ہے۔ یہ سورت اسی لفظ سے موسوم و مشہور ہوگئی۔ اس کا نام الکلیم بھی ہے۔ جیسا کہا امام سخاوی ؒ نے جمال القرآن میں ذکر کیا ہے۔ [1]

سورہ طٰہٰ کا زمانہ نزول

یہ سورت اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین مسلمان پر بہت مظالم ڈھا رہے تھے اور بہت کم تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے تھے اور ابھی تک مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت نہیں کی تھی اور نہ اس وقت تک حضرت عمر اسلام لائے تھے حضرت عمر بعثت نبوی کے پانچ سال بعد اور حبشہ کی طرف ہجرت سے پہلے مسلمان ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ کا قبول اسلام

امام عبدالمالک بن ہشام المعافری المتوفی 213ھ لکھتے ہیں:

امام ابن اسحاق ؒ بیان کرتے ہیں کہ مجھ تک جو خبر پہنچی ہے اس کے مطابق حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ بنت خطابؓ حضرت سعید بن زید کے نکاح میں تھیں وہ اسلام لا چکی تھیں اور ان کے شوہر سعید بن زیدؓ بھی مسلمان ہو چکے تھے اور وہ دونوں اپنے اسلام کو

۱۔ (تفسیر روح المعانی 147 / 16)

حضرت عمرؓ سے مخفی رکھتے تھے۔ بنوعدی کے ایک شخص نعیم ابن عبداللہؓ بھی مسلمان ہو چکے تھے اور وہ بھی اپنی قوم کے خوف سے اپنے اسلام کو مخفی رکھتے تھے اور حضرت خباب بن ارتؓ قرآن مجید پڑھانے کے لیے حضرت فاطمہ بنت خطابؓ کے گھر جایا کرتے تھے ایک دن حضرت عمرؓ تلوار حمائل کئے ہوئے (العیاذ باللہ) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب کو قتل کرنے کے ارادہ سے گھر سے نکلے اور حضرت عمر کو یہ بتایا گیا تھا کہ وہ سب صفا پہاڑ کے پاس ایک گھر میں ہیں اور اس وقت مسلمان مردوں اور عورتوں کی تعداد چالیس کے قریب تھی اور اس وقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ آپ کے عم محترم سیدنا حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ، حضرت ابوبکر صدیق بن ابوقحافہؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ اور دیگر مسلمان تھے جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مکہ میں ہی مقیم تھے اور حبشہ نہیں گئے تھے۔ جب حضرت عمر سے نعیم بن عبداللہؓ ملے تو ان سے پوچھا: اے عمر تم کہاں جا رہے ہو؟ حضرت عمر نے کہا میں نے (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارادہ کیا ہے جو دین بدلنے والے ہیں جنہوں نے قریش میں پھوٹ ڈال دی ہے اور ان کے نوجوان اور کم عقل لڑکوں کو بہکایا ہے ان کے دین کی مذمت کی ہے اور ان کے خداؤں کو برا کہا ہے، سو میں ان کو قتل کروں گا۔ حضرت نعیمؓ نے کہا، ادھر بعد میں جانا، پہلے اپنے گھر کی خبر لو، تیری بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید بن زید اس نبی مکرم کا کلمہ پڑھ چکے ہیں۔ حضرت عمر اپنی بہن اور بہنوئی کا قصد کر کے واپس ہوئے، اس وقت ان کے پاس حضرت خباب بن ارتؓ کی آہٹ سنی تو انہوں نے حضرت خبابؓ کو گھر میں کہیں چھپا دیا اور حضرت فاطمہ بنت خطابؓ نے وہ صحیفہ بھی چھپا دیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت خبابؓ کے قرآن پڑھنے کی آواز سن لی تھی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو پوچھا یہ کیسی آواز تھی؟ ان دونوں نے کہا ہم نے تو کوئی آواز نہیں

سنی، حضرت عمر نے کہا کیوں نہیں! خدا کی قسم! مجھے اطلاع مل چکی ہے کہ تم دونوں (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دین کی پیروی کر رہے ہو، پھر انہوں نے اپنے بہنوئی حضرت سعید بن زیدؓ کے ایک تھپڑ مارا، ان کی بہن اپنے شوہر کو بچانے کے لیے کھڑی ہوئی تو اس کو بھی مارا اور ان کا سر پھاڑ دیا جب انہوں نے بہت مارا تو ان کی بہن اور بہنوئی نے کہا ہاں ہم مسلمان ہو چکے ہیں، ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا چکے ہیں، اب جو تمہارے جی میں آئے کرو، جب حضرت عمرؓ نے اپنی بہن کا خون بہتے ہوئے دیکھا تو ان کو اپنے مارنے پر ندامت ہوئی اور وہ مارنے سے رک گئے اور اپنی بہن سے کہا اچھا مجھے اپنا وہ صحیفہ دکھاؤ جس کو تم ابھی پڑھ رہے تھے۔ میں بھی دیکھوں (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا پیغام لے کر آئے ہیں اور حضرت عمر پڑھے لکھے انسان تھے، جب حضرت عمر نے یہ کہا تو ان کی بہن نے کہا ہمیں خطرہ ہے کہ تم اس صحیفہ کی توہین نہ کرو، حضرت نے کہا تم مجھ سے مت ڈرو اور اپنے بتوں کی قسم کھا کر کہا وہ اس صحیفہ کو واپس کر دیں گے۔ [1] جب حضرت عمر نے یہ کہا تو ان کی بہن کو امید ہوئی کہ شاید وہ اسلام لے آئیں۔ انہوں نے کہا اے بھائی تم ناپاک ہو اور مشرک ہو اور قرآن مجید کو پاک شخص کے سوا کوئی نہیں چھو سکتا، حضرت عمر نے غسل کیا اور ان کی بہن نے ان کو صحیفہ دے دیا جس میں لکھا ہوا تھا طہ جب انہوں نے اس کی ابتدائی آیات پڑھیں تو انہوں نے کہا یہ کس قدر حسین اور عظیم کلام ہے۔ جب حضرت خبابؓ نے حضرت عمرؓ کا یہ قول سنا تو وہ اپنی چھپی ہوئی جگہ سے باہر آ گئے اور انہوں نے کہا اے عمر! اللہ کی قسم! مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی دعا تیرے حق میں خصوصیت کے ساتھ قبول کر لی ہے کیونکہ میں نے آپ کو یوں دعا کرتے ہوئے سنا ہے کہ اے اللہ!

۱۔ (سنن دار قطنی رقم الحدیث: 435 سنن کبریٰ ج ۱ ص 88)

اسلام کی ابوالحکم بن ہشام سے تائید فرمایا عمر بن خطاب سے۔ [1]

اس وقت حضرت عمر نے کہا اے خباب! (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف میری رہنمائی کرو تا کہ میں اسلام لاؤں، حضرت خباب نے کہا وہ پہاڑ صفا کے پاس ایک گھر میں ہیں اور ان کے ساتھ ان کے اصحاب بھی ہیں، حضرت عمر نے اپنی تلوار لٹکائی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب کی طرف چل پڑے اور جا کر ان کا دروازہ کھٹکھٹایا، جب انہوں نے دستک کی آواز سنی تو اصحاب میں سے کسی نے اٹھ کر دروازہ کی جھری میں سے جھانک کر دیکھا اور گھبرا کر کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ تو عمر ہے وہ تلوار لٹکائے ہوئے آیا ہے۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ نے کہا اس کو آنے دو اگر وہ کسی نیکی کے ارادہ سے آیا تو ہم اس کو خوش آمدید کہیں گے اور اگر وہ کسی برائی کے ارادہ سے آیا ہے تو ہم اس کو اسی کی تلوار سے قتل کر دیں گے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس کو آنے کی اجازت دو، پھر اس نے اجازت دے دی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنا تہبند سنبھالتے ہوئے کھڑے ہوئے پھر حضرت عمرؓ کو اپنی طرف زور سے کھینچا اور فرمایا اے عمر تم کس لیے آئے ہو؟ پس اللہ کی قسم! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس وقت تک باز نہیں آؤ گے حتیٰ کہ اللہ تم پر کوئی سخت عذاب بھیج دے۔ حضرت عمر نے کہا میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں تا کہ میں اللہ پر اس کے رسول پر اور اللہ کے پاس سے لائی ہوئی چیزوں پر ایمان لاؤں، یہ سن کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بہ آواز بلند فرمایا اللہ اکبر، حتیٰ کہ گھر میں موجود تمام اصحاب نے جان لیا کہ عمرؓ اسلام لے آئے ہیں۔

ا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 3681، الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص 267 مسند احمد ج ۲ ص 95 صحیح ابن حبان رقم الدیث، 6881 المستدرک ج ۳ ص 83 دلائل النبوۃ ج ۲ ص 215)

سورہ طٰہٰ کے فضائل

(1)۔۔حضرت معقل بن یسارؓ سے روایت ہے، حضور پرنور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا" مجھے سورہ بقرہ ذکر سے عطا کی گئی ہے، سورہ طٰہٰ اور سورہ الطور حضرت موسیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تختیوں سے عطا کی گئی ہیں، سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی آخری آیتیں عرش کے نیچے موجود خزانوں سے عطا کی گئی ہیں اور مفصل (سورتیں) اضافی دی گئی ہے۔ [1]

(2)۔۔حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ سے سورہ طٰہٰ اور سورہ یٰس کے ساتھ حضرت آدم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تخلیق سے ایک ہزار سال پہلے کلام فرمایا اور جب فرشتوں نے قرآن سنا تو کہا: اس امت کو مبارک ہو جس پر یہ کلام نازل ہوگا، ان سینوں کو مبارک ہو جن میں یہ کلام محفوظ ہوگا اور ان زبانوں کو مبارک ہو جو یہ کلام پڑھیں گی۔۔۔۔ [2]

(3)۔۔حضرت عمر فاروقؓ اسلام قبول کرنے سے پہلے اسی سورت کی ابتدائی آیات پڑھ کر پکار اٹھے کہ یہ کس قدر حسین اور عظیم کلام ہے اور اس کے بعد آپ نے اسلام قبول کرلیا۔

مضامین کا خلاصہ

رکوع 1: قرآن نازل کرنے کی حکمت، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ پھر مقدس وادیٔ طویٰ میں اللہ تعالیٰ کا حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہونے کا بیان ہے۔ آخر میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو عصا اور

۱۔اسنادہ ضعیف جداً

۲۔اسنادہ ضعیف

ید بیضا کے معجزے عطاء کئے جانے کا احوال ہے۔

رکوع 2: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور اس کی قبولیت اور پھر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو تبلیغ دین کے لیے فرعون کی طرف جانے کا حکم اور دونوں حضرات کا اللہ تعالیٰ سے اپنی کمزوری کی شکایت کرنا مذکور ہے۔ پھر حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان سوال و جواب کا بیان ہے۔

رکوع 3: انسان کا آغاز و انجام اور حضرت موسیٰ کا فرعون سے مناظرہ بیان کیا گیا ہے، پھر حضرت موسیٰ کا ساحروں کو خطاب، ساحروں کی مبارزت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا زمین پر ڈالنے کا حکم مذکور ہے ۔ اس کے بعد ساحروں کا ایمان لانا ۔ فرعون کا بے بسی میں ساحروں پر غصے ہونا اور ساحروں کی استقامت کا بیان ہے۔ آخر میں فرعون کو نصیحت کی گئی ہے۔

رکوع 4: بنی اسرائیل کا مصر سے خروج، فرعون کا بنی اسرائیل کے تعاقب میں جانا اور غرق ہونا اور بنی اسرائیل کو نصیحت کی گئی ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر جانا، ان کے بعد سامری کا قوم کو گمراہ کرنا، مذکور ہے۔ آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طور سے واپس آ کر قوم پر برہم ہونے کا بیان ہے۔

رکوع 5: بنی اسرائیل کی حماقت، حضرت موسیٰ کا حضرت ہارون اور سامری سے باز پرس کرنا اور سابقہ امتوں کے واقعات سنانے کی حکمت کا بیان ہے۔ پھر حشر میں مجرموں کا حال بیان کیا گیا ہے۔

رکوع 6: قیامت کے روز پہاڑوں کا ریزہ ریزہ ہونا اور کسی کے لیے کسی کی سفارش کام نہ آنا مذکور ہے۔ آخر میں منکرین کو ان کے کفر و شرک پر تنبیہ کی گئی ہے۔

رکوع 7: حضرت آدم کو بھول، شیطان کا حضرت آدم علیہ السلام کو بہکانا اور حضرت آدم کو زمین پر اترنے کا

حکم بیان کیا گیا ہے۔

رکوع ۸: منکرین کو تنبیہ وتہدید پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اسباب عیش پر نظر نہ کرنے کی تاکید ہے۔ آخر میں کفار کی جانب سے معجزات طلب کرنے کا بیان ہے۔

﴿ طٰهٰ ۟ۚ﴿۱﴾ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۙ﴿۲﴾ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۙ﴿۳﴾ ﴾

طا۔ ھا۔ (۱) (اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے آپ پر یہ قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔ (۲) بلکہ یہ تو نصیحت ہے، اس کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ (۳)

اس سورت کو بھی "حروف مقطعات" سے شروع کیا گیا ہے۔ جن حروف کے معنی کا علم اور اس کا بھید اللہ کو معلوم ہے۔ ان حروف پر مفصل بحث سورہ بقرہ کے شروع میں دیکھئے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مشکل اور سخت ترین حالات میں پوری جان سوزی اور اخلاص کے ساتھ تبلیغ دین کا فریضہ ادا فرما رہے تھے۔ آپ رات کی تاریکیوں میں تہجد کی نماز میں لوگوں کی ہدایت کے لیے رو رو کر دعائیں کرتے۔ دن کے وقت تندہی کے ساتھ اصلاح احوال کی کوشش میں مصروف رہتے۔ لیکن مشرکین نا صرف دن بدن کفر وشرک میں آگے ہی بڑھے جا رہے تھے بلکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کرامؓ پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔ جس پر آپ کا دل پسیج جاتا اور آپ غم گین رہتے۔ اس صورت حال میں یہ سورہ مبارکہ نازل ہوئی۔ جس کی ابتدا میں آپ کو تسلّی دیتے ہوئے ارشاد ہوا کہ اے پیارے

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کے رب نے قرآن مجید اس لیے تو نہیں اتارا کہ آپ اپنی استعداد سے بڑھ کر مشقت میں پڑ جائیں۔ دوسرے مقام پر فرمایا کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے تو آپ اپنی جان کو ہلاک کر لیں گے۔ الشعراء آیت: ۳ بیشک قرآن مجید سراپا نصیحت ہے۔ یقین رکھو قرآن مسائل بڑھانے نہیں کم کرنے کے لیے نازل ہوا ہے۔ لیکن اس سے نعمت سے وہی شخص مستفید ہوتا ہے جو اپنے رب کا خوف اور برے انجام سے ڈرنے والا ہے۔ یہی بات قرآن مجید کی پہلی آیت میں کہی گئی ہے۔

اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى: ارشاد فرمایا: (اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ)[یٰسٓ: ۱۱] ”تو تو صرف اسی کو ڈراتا ہے جو نصیحت کی پیروی کرے اور رحمٰن سے بن دیکھے ڈرے۔ سو اسے بڑی بخشش اور باعزت اجر کی خوش خبری دے۔“

سیدنا معاویہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔“[1]

﴿ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝۴ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝۵ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝۶ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفَى ۝۷ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ

۱۔ [بخاری، کتاب العلم، باب من یرد اللہ بہ خیرًا یفقھہ فی الدین: ۷۱۔ مسلم، کتاب الزکوۃ، باب النھی عن المسئلۃ: ۱۰۳۷]

الْحُسْنٰی ﴿۸﴾

یہ (قرآن) اس (ذات) کی طرف سے اتارا ہوا ہے جس نے زمین اور اونچے اونچے آسمان بنائے۔ (۴) وہ رحمن (بہت ہی مہربان) ہے عرش پر قائم ہے (جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے)۔ (۵) اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور جو کچھ گیلی زمین کے نیچے ہے۔ (۶) اور اگر تم اونچی آواز سے کوئی بات کرو وہ تو یقیناً چھپی بات کو بھی اور نہایت مخفی بات کو بھی جانتا ہے۔ (۷) وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اس کے سب نام اچھے ہیں۔ (۸)

(اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى) قرآن مجید اس ذات کبریا نے نازل کیا ہے جس نے زمین اور بلند و بالا آسمانوں کو پیدا کیا ہے۔ زمین و آسمان کو پیدا کرنے کے بعد الرحمن عرش پر مستوی ہوا۔ جس طرح اس کی شایان شان ہے۔ آسمانوں اور زمین میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور جو ما تحت الثریٰ ہے اللہ تعالیٰ اس سب کو جانتا ہے

(لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى) (اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور جو ان دونوں کے درمیان ہے اور جو تحت الثری ہے) اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کا خالق اور مالک ہے علوی اور سفلی جہت میں جو کچھ ہے وہ اسی کی مخلوق اور مملوک ہے

اور ساتویں زمین کے نیچے جو کچھ ہے وہ بھی اسی کا ہے۔

ثری نمناک یعنی تر مٹی کو کہتے ہیں صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس کا مطلب بتاتے ہوئے فرمایا ماتحت الارض السابعۃ یعنی ساتویں زمین کے نیچے جو کچھ ہے وہ اسے بھی جانتا ہے۔ زمینوں کے سات ہونے کی تصریح احادیث میں وارد ہوئی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کا فرمانا اسی کے مطابق ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ایک بالشت کے برابر بھی ظلم کر کے زمین کا کچھ حصہ لیا تو قیامت کے دن اس کے گلے میں ساتوں زمینوں کا طوق ڈال دیا جائے گا۔ بخاری کی ایک روایت میں یوں ہے کہ جس نے ناحق زمین کا کچھ حصہ لے لیا تو قیامت کے دن اسے ساتویں زمین تک دھنسا دیا جائے گا۔ مسند احمد میں یوں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی شخص نے ظلم کر کے بالشت بھر زمین کا کوئی حصہ لے لیا اللہ تعالیٰ اسے مجبور کرے گا کہ وہ کھودے یہاں تک کہ ساتویں زمین کے آخر تک کھودتا جائے۔ پھر اسے قیامت کا دن ختم ہونے تک اس کے گلے میں طوق ڈال دیا جائے گا یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان فیصلے ہوں۔ [1]

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى: سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے ایک کم سو نام ہیں جو شخص ان کو یاد کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔" [2]

۱۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۵۶)

۲۔ [بخاری، کتاب التوحید، باب إن للہ مائۃ إسم إلا واحدۃ: ۷۳۹۲]

﴿ وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝٩ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝١٠ ﴾

اور کیا آپ (علیہ السلام) کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) کی خبر آئی ہے۔(۹) جب انہوں نے آگ دیکھی تو اپنے گھر کے لوگوں سے کہا کہ تم (یہاں) ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے تاکہ میں اس سے ایک انگارہ لے آؤں یا ممکن ہے اس آگ پر مجھے کوئی راستہ بتانے والا مل جائے۔(۱۰)

وہب بن منبہ یمانی بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے حضرت شعیب (علیہ السلام) کی خدمت کرنے کی مدت پوری کردی تو وہ ان سے اجازت لے کر مصر کی طرف واپس روانہ ہوئے، ان کے ساتھ ان کی اہلیہ بھی تھیں اور ایک بکری تھی اور عصا تھا جس سے وہ دن میں بکری کے لیے پتے جھاڑتے تھے اور ایک چقماق تھا جس سے وہ رات کو آگ جلا کر حرارت حاصل کرتے کیونکہ وہ انتہائی سرد موسم تھا اور برفانی راتیں تھیں۔ جب وہ رات آئی جس میں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو نبوت سے مشرف کرنا چاہتا تھا اور ان کو اپنے کلام سے سرفراز کرنا چاہتا تھا اس رات حضرت موسیٰ (علیہ السلام) رات بھول گئے حتیٰ کہ انہیں پتا نہیں چلا کہ وہ کس طرح متوجہ ہوں۔ انہوں نے چقماق نکالا تاکہ اپنے اہل کے ساتھ رات گزارنے کے لیے آگ روشن کریں اس رات وہ چقماق نہ جل

سکا اور وہ اس کو جلانے کی کوشش میں تھک گئے حتیٰ کہ انہوں نے ایک جگہ آگ دیکھی۔ [1]

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے اھل سے کہا تم لوگ ٹھہرو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اھل سے مراد ان کی زوجہ صفوراء ان کا بچہ اور ان کا خادم ہوا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اھل سے مراد صرف ان کی زوجہ ہو کیونکہ اھل کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔ امام ابن جریرؒ نے لکھا ہے کہ ان کی بیوی کا نام صفورا تھا۔ [2]

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا آگ کو دیکھنا

امام احمد بن حنبلؒ متوفی 241ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

وہب بن منبہؒ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے آگ کو دیکھا تو وہ تھوڑی دور چلے حتیٰ کہ آگ کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے۔ انہوں نے دیکھا وہ بہت عظیم الشان آگ تھی جو ایک سرسبز درخت کی شاخوں سے بھڑک رہی تھی اور آگ کے بھڑکنے سے درخت جلنے کے بجائے اور زیادہ سرسبز ہو رہا تھا اور اس کا حسن اور زیادہ نکھر رہا تھا، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے سوچا یہ ایسی آگ ہے کہ اس سے انگارے حاصل نہیں کئے جاسکتے۔ وہ وہاں پر حیران کھڑے ہوئے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ میں یہیں پر کھڑا رہوں یا واپس چلا جاؤں، وہ اسی کیفیت میں تھے کہ اس درخت سے عمودی شکل میں آسمان کی جانب ایک نور بلند ہوا جو سورج کی شعاع کی مثل تھا اور اس پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی وہ اسی خوف اور دہشت کی حالت میں کھڑے ہوئے تھے کہ درخت سے ایک بلند آواز آئی یا موسیٰ!۔ [3]

۱۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 18102، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1416ھ)

۲۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 20864)

۳۔ (حافظ سیوطی نے اس روایت کو امام احمد کی کتاب الزھد، امام ابن ابی حاتم، امام عبد بن حمید اور امام ابن المنذر کے والوں سے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ (الدر المنثور ج 5 ص 554-555)

﴿ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰٓى ﴿١١﴾ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ
اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿١٢﴾ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا
يُوْحٰى ﴿١٣﴾ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ
لِذِكْرِيْ ﴿١٤﴾ ﴾

پھر جب وہ (موسیٰ علیہ السلام) اس آگ کے پاس پہنچے تو انہیں آواز دی گئی اے موسیٰ!۔(۱۱) بیشک میں ہی تمہارا رب ہوں، پس تم اپنے جوتے اتار دو، کیونکہ تم پاک میدان طویٰ میں ہو۔(۱۲) اور میں نے تمہیں (نبوت کے لیے) منتخب کر لیا ہے سو جو کچھ تمہاری طرف وحی کی جا رہی ہے اسے غور سے سنو۔(۱۳) بیشک میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔(۱۴)

وہاں سے آواز آئی، اے موسیٰ! میں آپ کا رب ہوں اور آپ سے مخاطب ہوں اور آپ اس وقت مقدس وادی طویٰ میں کھڑے ہیں۔ اپنے رب کے لیے تعظیم و تواضع اور ادب کا اظہار کرتے ہوئے جوتا اتار دیجیے۔ میں نے آپ کو اس زمانے کے تمام لوگوں کے درمیان سے چن لیا ہے اور اپنی پیغامبری کے لیے منتخب کر لیا ہے، اس لیے اب آپ پر جو وحی نازل ہونے جا رہی ہے اسے غور سے سنیے اور اس کی

ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہو جایئے۔ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، اس لیے صرف میری عبادت کیجیے اور مجھے یاد کرنے کے لیے نماز قائم کیجیے۔

فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ: غالباً اسی سے یہودیوں نے یہ مسئلہ بنا لیا ہے کہ جوتا پہن کر نماز پڑھنا جائز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے فرمایا: [خَالِفُوا الْيَهُودَ فَإِنَّهُمْ لَا يُصَلُّونَ فِي نِعَالِهِمْ وَلَا خِفَافِهِمْ] ''یہودیوں کے خلاف عمل کرو، کیونکہ وہ اپنے جوتوں اور موزوں میں نماز نہیں پڑھتے۔''[1]

اگر دوسری حدیث نہ ہوتی تو اس حدیث کی رو سے جوتوں سمیت نماز پڑھنا فرض تھا۔ وہ حدیث یہ ہے، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنھما فرماتے ہیں: [رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي حَافِيًا وَمُنْتَعِلًا] ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ننگے پاؤں اور جوتا پہن کر (دونوں طرح) نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔''[2]

إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى: ابن عباس رضی اللہ عنھما نے فرمایا: ''طویٰ اس وادی کا نام ہے۔'' [طبري بسند حسن] یہ الفاظ دلیل ہیں کہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کے جوتے ناپاک تھے، اگر وہ پاک ہوتے تو اس وادی کو پاک بتا کر جوتے اتارنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو نماز پڑھا رہے تھے، دوران نماز آپ نے اپنے جوتے اتارے اور اپنی بائیں طرف رکھ دیے۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا تو انھوں نے بھی اپنے جوتے اتار دیے۔ جب آپ نے اپنی نماز پوری کی تو فرمایا: ''تمھارے جوتے اتارنے کا باعث کیا ہوا؟'' انھوں

۱۔ [أبوداؤد، الصلاة، باب الصلاة في النعل: ۶۵۲، وصححه الألباني]

۲۔ [أبوداؤد، الصلاة، باب الصلاة في النعل: ۶۵۳]

نے کہا: ''ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے جوتے اتارے تو ہم نے بھی اتار دیے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے پاس جبریل آئے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ ان میں گندگی لگی ہے۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی مسجد کو آئے تو دیکھ لے، پھر اگر اپنے جوتوں میں کوئی گندگی دیکھے تو اسے مل کر صاف کر لے اور انھیں پہن کر نماز پڑھ لے۔'' یہ حدیث دلیل ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جوتے اتارنے کے حکم کی وجہ وادی کا پاک ہونا اور جوتوں کا ناپاک ہونا تھا۔ یہ وجہ نہ تھی کہ کسی مقدس جگہ میں جوتے پہن کر جانا منع ہے، کیونکہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ مسجد پاک ترین جگہ ہے اور اسے پاک رکھنے کا حکم بھی ہے۔

عائشہ رضی اللہ عنھا سے روایت ہے: [أَمَرَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبِنَاءِ الْمَسَاجِدِ فِي الدُّوْرِ وَأَنْ تُنَظَّفَ وَتُطَيَّبَ] ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محلوں میں مسجدیں بنانے کا حکم دیا اور حکم دیا کہ انھیں صاف ستھرا رکھا جائے اور خوشبودار بنایا جائے۔''[1]

جوتے پاک ہوں تو مسجد میں جا سکتے ہیں تو کسی اور جگہ کیوں نہیں جا سکتے؟ بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے جوتے مردار گدھے کے چمڑے کے تھے، اس لیے انھیں اتارنے کا حکم ہوا، مگر یہ روایات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتیں۔ اس لیے یہ بات اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے جوتوں میں کیا چیز تھی جو وادی مقدس کے لائق نہ تھی، کیونکہ پاک جوتے جب مسجد نبوی میں پہنے جا سکتے ہیں تو تین مسجدوں سے زیادہ مقدس جگہ کون سی ہوگی۔

موسیٰ (علیہ السلام) کو منصب رسالت عطا کیے جانے اور ان پر وحی کے نزول کے واقعہ کو بیان کرنے

۱۔ [أبوداؤد، الصلاة، باب اتخاذ المساجد في الدور: ۴۵۵۔ ترمذی: ۵۹۴۔ ابن ماجہ: ۷۵۸، صحیح]

سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو وحی ورسالت سے سرفراز کئے جانے کا واقعہ انوکھا نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ اپنے منتخب بندوں کو اس منصب پر مامور فرماتا رہا ہے جس کی واضح مثال موسیٰ کا واقعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو خطاب کر کے جو پہلی تعلیم دی وہ توحید کی تھی۔ یہ وہ اساس ہے جس پر اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے اور یہ وہ نور ہے جس سے ہدایت کی تمام کرنیں پھوٹ پڑی ہیں۔

﴿اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ۝۱۵ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝۱۶﴾

یقیناً قیامت آنے والی ہے قریب ہے کہ میں اس کو مخفی رکھوں تا کہ ہر شخص کو اس کا بدلہ دیا جائے جو اس نے کمایا ہے۔ (۱۵) پس جو شخص اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے کہیں تمہیں قیامت (کے ذکر) سے روک نہ دے تو اس صورت میں تم ہلاک ہو جاؤ۔ (۱۶)

اس آیت سے حاصل ہونے والے فوائد میں سے ایک فائدہ مفسر زمخشری کے الفاظ میں یہ ہے: "جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ جم غفیر ہیں، کیونکہ کفار کے لیے قیامت کو تسلیم کرنے سے زیادہ مشکل کوئی چیز نہیں، نہ ہی وہ اس سے زیادہ کسی چیز کا انکار کرتے ہیں۔ سو ایسا ہرگز نہ ہو کہ ان کی طرف سے آنے

والے مصائب کی کثرت اوران کی بہت بڑی تعداد تمہیں خوف زدہ کردے اوران کی کثرت تمہارے قدم پھسلنے کا باعث بن جائے۔ یادرکھو کہ وہ جس قدر بھی تعداد میں زیادہ ہوں، وہ صرف اورصرف اپنی خواہش نفس کے پیچھے چل رہے ہیں، کسی دلیل وبرہان کے پیچھے نہیں اوراس میں بہت بڑی ترغیب ہے کہ دلیل کاعلم اوراس کی پیروی لازم ہےاورتقلید سے بچنا نہایت ضروری ہے، کیونکہ تقلیداوراہل تقلید کا انجام ہلاکت ہے۔" دوسرا فائدہ یہ ہے کہ دنیا پرست لوگوں، خصوصاً کفار کی مجلس اوران سے نرمی اور مداہنت اختیار کرنے سے پرہیز لازم ہے۔شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں: "نہ روک دے اس سے" یعنی قیامت کے یقین لانے سے یا نماز سے۔ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو برے کی صحبت سے منع کیا تواورکوئی کیا ہے؟" (تفسیر موضح القرآن)

﴿ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ⑰ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ⑱ ﴾

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا) اوراے موسیٰ! یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟۔(۱۷)

(موسیٰ علیہ السلام نے) کہا یہ میری لاٹھی ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اوراس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اوراس میں میرے لیے اوربھی کئی فائدے ہیں۔(۱۸)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے اللہ تعالیٰ نے صرف یہ سوال کیا تھا کہ آپ کے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں ان چیزوں کو بھی ذکر کیا جن کا سوال نہیں کیا گیا تھا اور کافی طویل جواب دیا وہ صرف یہ کہہ سکتے تھے لاٹھی، لیکن انہوں نے کہا یہ میری لاٹھی ہے، پھر اس کے فوائد بھی ذکر کئے اور کہا میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے درخت کے پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے اور بھی فوائد ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی سوال کے جواب میں ان چیزوں کا ذکر کرنا بھی درست ہے جن کے متعلق سوال نہ کیا گیا ہو، احادیث میں اس کی مثال یہ ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا، یا رسول اللہ ہم سمندر میں سفر کرتے ہیں اور ہمارے پاس بہت تھوڑا پانی ہوتا ہے اگر ہم اس پانی سے وضو کرلیں تو پیاسے رہیں گے کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کرلیا کریں: آپ نے فرمایا، سمندر کا پانی پاک کرنے والا ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔ [1]

آپ سے صرف سمندر کے پانی کے پاک کرنے کے متعلق سوال کیا گیا تھا لیکن آپ نے اس کے پاک کرنے کا بھی ذکر فرمایا اور اس کے مردار کے حلال ہونے کا بھی ذکر فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ کسی سوال کا طویل جواب دینا جائز ہے۔

عصا رکھنے کے کچھ فوائد

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جب تم کسی ایسے کنوئیں پر جاؤ جس کی رسی چھوٹی ہو تو تم اس کے ساتھ عصا جوڑ کر پانی نکال سکتے ہو اور جب تم سفر میں اور سخت دھوپ اور گرمی ہو تو تم زمین میں عصا گاڑ کر اس

ا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 69 سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 83 سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 386 سنن النسائی رقم الدیث: 59، موطا امام مالک رقم الحدیث: 513 مصنف عبدالرزاق رقم الدیث: 1485، مسند الحمیدی رقم الحدیث، 343، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص 120)

پر کپڑا پھیلا کر سایہ حاصل کر سکتے ہو، اور جب تم کو حشرات الارض سے خطرہ ہو تو عصا کے ذریعہ تم ان کو مار سکتے ہو، اور تم اس کی مدد سے بکریوں سے درندوں کو دور کر سکتے ہو۔

میمون بن مہران نے بیان کیا کہ عصا رکھنا انبیاء کی سنت ہے اور مومن کی علامت ہے اور حسن بصریؒ نے کہا کہ عصا رکھنے میں چھ فضیلتیں ہیں، یہ انبیاء کی سنت ہے، صلحاء کی زینت ہے، دشمنوں کے خلاف ہتھیار ہے، کمزوروں کا مددگار ہے، منافقین کے لیے باعث پریشانی ہے اور عبادات میں زیادتی کا باعث ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب مومن کے پاس عصا ہو تو اس سے شیطان بھاگتا ہے، منافق اور بدکار اس سے ڈرتا ہے اور جب وہ نماز پڑھے تو اس کے لیے سُترہ ہے اور جب وہ تھک جائے تو اس کے لیے قوت ہے۔ حجاج کے ایک اعرابی سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا اے اعرابی تم کہاں سے آ رہے ہو؟ اس نے کہا جنگل سے، کہا تمہارے ہاتھوں میں کیا ہے؟ اس نے کہا یہ میری لاٹھی ہے اس کو میں نماز کے وقت گاڑ لیتا ہوں اور اس کو میں اپنے دشمنوں کے لیے تیار رکھتا ہوں، اور اس سے میں اپنے جانوروں کو ہانکتا ہوں اور اس کی مدد سے میں اپنے سفر میں قوت حاصل کرتا ہوں اور چلتے وقت اس پر اعتماد کرتا ہوں تا کہ لمبے لمبے قدم رکھ سکوں، اس کے ساتھ میں نہر میں داخل ہوں اور یہ مجھے پھسلنے سے محفوظ رکھتا ہے، اس پر میں اپنی چادر ڈال دیتا ہوں تو یہ مجھے دھوپ سے بچاتا ہے، اس سے میں دروازہ کھٹکھٹاتا ہوں اور کتوں سے محفوظ رہتا ہوں اور یہ میرے لیے تلوار اور نیزے کا قائم مقام ہے، اس سے میں درختوں کے پتے جھاڑتا ہوں اور میرے لیے اس میں اور بھی فوائد ہیں۔ [1]

﴿ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ۝١٩ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝٢٠

۱۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۱ ص 107 – 108 مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۖ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ ﴿٢١﴾
وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً
أُخْرَىٰ ﴿٢٢﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى ﴿٢٣﴾ اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ
إِنَّهُ طَغَىٰ ﴿٢٤﴾

(اللہ نے) فرمایا: اے موسیٰ! اسے ڈال دو۔(۱۹) (موسیٰ نے) اس کو ڈال دیا تو اچانک وہ سانپ بن کر دوڑنے لگا۔(۲۰) (اللہ نے) فرمایا: اسے پکڑ لو اور ڈرو مت ہم ابھی اسے اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔(۲۱) اور تم اپنا (داہنا) ہاتھ اپنی (بائیں) بغل میں دے لو وہ بغیر کسی بیماری کے نہایت روشن ہو کر نکلے گا یہ دوسری نشانی ہوگی۔(۲۲) تاکہ ہم آپ کو اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔ (۲۳) (اب) تم فرعون کے پاس جاؤ، بیشک وہ سرکش ہو گیا ہے۔(۲۴)

عصائے موسیٰ کی تاریخی حیثیت

پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو نبوت سے سرفراز کیا پھر اللہ نے ان کو عصا اور ید بیضا کے دو معجزے عطا فرمائے تاکہ انہیں خود بھی اپنے نبی ہونے پر شرح صدر اور کامل بصیرت ہو اور جن کو وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اپنی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دیں وہ بھی ان دو دلیلوں سے آپ کی نبوت کو

پہچان لیں اور آپ کی تصدیق کریں۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے عصا کے سر پر دو شاخیں تھیں، اس عصا کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ یہ جنت کے درخت کا تھا، ایک قول یہ ہے کہ یہ حضرت جبرائیل نے لا کر آپ کو دیا تھا، ایک قول یہ ہے کہ جب آپ حضرت شعیب (علیہ السلام) کے پاس سے روزانہ ہونے لگے تو حضرت شعیب نے آپ کو یہ عصا دیا تھا اور درصال یہ حضرت آدم (علیہ السلام) کا عصا تھا جس کو وہ جنت سے لے کر آئے تھے۔ [1]

{ فاذا ھی حیۃ تسعیٰ : تو اچانک وہ سانپ بن گیا جو دوڑ رہا تھا۔} جب حضرت موسیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے اس وقت ان کے عصا کو سانپ بنائے جانے کی مفسرین نے مختلف حکمتیں بیان کی ہیں، ان میں سے دو حکمتیں درج ذیل ہیں۔

(1)۔۔اللہ تعالیٰ نے ان کے عصا کو اس لیے سانپ بنایا تا کہ یہ ان کا معجزہ ہو جس سے ان کی نبوت کو پہچانا جائے۔

(2)۔۔اس مقام پر عصا کو سانپ اس لیے بنایا گیا تا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اس کا پہلے سے مشاہدہ کر لیں اور جب فرعون کے سامنے یہ عصا سانپ بنے تو موسیٰ (علیہ السلام) اسے دیکھ کر خوفزدہ نہ ہوں۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو جب پوری طرح اطمینان ہوا کہ یہ وہی لاٹھی ہے جو میرے ہاتھ میں تھی جس سے میں مذکورہ بالا کام لیا کرتا ہوں تو اس کے بعد موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم ہوا کہ اپنا ہاتھ اپنی بغل میں رکھیں جب اسے بغل سے نکالیں گے تو وہ کسی تکلیف اور نقص کے بغیر تیرے سامنے چمک رہا ہوگا۔

ا۔(الجامع لاحکام القرآن جز۱۳ ص110، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

اس طرح موسیٰ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو عظیم معجزے عنایت کیے گئے جن کے بعد موسیٰ کو حکم ہوا کہ اب فرعون کی طرف جائیں کیونکہ وہ بڑا ہی باغی اور نافرمان شخص ہے۔ حقیقت میں تو حضرت موسیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرعون اور اس کے تمام ماننے والوں کی طرف بھیجا گیا تھا البتہ فرعون کو خاص طور پر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور کفر میں حد سے گزر گیا تھا۔

﴿ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِيْ ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾ ﴾

موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا کی کہ اے میرے رب! میرے لیے میرا سینہ کھول دے۔ (۲۵) اور میرے لیے میرا کام آسان کر دے۔ (۲۶) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔ (۲۷) تا کہ وہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ (۲۸) اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک کو میرا وزیر (مددگار) بنا دے۔ (۲۹) (یعنی) میرے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو۔ (۳۰) ان کے ذریعے میری کمر کو

مضبوط کردے۔(۳۱)اوراسے میرے کام میں شریک کردے۔(۳۲)تا کہ ہم (دونوں) کثرت سے تیری پاکی بیان کریں۔(۳۳)اور تجھے خوب کثرت سے یادکریں۔(۳۴)بیشک تو ہمیں خوب دیکھ رہا ہے۔(۳۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں گرہ کی وجوہ

تیسرا سوال یہ کہ میرے لیے میری زبان کی گرہ کھول دے۔ان کی زبان میں جو گرہ تھی اس کی دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ ان کی زبان میں پیدائشی گرہ تھی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ وہ اس گرہ کو زائل کردے، دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بچپن میں فرعون کی داڑھی نوچ لی تھی تو فرعون نے کہا یہ میرا دشمن بنے گا اور ان کو قتل کرنے کا ارادہ کرلیا، تب اس کی بیوی آسیہ نے کہا یہ بے عقل بچہ ہے اور ایک تھال میں یاقوت اور انگارہ رکھا اور کہا اگر اس نے یاقوت کو اٹھالیا تو اس کو ذبح کردینا اور اگر اس نے انگارہ اٹھالیا تو پھر یہ اس کے بچپن کا تقاضا ہے اس کو چھوڑ دینا، پھر حضرت جبرائیل آئے اور انہوں نے حضرت موسیٰ کا ہاتھ انگارے پر رکھ دیا حضرت موسیٰ نے اس انگارے کو اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اس وجہ سے ان کی زبان جل گئی اور ان کی زبان میں گرہ پڑ گئی اور ان کی زبان میں لکنت پیدا ہوگئی۔[1]

موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا کی، اے میرے رب! میرے خاندان والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو رسالت کی ذمہ داری اٹھانے میں میرا شریک و مددگار بنادے، تا کہ ہم تیری خوب تسبیح بیان

۱۔(جامع البیان رقم الحدیث:18173 ، یہ اسرائیلی روایت ہے اور غیر تسلی بخش ہے)

کریں اور تجھے خوب یاد کریں۔تو ہمارے حالات سے باخبر ہے اور تو جانتا ہے کہ میں نے تجھ سے جو مانگا ہے وہ ہمارے لیے مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمالی، ان کا سینہ کھول دیا، ان کی نصرت واعانت کا وعدہ فرمایا، ان کی زبان کی گرہ کھول دی اور ان کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر فرعون کے سامنے دعوت پیش کرنے کی ذمہ داری میں ان کا شریک و مددگار بنا دیا۔ ارشاد فرمایا: (قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ قَتَلۡتُ مِنۡہُمۡ نَفۡسًا فَاَخَافُ اَنۡ یَّقۡتُلُوۡنِ ﴿۳۳﴾ وَاَخِیۡ ہٰرُوۡنُ ہُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ لِسَانًا فَاَرۡسِلۡہُ مَعِیَ رِدۡاً یُّصَدِّقُنِیۡۤ ۫ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّکَذِّبُوۡنِ) [القصص: ۳۳، ۳۴] "کہا اے میرے رب! بیشک میں نے ان میں سے ایک شخص کو قتل کیا ہے، اس لیے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ اور میرا بھائی ہارون، وہ زبان میں مجھ سے زیادہ فصیح ہے، تو اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج کہ میری تصدیق کرے، بیشک میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے۔"

سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سیدنا علیؓ سے فرمایا: "کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ تم میرے لیے ایسے ہی ہو جیسے موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے ہارون (علیہ السلام) تھے؟"[1]

﴿ قَالَ قَدۡ اُوۡتِیۡتَ سُؤۡلَکَ یٰمُوۡسٰی ﴿۳۶﴾ وَلَقَدۡ مَنَنَّا عَلَیۡکَ مَرَّۃً اُخۡرٰۤی ﴿۳۷﴾ۙ اِذۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّکَ مَا یُوۡحٰۤی ﴿۳۸﴾ۙ اَنِ اقۡذِفِیۡہِ فِی التَّابُوۡتِ فَاقۡذِفِیۡہِ فِی الۡیَمِّ فَلۡیُلۡقِہِ الۡیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاۡخُذۡہُ

---

[1]۔ [بخاری، کتاب فضائل أصحاب النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، باب مناقب علی بن أبی طالب (رض): ۳۷۰۶]

عَدُوٌّ لِّیْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی
عَیْنِیْ ﴿۳۹﴾ اِذْ تَمْشِیْۤ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی مَنْ
یَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰۤی اُمِّكَ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ
وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّیْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۫ فَلَبِثْتَ
سِنِیْنَ فِیْۤ اَهْلِ مَدْیَنَ ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی ﴿۴۰﴾
وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ ﴿۴۱﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰیٰتِیْ وَلَا تَنِیَا
فِیْ ذِكْرِیْ ﴿۴۲﴾ اِذْهَبَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا
لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی ﴿۴۴﴾

(اللہ نے) فرمایا: اے موسیٰ! تمہاری دعا قبول کی گئی۔(۳۶) اور بیشک ہم نے تم پر ایک مرتبہ اور بھی احسان کیا تھا۔(۳۷) جب ہم نے تیری ماں کی طرف وحی کی جو وحی کی جارہی ہے۔(۳۸) (وہ یہ تھی) کہ موسیٰ کو صندوق میں رکھ دو اور صندوق کو دریا میں ڈال دو تو دریا اس کو کنارے پر ڈال دے گا، اور میرا اور اس کا دشمن اسے

ٹھالے گا اور موسیٰ! میں نے تم پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی اس لیے کہ تم پر مہربانی کی جائے اور اس لیے کہ تم میرے سامنے پرورش پاؤ۔(۳۹) جب تمہاری بہن (فرعون کے گھر) چلتی ہوئی آئی پھر وہ کہنے لگی کیا میں تمہیں ایسا خاندان نہ بتادوں جو اس کی پرورش کا ذمہ دار ہو جائے، پھر ہم نے تمہیں تمہاری والدہ کی طرف لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم گین نہ ہو اور اے موسیٰ! تم نے ایک جان کو قتل کر دیا تھا پھر ہم نے تمہیں غم سے نجات دی اور ہم نے تمہیں مختلف آزمائشوں میں ڈالا پھر تم اہل مدین میں کئی سال رہے پھر تم اے موسیٰ ایک خاص وقت پر چلے آئے ہو۔(۴۰) اور میں نے تمہیں خاص اپنے لیے منتخب کر لیا ہے۔(۴۱) تم اور تمہارا بھائی دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یاد میں سستی نہ کرنا۔(۴۲) تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، بیشک وہ سرکش ہو گیا ہے۔ (۴۳) پس اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ نصیحت قبول کر لے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جائے۔(۴۴)

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کے دونوں مطالبے منظور کر لیے جس کے صلہ میں ان کی زبان کی گرہ کھل گئی اور وہ پیغمبرانہ شان کے ساتھ کلام اور خطاب کرنے لگے۔اس کے ساتھ ان کے بھائی حضرت

ہارون کو نبوت کے منصب سے سرفراز کیا گیا جو ہر کام میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی پیروی اور تائید کرتے تھے۔ موسیٰ (علیہ السلام) کے دونوں سوال پورے کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے موسیٰ ہم نے یہ دوسری مرتبہ تجھ پر احسان فرمایا ہے پہلا احسان یہ تھا کہ جب تیری والدہ کو ہم نے الہام کیا کہ جب موسیٰ (علیہ السلام) کی جان کا خطرہ محسوس ہو تو اسے صندوق میں ڈال کر دریا کے حوالے کر دے تا کہ اسے میرا اور موسیٰ (علیہ السلام) کا دشمن پکڑ لے دشمن سے مراد فرعون ہے جو سرکشی اور بغاوت کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے اپنے آپ کو "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" سمجھا اور لوگوں سے کہلوایا اور اس نے محض نجومیوں کے کہنے پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی وجہ سے بنی اسرائیل کے ہزاروں بچوں کو قتل کروا دیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے ہاتھوں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی پرورش کروائی۔ موسیٰ (علیہ السلام) نا صرف فرعون کے گھر پرورش پاتے ہیں بلکہ ان کی والدہ ہی ان کی داعیہ اور مربیہ ٹھہرتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں صندوق دریا کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اے اُمِّ موسیٰ فکر نہ کرنا ہم اسے تیرے پاس لے آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم جان کر اس نے موسیٰ (علیہ السلام) کو دریا کے حوالے کر دیا۔ لیکن جب ماں کی مامتا تڑپ اٹھی تو ماں نے اپنی بیٹی یعنی موسیٰ (علیہ السلام) کی بہن کو بھیجا کہ بیٹی دریا کے کنارے کنارے جاؤ اور دیکھو تیرے بھائی کا صندوق کہاں پہنچتا ہے اور اسے کون پکڑتا ہے۔ دریا کی لہریں موسیٰ (علیہ السلام) کو لوریاں دیتے ہوئے فرعون کے محل تک پہنچا دیتی ہیں۔ دریا میں اٹکیلیاں کھاتا ہوا صندوق دیکھ کر فرعون کے خدام نے اسے پکڑ لیا۔ جب صندوق کھولا تو اس میں موسیٰ (علیہ السلام) اپنے معصوم اور پرنور چہرے کے ساتھ مسکراتے ہوئے پائے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) پر اپنی رحمت کا پرتو اس طرح

ڈال رکھا تھا کہ جو بھی انھیں دیکھتا فریفتہ ہو جاتا۔ یہی حالت فرعون اور اس کی بیوی آسیہ کی تھی۔ جونہی فرعون نے موسیٰ (علیہ السلام) کے چہرے پر نظر ڈالی تو دل ہار بیٹھا۔ اسے یہ احساس اور خیال تک نہ رہا کہ اس طرح دریا میں تیرتا ہوا۔ جو بچہ میں نے پکڑا ہے ہوسکتا ہے کہ یہ وہی بچہ ہو جس کی وجہ سے میں نے ہزاروں بچوں کو قتل کیا ہے۔ وہ ایسا کیوں نہ سوچ سکا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے موسیٰ میں نے تجھ پر اپنی محبت ڈال دی تا کہ تو میری آنکھوں کے سامنے پرورش پائے۔

حضرت موسیٰ کی والدہ کے بارے میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد:

"حضرت عبدالرحمن بن جبیر بن نفیرؒ اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری امت کے غازیوں کی مثال جو مال غنیمت لیتے ہیں اور اپنے دشمن پہ جھپٹتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرح ہے جس نے اپنے بچے کو دودھ پلایا اور اجرت حاصل کی۔"[1]

موسیٰ (علیہ السلام) پر اللہ تعالیٰ کا دوسرا احسان عظیم

بیسویں پارہ میں ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) جب بڑے ہوئے تو ایک دن دوپہر کے وقت انھوں نے دو آدمیوں کو باہم جھگڑتے ہوئے پایا جن میں ایک کا تعلق موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم سے تھا اور دوسرا موسیٰ (علیہ السلام) کے دشمن فرعون کی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھی نے اپنے دشمن کے مقابلے میں ان سے مدد چاہی موسیٰ (علیہ السلام) نے اس کے دشمن کو پیچھے دھکیلنے کے لیے دھکا دیا تو اس کے ساتھ ہی اس کی جان نکل گئی۔ اس پر موسیٰ (علیہ السلام) نے انتہائی افسوس اور غم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا یہ تو شیطان کی طرف سے ایسا ہوا ہے۔ بلاشبہ شیطان انسان کا کھلا دشمن اور گمراہ

۱۔[سنن الکبریٰ للبیہقی ،اسنادہ ضعیف]

کرنے والا ہے۔اس کے ساتھ ہی موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا کی کہ اے میرے رب میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے تو مجھے معاف کردے۔اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو معاف کردیا کیونکہ وہ بخشنے اور رحم کرنے والا ہے۔موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کی اے اللہ تو نے مجھ پر بہت کرم فرمایا ہے۔آئندہ میں کسی مجرم کی مدد نہیں کروں گا۔(القصص:۱۴تا۱۷)

اسی واقعہ کو یہاں مختصر یوں بیان فرمایا کہ اے موسیٰ (علیہ السلام) تجھ پر اللہ تعالیٰ نے اس وقت بھی احسان فرمایا جب تو نے ایک شخص کو قتل کیا تھا ہم نے تجھے اس کے ساتھ اچھی طرح آزمایا اور نجات دی پھر تو کئی سال تک مدین میں ٹھہرا رہا پھر ہم اپنے فیصلہ کے مطابق تجھے بروقت مصر لے آئے۔

اور تم دونوں میری یاد میں سستی نہ کرنا۔اس کے معنی یہ ہے کہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مجھے یاد کرتے رہنا اور یہ یاد رکھنا کہ اس دنیا کا کوئی اہم اور نیک کام میرے ذکر کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔ذکر کا دوسرا محمل یہ ہے کہ میرے پیغام کو پہنچانے میں کوئی سستی نہ کرنا کیونکہ ذکر کا اطلاق ہر قسم کی عبادت پر ہوتا ہے اور تبلیغ رسالت تو سب سے عظیم عبادت ہے تو یہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ اس پر ذکر کا اطلاق کیا جائے اور اس کا تیسرا محمل یہ ہے کہ فرعون کے سامنے تم میرا ذکر کرنے میں سستی نہ کرنا اور اس ذکر کی کیفیت یہ ہے کہ تم فرعون اور اس کی قوم سے کہنا کہ اللہ تعالیٰ ان کے کفر سے راضی نہیں ہے اور ان کے سامنے ثواب اور عذاب کا ذکر کرنا،اور اس کا چوتھا محمل یہ ہے کہ فرعون کے سامنے اللہ تعالیٰ کی ظاہری اور باطنی نعمتوں کا ذکر کرنا اور اس کے احسانات کا ذکر کرنا۔

فرعون اپنی الوہیت کا مدعی تھا اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور توحید کا منکر اور مخالف تھا۔پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ نرمی سے بات کرنے کا کیوں حکم دیا؟ اس کی دو وجہیں ہیں: (۱) حضرت موسیٰ (علیہ

السلام) کی فرعون نے پرورش کی تھی، اس حق کی رعایت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ نرمی سے بات کرنے کا حکم دیا۔ اس میں یہ تنبیہ ہے کہ ماں باپ کا حق کس قدر عظیم ہے۔ (۲) جابر اور مقتدر لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب ان کو سختی کے ساتھ نصیحت کی جائے تو وہ مزید اکڑ جاتے ہیں اور ان کے غرور اور تکبر میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کی انانیت ان کو حق قبول کرنے سے باز رکھتی ہے۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون کے ساتھ جو نرمی کے ساتھ کلام کیا تھا اس کی ایک مثال تو عنقریب طٰہٰ:47 میں آ رہی ہے اور دوسری مثال یہ آیت ہے:

ھل لک الی ان تزکی واھدیک الی ربک فتخشی (النازعات:18-19) کیا تم پاکیزہ ہونا چاہتے ہو؟ (اور یہ چاہتے ہو کہ) میں تمہارے رب کی طرف تمہاری راہنمائی کروں سو تم (اس سے ڈرو؟)

اس کی تیسری مثال کے متعلق حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کو اس کی کنیت کے ساتھ مخاطب کرنا۔ اس کی کنیت کے متعلق چار قول ہیں: (۱) ابو مرہ (۲) ابو مصعب (۳) ابو العباس (۴) ابو الولید۔

﴿ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿۴۶﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۬ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿۴۷﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۴۸﴾ ﴾

دونوں نے عرض کی کہ اے ہمارے رب! یقیناً ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا زیادہ سرکشی کرنے پر اتر آئے۔(۴۵)اللہ نے)فرمایا: مت ڈرو یقیناً میں تم دونوں کے ساتھ ہوں (سب کچھ) سنتا اور دیکھتا ہوں۔(۴۶) پس تم اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں سو تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے اور انھیں عذاب نہ دے ہم تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آئے ہیں اور جو ہدایت کی بات مانے اس پر سلامتی ہو۔(۴۷) بلاشبہ ہماری طرف وحی کی گئی ہے کہ جو جھٹلائے اور منہ پھیرے اس کے لیے عذاب (تیار) ہے۔(۴۸)

فرعون ہماری پوری بات سننے سے پہلے ہی غصے میں پھر کر تیری شان میں زیادہ گستاخی کرنے لگے یا ہم پر دست درازی کرنے لگے جس سے اصل مقصد فوت ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی تسلی کے لیے فرمایا کہ تمہیں کچھ خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ یقیناً میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میری حفاظت اور مدد ہر وقت تمہیں حاصل رہے گی۔ جو باتیں تمہارے اور ان کے درمیان ہوں گی اور جو معالات و واقعات پیش آئیں گے میں ان سب کو سنتا اور دیکھتا رہوں گا۔ کوئی بات مجھ پر مخفی نہیں۔ اس کی چوٹی میرے ہاتھ میں ہے وہ میرے قبضے سے باہر نہیں نکل سکتا، لہٰذا گھبرانے اور فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ سو اب تم دونوں جا کر اس سے کہو کہ ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ اس

کا پیغام لے کر تیرے پاس آئے ہیں۔ پس پہلے تو تو تم ہم پر ایمان لاتا کہ تو اپنے رب کے غضب سے محفوظ ہو جائے پھر اپنے ظلم سے باز آجا اور بنی اسرائیل کو اپنی قید سے رہا کر کے ہمارے ساتھ بھیج دے تا کہ ہم ان کو لے کر ارض مقدس چلے جائیں، جو ہمارے بزرگوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ ہم تیرے پاس اپنے رب کی طرف سے نبوت و رسالت لے کر آئے ہیں۔ پس جو سیدھی راہ چلے گا اس کے لیے دونوں جہان میں عذاب الٰہی سے سلامتی ہے۔ ہمارے پاس اللہ کا یہ حکم وحی کے ذریعے پہنچا ہے کہ جو شخص حق کو جھٹلائے گا اور اس سے روگردانی کرے گا اسی کو اللہ کا عذاب پہنچے گا۔ [1]

وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى: یعنی اگر تو ہدایت کی بات کو مان لے تو تیرے لیے بھی سلامتی ہوگی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہرقل کو خط لکھتے وقت بھی یہی انداز اختیار کیا، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو خط شاہ روم ہرقل کو لکھا تھا، اس میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے بعد یہ مضمون لکھا تھا: "یہ خط اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے شاہ روم ہرقل کے نام ہے۔ جو ہدایت کی پیروی کرے اس پر سلام ہو۔ اس کے بعد یہ کہ میں تجھے اسلام کی طرف بلاتا ہوں، تم اسلام قبول کر لو تو سلامت رہو گے اور اللہ تعالیٰ تجھے دوہرا اجر عنایت فرمائے گا۔" [2]

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى: یعنی اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے ہمیں یہ بتایا ہے کہ عذاب صرف اس شخص کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلائے اور اس کی

۱۔ (تفسیر ابن کثیر 154، 155/3)

۲۔ [بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی إلی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): ۷۔ مسلم، کتاب الجهاد، باب کتب النبی إلی ہرقل۔۔۔ الخ: ۱۷۷۳]

اطاعت سے روگردانی کرے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (فَاَمَّا مَنۡ طَغٰی ۙ﴿37﴾ وَاٰثَرَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ۙ﴿38﴾ فَاِنَّ الۡجَحِیۡمَ ہِیَ الۡمَاۡوٰی) [النازعات: ۳۷ تا ۳۹] "پس لیکن جو حد سے بڑھ گیا۔ اور اس نے دنیا کی زندگی کو ترجیح دی۔ تو بیشک جہنم ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔" اور فرمایا: (فَاَنۡذَرۡتُکُمۡ نَارًا تَلَظّٰی ﴿14﴾ لَا یَصۡلٰىہَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَی ﴿15﴾ الَّذِیۡ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی) [الیل: ۱۴ تا ۱۶] "پس میں نے تمہیں ایک ایسی آگ سے ڈرا دیا ہے جو شعلے مارتی ہے۔ جس میں اس بڑے بد بخت کے سوا کوئی داخل نہیں ہوگا۔ جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔" اور فرمایا: (فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ﴿31﴾ وَلٰکِنۡ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی) [القیامۃ: ۳۱، ۳۲] "سو نہ اس نے سچ مانا اور نہ نماز ادا کی۔ اور لیکن اس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔"

﴿ قَالَ فَمَنۡ رَّبُّکُمَا یٰمُوۡسٰی ﴿49﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ﴿50﴾ قَالَ فَمَا بَالُ الۡقُرُوۡنِ الۡاُوۡلٰی ﴿51﴾ قَالَ عِلۡمُہَا عِنۡدَ رَبِّیۡ فِیۡ کِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیۡ وَلَا یَنۡسَی ﴿52﴾ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ مَہۡدًا وَّسَلَکَ لَکُمۡ فِیۡہَا سُبُلًا وَّاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴿53﴾ کُلُوۡا وَارۡعَوۡا اَنۡعَامَکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی

النُّهٰى ﴿۵۴﴾

فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے؟۔(۴۹) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی پھر اس کی رہنمائی کی۔(۵۰) فرعون نے کہا: اچھا تو پہلی قوموں کا کیا حال ہوا؟ ۔(۵۱) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: کہ ان کا علم میرے رب کو ہے جو کتاب میں لکھا ہوا ہے، میرا رب نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔(۵۲) وہی جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا' اور اس میں تمہارے (چلنے کے) لیے راستے بنائے اور آسمان سے پانی نازل کیا پھر ہم نے اس (پانی) سے مختلف قسم کی نباتات پیدا کیں۔(۵۳) تم خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی چراؤ، بیشک اس میں عقل والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔(۵۴)

مصر میں حضرت یوسف (علیہ السلام) نے توحید کی تبلیغ کی تھی۔ اب بھی بنی اسرائیل وہاں لاکھوں کی تعداد میں موجود تھے۔ جو خدائے واحد پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اس طرح مصر میں اگرچہ خدائے برتر کا عقیدہ موجود تھا مگر عملاً وہاں سارا زور اور شان وشوکت فرعون کے گرد جمع تھا۔ وہ مصریوں کے عقیدہ کے مطابق ان کے سب سے بڑے دیوتا (سورج) کا زمین مظہر تھا۔ وہ مصر کا اوتار بادشاہ (God-king) اور اس کے بت اور اسٹیچو سارے مصر میں پرستش کی چیز بنے ہوئے تھے۔ اس

کے مقابلہ میں موسیٰ بنی اسرائیل کے ایک فرد تھے جو مصر میں غلاموں اور مزدوروں کی ایک قوم سمجھی جاتی تھی۔ اور اس بنا پر اس کا مذہبی عقیدہ بھی مصر میں ایک نا قابل ذکر عقیدہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

دنیا میں بیشمار چیزیں ہیں مگر ہر چیز کی ایک منفرد بناوٹ ہے اور ہر چیز کا ایک متعین طریق عمل ہے۔ نہ اس بناوٹ میں کوئی تبدیلی ممکن ہے اور نہ اس طریق عمل میں۔ اس سے خود فرعون جیسا سرکش بادشاہ بھی مستثنیٰ نہیں۔ یہ واقعہ واضح طور پر ایک بالاتر خالق کا وجود ثابت کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ ؑ نے یہ بات کہی تو فرعون نے محسوس کیا کہ اس کے پاس اس بات کا کوئی براہ راست جواب نہیں ہے۔ اب اس نے بات کو پھیر دیا۔ دلیل کے میدان میں اپنے کو کمزور پا کر اس نے چاہا کہ تعصب کے جذبات کو بھڑکا کر لوگوں کے درمیان اپنی برتری قائم رکھے۔ چنانچہ اس نے کہا کہ اگر تمہاری بات صحیح ہے تو ہمارے پچھلے بڑوں کا انجام کیا ہوا ، جو بتوں کی پوجا کرتی تھیں؟ جیسے نوح، ہود، لوط اور صالح کی قومیں، جو ایک اللہ پر ایمان نہیں لائیں اور بتوں کی پرستش کرتی ہوئی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ تو موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ ان تمام قوموں کے اعمال کا اللہ کو پورا پورا علم ہے۔ ان کا ہر قول و عمل ان کے نامہ اعمال میں محفوظ ہے اور روز قیامت انھیں ان کا بدلہ مل جائے گا۔ میرے رب کے دائرہ علم سے کوئی ادنیٰ چیز بھی خارج نہیں ہے اور نہ اس پر نسیان طاری ہوتا ہے، میرا رب ان دونوں عیوب اور دیگر تمام نقائص سے یکسر پاک ہے۔ میرا رب وہ ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش بنا دیا ہے، تا کہ تم اس پر زندگی گزار سکو اور میرا رب وہ ہے جس نے زمین پر تمہارے لیے راستے ہموار کر دیے ہیں، تا کہ تم ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکو اور میرا رب وہ ہے جو آسمان سے بارش نازل کرتا ہے جس سے نہریں بنتی ہیں اور کنویں بھرتے ہیں۔ موسیٰ (علیہ السلام) کا جواب ختم ہو جانے کے بعد

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو اپنی وحدانیت پر ایمان لانے کی نصیحت کے طور پر فرمایا کہ ہم ہی اس پانی کے ذریعے سے انواع واقسام کے پودے، پھل اور درخت وغیرہ پیدا کرتے ہیں، جو رنگ، مزہ، بو اور دیگر اوصاف وخصائص میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے عقل تقاضا کرتی ہے کہ تم ہم پر ایمان لے آؤ، ان پودوں اور پھلوں میں سے جو تمہارے کھانے کے لیے ہیں انھیں خود کھاؤ اور جو تمہارے جانوروں کے لیے ہیں وہ انھیں کھلاؤ۔ مذکورہ بالا تمام اعمال اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ رب العزت ہر بات پر قادر ہے، اس کا علم ہر شے کو محیط ہے اور اس کی رحمت تمام مخلوقات کو شامل ہے، اس لیے صرف وہی عبادت کا مستحق ہے، لیکن ان دلائل سے صرف اہل عقل ودانش ہی مستفید ہوتے ہیں۔

﴿ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿٥٥﴾ ﴾

اسی (زمین) سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے دوسری دفعہ تم کو نکالیں گے۔

یعنی تم سب کے باپ آدم (علیہ السلام) کا پتلا مٹی سے بنایا گیا اور تمام غذائیں بھی مٹی سے نکلتی ہیں، مرنے کے بعد خواہ کوئی انسان قبر میں دفن ہو یا نہ ہو، بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کے اجزا بھی مٹی ہی میں مل جائیں گے۔ قیامت کے روز انھی اجزا کو دوبارہ جمع کر کے اور ان میں روح پھونک کر زندہ کر دیا جائے گا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ) [الاعراف: ۲۵] "فرمایا تم اسی میں زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔" بعض روایات میں

دفنانے کے بعد تین مٹھیاں مٹی ڈالتے وقت اس آیت کا پڑھنا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے منقول ہے، لیکن یہ روایات سنداً ضعیف ہیں، تاہم آیت کے بغیر تین مٹھیاں مٹی ڈالنے والی روایت جو ابن ماجہ، کتاب الجنائز (۱۵۶۵) میں ہے، وہ صحیح ہے۔

﴿ وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿٥٦﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٥٧﴾ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿٥٨﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾ ﴾

اور ہم نے فرعون کو اپنی سب نشانیاں دکھائیں مگر اس نے جھٹلایا اور نہ مانا۔ (۵۶) فرعون) کہنے لگا کہ اے موسیٰ! کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ اپنے جادو کے زور سے ہمیں ہمارے ملک سے نکال دو؟۔ (۵۷) سو ہم بھی تمہارے مقابلہ میں ایسا ہی جادو لائیں گے سو تم ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کر لو نہ تو ہم اس کے خلاف کریں گے اور نہ تم (اور یہ مقابلہ) ایک کھلے میدان میں ہوگا

۔(۵۸)موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ تمہارے لیے یوم زینت کا وعدہ ہے اور یہ کہ لوگ اس دن چاشت کے وقت اکٹھے ہو جائیں۔(۵۹)

جب فرعون نے موسیٰ (علیہ السلام) سے دریافت کیا کہ آپ اپنے پروردگار کے بارے میں وضاحت کریں، وضاحت کے بعد اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون کو ایسے معجزات سے ہمکنار کیا جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر واضح نشانات تھے نیز موسیٰ (علیہ السلام) کی نبوت کی صداقت پر شاہد تھے جیسا کہ لاٹھی کا سانپ بن جانا اور ہاتھ کو ان کے سامنے کرنے پر اس کا سورج کی مانند چمکنا، لیکن فرعون نے ان معجزات کو جھٹلایا اور انکار پر اتر آیا اس سے اس کی سرکشی اور عناد کا پتہ چل رہا تھا اس نے حق وصداقت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور کہا، اے موسیٰ! کیا تو ہمارے پاس کچھ عرصہ غائب رہنے کے بعد اس لیے آن پہنچا ہے تا کہ تو ہمیں مصر کی سرزمین سے جلاوطن کر دے جبکہ تو نے جادو کے فن کا مظاہرہ کیا، معلوم ہوتا ہے تو لوگوں کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے کہ جب وہ تیرا ساتھ دیں گے تو اس کے نتیجہ میں تجھے اپنی اکثریت پر ناز ہوگا اور تیری بادشاہت کا ڈن کہ بجنے لگے گا۔

دراصل اس طرح وہ اپنی قوم کو موسیٰ (علیہ السلام) کے خلاف ابھارنا چاہتا تھا مزید برآں اس نے کہا موسیٰ کا مقصود صرف اتنا ہی نہیں کہ بنی اسرائیل کو قبطیوں کی غلامی سے نجات دلائے بلکہ قبطیوں کو بھی ان کے وطن سے نکالنا چاہتا ہے اور ان کی رہائش گاہوں اور مال و دولت کو اپنے قبضہ میں کرنا چاہتا ہے ہمارے لیے از بس ضروری ہے کہ ہم اپنے دروازوں کو مکمل طور پر اس پر بند کر دیں تا کہ کوئی شخص اس کی دعوت کو قبول نہ کرنے پائے ہم ہرگز اس کے مناظروں کو کچھ اہمیت نہ دیں اور نہ اس کی دعوت کی جانب توجہ کریں چنانچہ فرعون نے کھلے بندوں دعویٰ کیا، اب ہمارے لیے از بس ضروری ہے کہ ہم تیرا مقابلہ

کریں (اللہ) کی قسم ہم تیرے مقابلہ میں تیرے جیسا جادو پیش کریں گے جو کچھ تیرے پاس ہے وہ سب کچھ ہمارے پاس بھی ہے تجھے کسی دھوکے میں نہیں آنا چاہیے، پس تو ہمارے اور اپنے درمیان وقت مقرر کرلے جس میں تم بھی موجود ہو دیگر لوگ بھی موجود ہوں اور تم ہمارے جادو کا مقابلہ کر کے دکھاؤ، فرعون کا اس انداز سے گفتگو کرنے سے مقصود انھیں آگاہ کرنا تھا کہ میرا دل مضبوط ہے مقابلہ کرنے کے وسائل موجود ہیں لیکن مقابلہ کی جگہ ایک میدان ہو اس میں گڑھے نہ ہوں نہ پہاڑی سلسلہ ہوتا کہ کوئی فرد چھپ نہ سکے، موسیٰ (علیہ السلام) نے برملا کہا کہ تمہارے لیے یوم زینت کا دن مقرر کیا جاتا ہے جو ایک سال کے بعد آتا ہے اس دن لوگ اپنے کام کاج چھوڑ کر اس میں شریک ہوتے ہیں، مقصود یہ ہے کہ اس اجتماع میں حاضری عام ہوگی اور جانبین سے طاقت کا مظاہرہ ہوگا اس طرح سے اللہ کا کلمہ بلند ہوگا دین اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا اور کفر دم دبا کر بھاگ جائے گا۔

یوم زینت کا مصداق

اس آیت میں یوم الزینت کا لفظ ہے اور اس کی تفسیر میں چار اقوال ہیں:

(۱) ابوصالح نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے اس سے مراد ان کی عید کا دن ہے۔

(۲) سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے اس سے مراد عاشورا (دس محرم) کا دن ہے۔

(۳) ضحاکؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے اس سے مراد یوم النیروز ہے اور وہ اس سال کے پہلے دن ہفتہ کے روز تھا۔

(٤) سعید بن جبیرؒ کا قول ہے وہ ان کے بازار جانے کا دن تھا۔

ضحیٰ سے مراد ہے جب دن چڑھ جائے اور سورج کی روشنی خوب پھیل جائے، اور دن چڑھنے پر اس مقابلہ کو اس لیے معلق کیا تا کہ سورج کی روشنی کامل ہو اور لوگ آسانی سے جمع ہو جائیں اور حجت خوب واضح ہو جائے اور شک وشبہ سے بالات رہ۔ [1]

﴿ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾ ﴾

پھر فرعون لوٹ گیا، اپنے مکر وفریب کو جمع کیا اور پھر (مقابلے کے لیے) آ گیا۔ (۶۰) موسیٰ (علیہ السلام) نے (جادوگروں کو مخاطب کرتے ہوئے) کہا، تم پر

---

[1] (زاد المسیر ج ۵ ص 295، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، 1407ھ)

افسوس ہے، اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان نہ باندھو ورنہ وہ تمہیں عذاب کے ذریعے تمہارا نام ونشان مٹادے گا اور جس نے بھی (اللہ تعالیٰ پر) بہتان باندھا وہ نامراد ہی رہا۔ (٦١) تو وہ (جادوگر) باہم اپنے معاملہ میں جھگڑنے لگے اور وہ چپکے چپکے باہم مشورہ کرنے لگے۔ (٦٢) آخرکار) وہ کہنے لگے کہ بلاشبہ یہ دونوں جادوگر ہیں۔ دونوں چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے ذریعہ تم لوگوں کو تمہاری سرزمین سے نکال دیں اور تمہارے عمدہ مذہب کو ختم کردیں۔ (٦٣) پس اپنی ساری تدبیریں جمع کرلو، پھر ان کے مقابلے میں متحد ہوکر آؤ، بیشک آج وہی کامیاب ہوگا جو غالب رہے گا۔ (٦٤)۔

جادوگروں کی تعداد

فرعون نے اپنے ہتھکنڈے جمع کر لئے، اس سے مراد ہے فرعون نے اپنے جادوگر جمع کر لئے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ بہتر (٧٢) جادوگر تھے اور ان میں سے ہر جادوگر کے پاس رسیاں اور لاٹھیاں تھیں، جادوگروں کی تعداد کے متعلق مختلف اقوال ہیں، ایک قول یہ ہے کہ وہ چار سو تھے۔ ایک قول یہ یہ کہ وہ بارہ ہزار تھے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ چودہ ہزار تھے۔ ان جادوگروں کے رئیس کا نام شمعون تھا۔ نیز فرمایا تم پر افسوس ہے تم جھوٹ بول کر اللہ پر بہتان نہ باندھو، اس کا معنی ہے تم اللہ کے متعلق جھوٹی باتیں نہ کہو، اور اس کے ساتھ شرک نہ کرو اور معجزات کے منتقل ہے نہ کہو کہ یہ جادو ہے، ورنہ وہ تم کو ملیا

میٹ کردے گا۔ (قرآن مجید میں فیسحتکم کا لفظ ہے اس کا معنی ہے کسی کو ہلاک کر کے جڑ سے اکھاڑ دینا اور فرمایا جس نے اللہ پر افتراء باندھا یعنی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اس کے متعلق کوئی بات کہی وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے ثواب کے حصول میں ناکام ہو گیا۔

پھر وہ لوگ مختلف ہو گئے یعنی انہوں نے ایک دوسرے سے مشورہ کیا تا کہ ایک رائے پر متفق ہو جائیں اور یہ مشورہ کرنے والے جادوگر تھے۔ انہوں نے جو سرگوشیاں کی تھیں اس کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ وہ اپنی باتوں کو فرعون سے مخفی رکھنا چاہتے تھے اور ان کی باتوں کے متعلق درج ذیل اقوال ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا انہوں نے یہ سرگوشی کی تھی کہ اگر موسیٰ ان پر غالب آ گئے تو وہ ان کی پیروی کریں گے۔

(۲) قتادہ نے کہا ان کی سرگوشی یہ تھی کہ اگر موسیٰ جادوگر ہیں تو ہم ان پر غالب آ جائیں گے اور اگر ان کا تعلق آسمانوں سے ہے تو پھر وہی کامیاب ہونگے۔

(۳) وہب بن منبہ ؒ نے کہا جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا تھا تم پر افسوس ہے تم جھوٹ بول کر اللہ پر بہتان نہ باندھو وہ تم کو عذاب سے ملیا میٹ کر دے گا، یہ سن کر جادوگروں نے کہا یہ کسی جادوگر کا کلام نہیں ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ جادوگروں نے اپنی باتوں کو حضرت موسیٰ اور فرعون سے مخفی رکھا اور فرعون کی قوم سے بھی مخفی رکھا اور ان کی سرگوشی یہ تھی، سدی نے کہا یہ دونوں جادوگر ہیں جو اپنے جادو سے تمہیں تمہارے ملک سے نکالنا چاہتے ہیں اور تمہارے بہترین مذہب کو مٹانا چاہتے ہیں اور ضحاک نے کہا وہ یہ سرگوشی کر رہے تھے رسیوں اور لاٹھیوں کے ساتھ کس طرح کی تدبیر اختیار کی جائے کہ ہم کو غلبہ حاصل ہو اور ہماری

شعبدہ بازی کا کسی کو پتا نہ چلے۔ [1]

﴿ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ۝٦٥
قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ
سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۝٦٦ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝٦٧
قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝٦٨ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ
مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ
حَيْثُ اَتٰى ۝٦٩ ﴾

جادوگروں نے کہا: اے موسیٰ! یا تو تم اپنی چیز پہلے ڈالو یا ہم اپنی چیزیں پہلے ڈالنے والے بنتے ہیں۔ (٦٥) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا (نہیں) بلکہ تم ہی پہلے ڈالو، (جب انہوں نے چیزیں ڈالیں) تو اچانک ان کی رسیاں اور لاٹھیاں موسیٰ کے خیال میں ایسی نظر آنے لگیں کہ وہ میدان میں ادھر ادھر دوڑ رہی ہیں۔ (٦٦) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔ (٦٧) ہم نے

---

[1] احکام القرآن، تفسیر قرطبی، تفسیر ابن جریر طبری)

فرمایا کہ تم ڈرومت یقیناً تم ہی غالب رہو گے۔(۶۸)اور جو(لاٹھی) تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے اسے ڈال دو کہ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے اس کو نگل جائے گی۔ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے یہ تو جادوگر کا فریب ہے اور جادوگر جہاں جائے فلاح نہیں پائے گا۔(۶۹)

علامہ قرطبی مالکیؒ متوفی ۶۶۸ھ نے لکھا ہے کہ بعض اہل حقائق نے یہ کہا ہے کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جادوگروں سے یہ کہا تھا: تم پر افسوس ہے تم جھوٹ بول کر اللہ تعالیٰ پر افتراء نہ باندھو، پس وہ تم کو عذاب سے ملیا میٹ کر دے گا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے مڑ کر دیکھا تو ان کی دائیں جانب حضرت جبرائیل کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اے موسیٰ آپ اللہ کے دوستوں کے ساتھ نرمی کریں، حضرت موسیٰ علیہ اسلام نے کہا، اے جبرائیل یہ لوگ تو معجزہ کو باطل کرنے کے لیے بہت بڑے جادو کا سامان لے کر آئے ہیں یہ فرعون کے دین کی مدد کر رہے ہیں اور اللہ کے دین کو رد کر رہے ہیں اور آپ ان کے متعلق کہہ رہے ہیں: اللہ کے دوستوں کے ساتھ نرمی کریں! جبرائیل نے کہا اس وقت سے لے کر عصر کے وقت تک یہ آپ کے ساتھ ہیں اور عصر کے بعد یہ جنت میں ہوں گ۔ جب حضرت جبرائیل نے یہ بتایا تو حضرت موسیٰ اپنے دل میں ڈرے اور ان کے دل میں خیال آیا کہ مجھے کون بتائے گا کہ میرے متعلق اللہ تعالیٰ کا کیا علم ہے، ہوسکتا ہے کہ اس ساعت میں، میں جس حال میں ہوں اگلی ساعت میں میرا حال اللہ کے علم میں اس کے برعکس ہو۔ جس طرح یہ جادوگر اس حال میں کفر پر ہیں اور اس کے بعد ایمان سے مشرف ہو کر جنت میں ہونگے، جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ حالت

دیکھی تو ان کو وحی فرمائی تم ڈرو مت دنیا میں بھی تم ہی غالب رہو گے اور جنت میں بھی تم ہی بلند درجات میں ہو گے کیونکہ میں نے تم کو نبی بنایا ہے اور تم کو فضیلت دے کر چن لیا ہے۔ [1]

﴿ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۝٧٠ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ۝٧١ ﴾

فرعون بولا تم اس پر ایمان لے آئے، اس سے پہلے کہ میں تمہیں اس کی اجازت دوں، بیشک وہی تمہارا بڑا گرو ہے جس نے تمہیں جادوگری سکھائی ہے، اب میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹوں گا اور تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا، پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیر پا ہے۔ (۷۰) پس سب جادوگر سجدے میں گر پڑے اور پکار اٹھے کہ ہم ہارون اور موسیٰ (علیہما السلام) کے رب پر ایمان لے آئے۔ (۷۱)

۱۔ (الجامع لاحکام القرآن جزء ۱۲ ص 139)

فرعونی کے جادوگروں کا ایمان لانا

السحرۃ (جادوگر) ساحر کی جمع ہے جو سحر سے اسم فاعل ہے۔ اللہ عزوجل کا حکم پاتے ہی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے دل سے سارے اندیشے جاتے رہے اور انھوں نے اپنا عصا زمین پر ڈال دیا اور وہ اژدھا بن کر ان سب لاٹھیوں اور رسیوں کو جو جادوگروں نے زمین پر ڈالی تھیں نگل گیا۔ جادوگروں نے تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی تقریر سن کر پہلے ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ شخص جادوگر نہیں ہو سکتا۔ اس کے خیالات بالکل نرالے ہیں۔ اب جو اتنا زبردست کرشمہ دیکھا تو سب کے سب سجدہ میں گر پڑے۔ اور دل سے آواز نکلی کہ ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے۔

فرعون نے دیکھا یہ تو کام ہی بگڑ گیا جھلا کر کہا میری اجازت سے پہلے ایمان لانے کے کیا معنی؟ ضرور تم موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ سازش میں شریک ہو اور یہ تمہارا گروگھنٹاں معلوم ہوتا ہے اور تم نے جادو اسی سے سیکھا ہے اب تم اس سے مل کر میرے خلاف بغاوت کرنا چاہتے ہو دوسرے لوگوں پر اثر ڈال کر انھیں بھی ورغلانا چاہتے ہو۔ اچھا ٹھہرو تو سہی میں بھی تمہیں وہ سزا دوں کہ دیکھنے والوں کے ہوش اڑ جائیں۔

امام ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ پھر فرعون نے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے اور ان کو قتل کر دیا اور اس وقت انہوں نے یہ دعا کی تھی۔

ربنا افرغ علینا صبراً وتوفنا مسلمین (الاعراف:126) اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے اور حالت اسلام میں ہماری روح قبض فرما۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ دن کے اول وقت میں کافر جادوگر تھے اور دن کے آخر وقت میں

مسلمان شہداء تھے۔ [1]

﴿ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ﴿۷۲﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۷۳﴾ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۷۴﴾ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾ ﴾

جادوگروں نے کہا ہم تجھے ہرگز ترجیح نہ دیں گے ان واضح دلائل پر جو ہمارے پاس آئے ہیں اور اس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، سو تو فیصلہ کر جو تو فیصلہ کرنے والا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ تو اس دنیا کی زندگی کا فیصلہ کرے گا۔

---

[1] ۔ (جامع البیان رقم الحدیث 18265، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

(۷۲) بیشک ہم تو اپنے رب پر ایمان لا چکے ہیں تا کہ وہ ہماری خطائیں بخش دے اور اس جادو کو بھی جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا اور اللہ ہی سب سے بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ (۷۳) بیشک جو شخص اپنے پروردگار کے پاس مجرم ہو کر آئے گا تو یقیناً اس کے لیے جہنم ہے نہ اس میں مرے گا اور نہ جیئے گا۔ (۷۴) اور جو شخص اس کے پاس مومن ہو کر آئے گا جس نے نیک عمل کئے ہوں گے سو ایسے ہی لوگوں کے لیے بلند درجات ہیں۔ (۷۵) ہمیشگی کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ اس شخص کے لیے جزا ہے جو پاک ہوا۔ (۷۶)

جب فرعون کے جادوگر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے معجزات کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے تو فرعون نے ان کو ڈرایا اور دھمکیاں اور ان کو دوبارہ فرعون پر ایمان لانے کے لیے کہا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اے فرعون ہم جو دلائل اور معجزات دیکھ چکے ہیں ہم ان پر تجھے کبھی ترجیح نہیں دیں گے اور نہ تجھ کو اس ذات پر ترجیح دیں گے جس نے ہم کو پیدا کیا ہے اور نہ تیری اطاعت کو اس کی عبادت پر ترجیح دیں گے۔ اب تجھے جو کرنا ہو وہ کر لے تو جو کچھ کر سکتا ہے وہ اسی دنیا میں کر سکتا ہے۔ یعنی تو صرف اسی دنیا میں ہم کو عذاب دینے پر قادر ہے، اس کے بعد تیری کوئی سلطنت اور تیرا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے کہا: ہم اپنے رب پر ایمان لا چکے ہیں ات کہ وہ ہمارے سارے گناہوں کو بخش

دے اور ہارے جادو کرنے کے اس گناہ کو بھی جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا۔

حضرت ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا جب وہ بچے تھے تو فرعون نے انہیں جادوگروں کے حوالے کیا اور کہا کہ ان کو جادو سکھاؤ۔ [1]

امام عبدالرحمٰن بن علی بن محمد جوزی متوفی 597ھ نے اس اعتراض کے حسب ذیل جوابات دیئے ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا کہ فرعون لوگوں کو جادو سیکھنے پر مجبور کرتا تھا، ابن الانباری نے کہا کہ فرعون اپن سلطنت کے لوگوں کو بلاتا اور ان کو یہ حکم دیتا کہ وہ اپنی اولاد کو جادو سکھائیں اور وہ اس کو ناپسند کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا شغف جادو کے ساتھ تھا اور اس کے دل میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا خوف جاگزین ہو یا، پس جادو پر مجبور کرنے سے ان کی مراد فرعون کا ان کو ابتداء میں جادو پر مجبور کرنا تھا۔

(۲) ان جادوگروں نے پہلے فرعون سے یہ کہا تھا کہ اگر ہم غالب ہو گئے تو کیا ہم کو اجر ملے گا، لیکن اس کے بعد جب انہوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو دیکھا اور یہ دیکھا کہ وہ اللہ کا ذکر کرنے والے ہیں اور اللہ سے ڈرنے والے ہیں تو وہ حضرت موسیٰ کے ساتھ کے ساتھ جادو کا مقابلہ کرنے سے ڈرے اور ان کو یہ خوف ہوا کہ موسیٰ (علیہ السلام) ان پر غالب آجائیں گے اور ان کی جادو کرنے کی صنعت ماند پڑ جائے گی اور ان کا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔ لیکن فرعون اس کے سوا نہیں مانا کہ وہ حضرت موسیٰ سے مقابلہ کریں اور فرعون کے مجبور کرنے سے ان کی یہی مراد تھی۔

(۳) ان کو یہ خوف تھا کہ اس عظیم مجمع میں مغلوب ہو جائیں گے اور اس سے ان کے کاروبار پر اثر پڑے

۱۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 18267-18268 مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

گالیکن فرعون نے ان کو جادو کرنے پر مجبور کیا۔

(۴) فرعون نے ان جادوگروں کو ان کے وطنوں سے آنے پر مجبور کیا تھا اور یہی ان کے جادو کرنے کا سبب تھا۔ یہ چاروں اقوال ابن الانباری نے نقل کیے ہیں۔ [۱]

فرعون کی بیوی کا ایمان لانا

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی 668ھ لکھتے ہیں:

فرعون کی بیوی لوگوں سے پوچھ رہی تھی اس معرکہ میں کون غالب رہا۔ اس کو بتایا ای کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون غالب رہے تو اس نے کہا میں موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لے آئی۔ فرعون نے کسی شخص کو اس کے پاس بھیجا کہ اگر وہ اپنے ایمان سے رجوع نہ کرے تو اس کے اوپر پتھر کی ایک بھاری چٹان گرادو، جب وہ لوگ اس کے پاس گئے تو اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کو جنت میں اپنا مکان نظر آیا، وہ اپنے ایمان پر قائم رہی اور اسی حال میں اس کی روح قبض کر لی گئی اور اس وقت اس کے جسم پر وہ بھاری چٹان گرائی گئی تو اس کے جسم میں روح نہیں تھی۔ [۲]

ان آیات میں کافر و مومن کا انجام بیان کیا گیا ہے کہ جس کی موت کفر پر ہوگی اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا، جہاں نہ اسے موت آئے گی کہ عذاب سے چھٹکارا پالے اور نہ ایسی زندگی ہوگی جس میں اسے سکون میسر ہو۔ وہاں وہ زندہ ہوتے ہوئے عذاب نار سے ایسی شدید تکلیف اٹھائے گا کہ ہر دم اس پر موت کی کیفیت طاری رہے گی اور جو اس دنیا میں ایمان و عمل صالح والی زندگی گزارے گا، تو قیامت کے دن

۱۔ (زادالمسیر ج ۵ ص 318 مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت-1407ھ)

۲۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۱ ص 141، بیروت 1415ھ)

اس کے درجات بلند ہونگے، اس کا ٹھکانا وہ جنت عدن ہوگی جس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہاں وہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے اور یہ بدلہ اس کو ملے گا جس نے دنیا میں اپنے آپ کو کفر و معاصی کی آلائشوں سے پاک رکھا ہوگا۔ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى: جیسا کہ ارشاد فرمایا: (لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ) [فاطر:٣٦] "نہ ان کا کام تمام کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ ان سے اس کا کچھ عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا۔ ہم ایسے ہی ہر ناشکرے کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔" اور فرمایا: (وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ١١ ○ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ١٢ ○ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى) [الاعلی:١١ تا ١٣] "اور اس سے علیحدہ رہے گا جو سب سے بڑا بدنصیب ہے۔ وہ جو سب سے بڑی آگ میں داخل ہوگا۔ پھر وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔"

سیدنا ابوسعید خدری ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اصلی جہنمی تو جہنم ہی میں پڑے رہیں گے، انھیں وہاں نہ موت آئے گی اور (نہ آرام کی) زندگی ملے گی، ہاں ایسے لوگ بھی ہوں گے جنھیں ان کے گناہوں کی پاداش میں دوزخ میں ڈال دیا جائے گا، جہاں اللہ انھیں موت دے دے گا اور وہ جل کر کوئلہ ہو جائیں گے۔ پھر شفاعت کی اجازت کے بعد گروہ گروہ کر کے نکالے جائیں گے اور جنت کی نہروں کے کناروں پر انھیں پھیلا دیا جائے گا اور جنتیوں سے فرمایا جائے گا کہ ان پر پانی ڈالو، تو وہ اس طرح اگیں گے جیسے دانہ اس مٹی میں اگتا ہے جسے پانی بہا کر لاتا ہے۔" یہ سن کر ایک شخص کہنے لگا، گویا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کچھ زمانہ جنگل میں گزار چکے ہیں۔ [1]

---

[1]۔ [مسلم، کتاب الإیمان، باب إثبات الشفاعة وإخراج الموحدین من النار: ١٨٥۔ مسند أحمد: ٣/٢٠، ح: ١١١٥٧]

وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى : یعنی ان کے لیے جنت ہوگی جس میں بلند و بالا درجات، پر امن بالا خانے اور پاکیزہ و نفیس مکانات ہونگے۔ سیدنا عبادہ بن صامتؓ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جنت میں سو درجے ہیں اور ہر دو درجوں میں اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین و آسمان میں ہے اور ان میں سے سب سے اعلیٰ درجہ فردوس ہے، اسی سے جنت کی چاروں نہریں جاری ہوتی ہیں۔ اس کے اوپر رحمن کا عرش ہے، تو تم اللہ سے جب جنت مانگو تو جنت الفردوس کی دعا کیا کرو۔"[1]

سیدنا ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جنت والے اپنے سے اوپر بالا خانے والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے تم اس چمکتے ستارے کو دیکھتے ہو جو صبح کے وقت آسمان کے مشرقی یا مغربی کنارے میں رہ گیا ہو، ان میں سے ایک دوسرے سے افضل ہوگا۔" صحابہ نے عرض کی، یا رسول اللہ! یہ درجات تو انبیاء کے ساتھ خاص ہونگے، جنھیں ان کے سوا کوئی نہ پا سکے گا؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "نہیں! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ ان لوگوں کے لیے ہوں گے جو اللہ پر ایمان لائے اور نبیوں کو سچا جانا۔"[2]

﴿ وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴾

---

[1] [ترمذی، کتاب صفۃ الجنۃ، باب ماجاء فی صفۃ درجات الجنۃ: ۲۵۳۱۔ مسند أحمد: ۳۱۶/۵، ح: ۲۲۷۶۱۔ مستدرک حاکم: ۸۰/۱، ح: ۲۶۹]

[2] [بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ماجاء فی صفۃ الجنۃ وأنہا مخلوقۃ: ۳۲۵۶۔ مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا، باب ترائی أہل الجنۃ أہل الغرف۔۔۔ الخ: ۲۸۳۱]

فَاَتۡبَعَهُمۡ فِرۡعَوۡنُ بِجُنُوۡدِهٖ فَغَشِيَهُمۡ مِّنَ الۡيَمِّ مَا غَشِيَهُمۡ ﴿۷۸﴾ وَاَضَلَّ فِرۡعَوۡنُ قَوۡمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾

سوفرعون نے اپنے لشکروں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا تو سمندر نے انہیں یوں ڈھانپ لیا جیسے ڈھانپنے کا حق تھا۔(۷۷)اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہی میں ڈال دیا اور سیدھے راستے پر نہ ڈالا۔(۷۸)اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی اور تم سے (کوہ) طور کی داہنی طرف کا وعدہ کیا۔اور ہم نے تم پر من وسلویٰ اتارا۔(۷۹)

امام رازیؒ نے یہ لکھا ہے کہ فرعون بہت عقلمند شخص تھا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ سمندر میں جو خشک راستے حضرت موسیٰ کے معجزے کی وجہ سے بن گئے تھے وہ ان پر چل پڑا ہو، اور یہ جو مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت جبرائیلؑ نے اس کے آگے گھوڑی دوڑائی اس کے پیچھے اس کا گھوڑا دوڑ پڑا یہ بھی نا قابل فہم ہے۔حضرت جبرائیلؑ کو اس حیلہ کی کیا ضرورت تھی وہ ویسے ہی فرعون کو پورے لشکر سمیت اٹھا کر ان راستوں پر ڈال دیتے یا سمندر میں پھینک دیتے۔پھر امام رازی لکھتے ہیں دراصل یوں ہوا ہوگا کہ فرعون لشکر کے درمیان ہوگا کیونکہ بادشاہ خطرات سے بچنے کے لیے لشکر کے درمیان میں چلتے ہیں تاکہ اچانک جو مصیبت پیش آئے وہ آگے چلنے والوں کو پیش آئے۔پھر جب حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل ان رستوں سے سلامتی کے ساتھ پار گزر گئے تو اس نے آزمائش کے لیے فوج کے چند دستوں کو روانہ کیا

جب اس نے دیکھا کہ وہ سلامتی کے ساتھ ان راستوں سے گزر رہے ہیں تو پھر لشکر کے ساتھ وہ بھی اس راستہ سے گزرنے لگا اور جب پورا لشکر ان راستوں میں پہنچ گیا تو پھر وہ راستے پھٹ گئے اور سمندر آپس میں مل گیا اور فرعون اپنے لشکر سمیت غرق ہو گیا۔

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کیا تو اس نے کہا میں اس پر ایمان لایا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں (یونس ۹۰) تو جبرائیل نے کہا اے محمد! کاش آپ اس وقت مجھے دیکھتے جب میں سمندر کی کیچڑ اس کے منہ میں ڈال رہا تھا اس خوف سے کہ اس کے اوپر رحمت ہو جائے۔ [۱]

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ذکر فرمایا کہ جبرائیل فرعون کے منہ میں اس خوف سے کیچڑ ڈال رہے تھے کہ وہ کہے گا لا الہ الا اللہ تو اللہ اس پر رحم فرمائے گا۔ [۲]

جب فرعون نے دیکھا کہ اب موت سامنے ہے اور اس سے نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس نے کہا" میں اس بات پر ایمان لے آیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اللہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں میں بھی اس اللہ پر ایمان لاتا ہوں۔ (سورہ یونس) اللہ تعالیٰ نے فرعون کے اس ایمان لان کو قبول نہیں کیا بلکہ فرمایا" اب تو ایمان لایا ہے حالانکہ اس سے پہلے تو نافرمانی کرتا رہتا تھا اور تو فسادی آدمی ہے۔ پس آج کے دن ہم تیرے بدن کو نجات دیں گے تا کہ اپنے بعد آنے والوں کے لیے تو اللہ کی طرف سے عبرت کا نشان بن جائے۔ (سورہ یونس آیت ۹۰ تا ۹۲) اس طرح فرعون، اس کا لشکر اور غرور و تکبر کا ہر

۱۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 3107، مسند احمد ج ۱ ص 245، المعجم الکبیر رقم الحدیث: 12932)

۲۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 3108 مسند احمد ج ۱ ص 240 صحیح ابن حبان رقم الحدیث: 6215، المستدرک ج ۲ ص 240، شعب الایمان رقم الحدیث: 9391)

انداز سمندر کے پانی میں غرق کر دیا گیا۔

امام حافظ احمد بن علی تمیمی متوفی 317ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوموسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک اعرابی آیا، آپ نے اس کی عزت افزائی کی اور فرمایا: ہمارے پاس آؤ، وہ آیا آپ نے اس سے فرمایا: تم اپنی حاجت بیان کرو۔ اس نے کہا: مجھے سواری کے لیے ایک اونٹنی چاہیے اور بکریاں چاہئیں جن کا ہم دودھ دوہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیا تم بنواسرائیل کی بڑھیا کی طرح ہونے سے بھی عاجز ہو؟ آپ نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ بنواسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے تو وہ راستہ بھول گئے۔ حضرت موسیٰ نے پوچھا: اس کی کیا وجہ ہے؟ ان کے علماء نے کہا کہ جب حضرت یوسف (علیہ السلام) کی وفات قریب ہوئی تو انہوں نے ہم سے (یعنی ہمارے آباء واجداد سے) یہ پختہ وعدہ لیا تھا اور اس پر قسم لی تھی کہ ہم مصر سے اس وقت تک روانہ نہیں ہوں گے جب تک ان کی نعش کو ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ حضرت موسیٰ نے پوچھا: ان کی قبر کی جگہ کس کو معلوم ہے؟ انہوں نے کہا: بنواسرائیل کی ایک بڑھیا ہے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اس کو بلوایا پس وہ آئی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: مجھے حضرت یوسف کی قبر بتاؤ۔ اس نے کہا اس وقت تک اس کا پتا نہیں بتاؤں گی حتیٰ کہ آپ میری ایک درخواست منظور نہ کریں۔ آپ نے پوچھا: تمہاری کیا درخواست ہے؟ اس نے کہا: میں جنت میں آپ کے ساتھ رہوں! حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ماننا ناگوار ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی کہ آپ اس کی درخواست منظور کرلیں! تو وہ آپ کو دریائے نیل کی اس جگہ پر لے گئی جہاں کا پانی متغیر ہو چکا تھا، اس نے کہا: یہاں سے پانی نکالو، انہوں نے وہاں سے پانی نکالا۔ اس نے کہا: یہاں کھدائی

کرو، کھدائی کے بعد وہاں سے حضرت یوسف (علیہ السلام) کی نعش برآمد کی، جب انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی نعش اوپر اٹھائی تو ان کو گمشدہ راستہ روز روشن کی طرح مل گیا۔ [1]

﴿ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿٨٠﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿٨١﴾ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿٨٢﴾ ﴾

اے بنی اسرائیل بیشک ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی اور تمہیں طور کی داہنی طرف کا وعدہ دیا (یعنی تورات دینے کے لیے) اور ہم نے تم پر من اور سلویٰ نازل کیا۔ (۸۰) ہم نے جو پاکیزہ چیزیں تم کو دی ہیں اس میں سے کھاؤ اور اسے کھا کر سرکشی نہ کرو، ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا اور جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ ہلاک ہوگیا۔ (۸۱) البتہ جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے پھر سیدھا چلتا رہے میں اسے معاف کرنے والا ہوں۔ (۸۲)

۱۔ (مسند ابو یعلی ج ۱۳، ص 236–237 رقم الحدیث: 7254 مطبوعہ دار الثقافت العربیہ، 1413ھ، اسنادہ صحیح، حکم صحیح)

تعالیٰ نے آل فرعون کو غرق کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو ارشاد فرمایا کہ ہم نے تمہارے دشمن سے تمہیں نجات دی اور پر اپنی طرف سے من اور سلویٰ نازل کرنے کے بعد تمہیں حکم دیا کہ جو کچھ ہم نے تمہیں حلال طیب عطا فرمایا ہے۔ اسے کھاؤ اور حد سے گزرنے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تم حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو گے تو میرا غضب تم پر نازل ہوگا۔ جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ ہلاک ہو گیا۔ پہلی آیت میں نہایت اختصار کے ساتھ تین واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ا۔ بنی اسرائیل کو ان کے دشمن فرعون اور اس کے ساتھیوں سے نجات دلانا۔ دیگر مقامات پر اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ اے بنی اسرائیل! اپنے رب کے اس احسان کو یاد کرو جب اس نے تمہیں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے مظالم سے نجات دی۔ فرعون تمہیں بدترین سزائیں دینے کے ساتھ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتا اور تمہاری بیٹیوں کو باقی رہنے دیتا تھا۔ یہ تمہارے لیے بہت بڑی آزمائش تھی۔ ہم نے تمہارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا تاکہ تم سلامتی کے ساتھ اس سے گزر جاؤ اور تمہارے سامنے فرعون اور اس کے لاؤ لشکر کو غرق کر دیا۔ (البقرۃ:۴۹۔۵۰)

۲۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ بیت المقدس میں داخل ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی فتح تمہارے مقدر میں لکھ دی ہے۔ لیکن تم نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ ہم بیت المقدس میں داخل نہیں ہوں گے کیونکہ وہاں بڑے طاقتور لوگ رہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے تمہیں بار بار سمجھایا لیکن تم نے ان کا حکم ماننے کی بجائے اس حد تک گستاخی کی کہ اے موسیٰ تو اور تیرا خدا جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔

لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے تم پر من وسلویٰ نازل کیا اور حکم فرمایا اللہ کے دیے ہوئے حلال وطیب

کو کھاؤ اور سرکشی اختیار نہ کرنا۔ جس نے سرکشی اختیار کی اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوگا اور جس پر اس کا غضب نازل ہوا وہ دنیا میں برباد ہوا اور آخرت میں اسے اذیّت ناک عذاب ہوگا۔ جس نے تائب ہو کر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کی اور صالح اعمال کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ اسے معاف کرتے ہوئے ہدایت سے سرفراز کرے گا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم فرمایا کہ اے موسیٰ! طور پہاڑ کی دائیں جانب فلاں جگہ پر پہنچ جاؤ تاکہ تمہیں تورات عنایت کی جائے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو بنی اسرائیل کی ذمہ داری دے کر کوہ طور کے دامن میں مقررہ وقت اور مقام پر پہنچے تو ان کے پیچھے بنی اسرائیل نے بچھڑے کی عبادت شروع کر دی۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول فرمائی۔

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہودی عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے اس کا سبب دریافت فرمایا تو انھوں نے جواب دیا کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو فرعون پر کامیاب کیا تھا۔ آپ نے فرمایا: "ہم یہود کے مقابلہ میں موسیٰ (علیہ السلام) کے زیادہ قریبی ہیں، لہٰذا تم بھی (اس دن) روزہ رکھا کرو۔"[1]

﴿ وَمَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمۡ اُولَآءِ عَلٰٓى

۱۔ [بخاری، کتاب التفسیر، باب (ولقد أوحینا إلی موسیٰ أن أسر بعبادی۔۔الخ): ۴۷۳۷۔ مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء: ۱۱۳۰]

اَثَرِیْ وَعَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا
قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ ﴿۸۵﴾

(اللہ نے فرمایا) اور اے موسیٰ (علیہ السلام)! تم نے اپنی قوم سے آگے چلے آنے میں جلدی کیوں کی؟۔(۸۳) موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کی کہ وہ میرے پیچھے آرہے ہیں اور اے میرے رب میں نے تیرے پاس آنے میں اس لیے جلدی کیتا کہ تو خوش ہو جائے۔(۸۴) اللہ نے فرمایا، ہم نے تمہارے آنے کے بعد تمہاری قوم کو فتنہ میں مبتلا کر دیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے۔(۸۵)

حافظ اسماعیل بن عمر بن کثیر دمشقی متوفی 774ھ لکھتے ہیں:

فرعون اور اس کی قوم کے ہلاک ہونے کے بعد جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سمندر کے پار اترے تو وہاں انہوں نے ایک قوم کو دیکھا جو بتوں کی پرستش کر رہی تھی۔ بنو اسرائیل نے کہا اے موسیٰ! ہمارے لیء بھی اسی طرح کا ایک معبود بنا دیجئے جس طرح ان لوگوں کے معبود ہیں، حضرت موسیٰ نے فرمایا تم لوگ کیسی جہالت کی باتیں کر رہے ہو، یہ تو برباد شدہ لوگ ہیں اور ان کی عبادت بھی باطل ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رب نے ان سے تیس راتوں کا وعدہ فرمایا تھا پھر ان میں دس راتوں کا اور اضافہ فرما دیا۔ یعنی ان چالیس دنوں میں دن اور رات روزے رکھیں۔ پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور اس کا کلام سننے کے شوق میں جلدی جلدی روانہ ہوئے اور بنو اسرائیل کی دیکھ

بھال اوران کو ہدایت پر قائم رکھنے کے لیے اپنے بھائی ہارون کو خلیفہ مقرر کر دیا اور خود طور کی طرف چل پڑے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے پوچھا اے موسیٰ! آپ نے اپنی قوم کو چھوڑ کر آنے میں کیوں جلدی کی؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ خوب عالم ہے لیکن اس نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے دل کو تسکین دینے کے لیے اوران کی عزت افزائی کے لیے یہ سوال کیا تھا۔ [1]

علامہ ابوعبداللہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ ھ لکھتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کیا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے کلام کے جلال سے متحیر ہو گئے اور بجائے اس کے کہ عجلت کا سبب بیان کرتے یہ کہا وہ لوگ میرے پیچھے آ رہے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ کے سوال کی طرف متوجہ ہوئے اور عجلت کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا اے میرے رب! میں نے تیرے پاس آنے میں اس لے جلدی کی تا کہ تو راضی ہو جائے۔

حضرت موسیٰ نے جو یہ کہا تھا کہ وہ لوگ میرے پیچھے ہیں۔ اس سے ان کی یہ مراد نہیں تھی کہ وہ لوگ ان کے پیچھے پیچھے رہے ہیں یعنی وہ بھی طور کی طرف آ رہے ہیں، بلکہ ان کی مراد یہ تھی کہ وہ بھی یہاں پر قریب ہیں اور میری واپسی کا انتظار کر رہے ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون کو یہ حکم دیا تھا کہ ان کے روانہ ہونے کے بعد وہ بھی بنی اسرائیل کو لے کر روانہ ہوں اور ان کے ساتھ آ کر مل جائیں اور بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس آیت میں قوم سے مراد وہ ستر نفوس ہیں جن کو حضرت موسیٰ نے چن لیا تھا وہ بھی حضرت موسیٰ کے ساتھ روانہ ہوئے تھے لیکن جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) طور کے قریب پہنچے تو اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کے شوق میں ان سے آگے نکل گئے اس لیے اللہ تعالیٰ نے

---

[1] (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص 180، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1419ھ)

پوچھا آپ نے اپنی قوم سے پہلے پہنچنے میں کیوں عجلت کی۔ایک قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق طور سیناء کی طرف روانہ ہوئے تو اپنے رب کی طرف مشتاق ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے شوق کی شدت کی وجہ سے یہ مسافت ان پر طویل ہوگئی پھر وہ صبر نہ کر سکے اور ان لوگوں کو چھوڑ کر اکیلے ہی چل پڑے پھر جب اپنے مقام پر ٹھہرے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ نے اپنی قوم کو چھوڑ کر آئے میں کیوں جلدی کی؟

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا اے میرے رب! میں نے اس لیے جلدی کی تا کہ آپ راضی ہو جائیں۔قتادہؒ نے اس کی تفسیر میں کہا یعنی تیری ملاقات کے شوق میں جلدی کی۔

﴿ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ
يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۭ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ
اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ
مَّوْعِدِيْ ۝۸۶ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ
اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى
السَّامِرِيُّ ۝۸۷ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ
اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۙ فَنَسِيَ ۝۸۸ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ

قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿٨٩﴾

چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) غم اور غصہ کے ساتھ اپنی قوم کی طرف لوٹے، موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے میری قوم! کیا تم سے تمہارے رب نے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا میری جدائی کی مدت تمہیں لمبی معلوم ہوئی! یا تمہارا یہ ارادہ تھا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب نازل ہو، سو اس لیے تم نے مجھ سے کیے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی کی۔ (۸۶) انہوں نے جواب دیا ہم نے اپنے اختیار سے آپ سے کئے ہوئے وعدے کے خلاف نہیں کیا بلکہ ہم لوگوں کے زیورات کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے پھر ہم نے اس کو آگ میں ڈال دیا اور اسی طرح سامری نے (اپنے حصے کے زیور) ڈال دیے۔ (۸۷) پھر سامری نے ان کے لیے (ان زیورات سے) ایک بچھڑا نکالا یعنی ایک بے جان دھڑ تھا جس سے گائے کی آواز نکلتی تھی، یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا بھی معبود ہے، مگر موسیٰ بھول گئے ہیں۔ (۸۸) کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا اور نہ ہی ان کے لیے کسی نقصان اور نفع کا اختیار رکھتا ہے۔ (۸۹)

زیورات سے بچھڑا بنانے کی تفصیل

مفسرین نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے ان سے کہا تھا یہ زیورات نجس ہیں تم ان سے پاکیزگی حاصل کرو، اور سامری نے کہا حضرت موسیٰ کو جو دیر ہوگئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان زیورات کی سزا میں ان کو روک لیا گیا ہے۔ قرآن مجید اوزار کا لفظ ہے اس کا معنی ہے گناہ، اور چونکہ قبطی ان زیورات کو اپنی کفریہ مجالس میں پہن کر جاتے اس لیے ان کو گناہ فرمایا۔

پھر بنی اسرائیل نے کہا ہم نے ان کو آگ میں ڈال دیا اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے ان کو حکم دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے تک ان زیورات کو ایک گڑھے میں ڈال دو اور سامری کے کہنے سے انہوں نے ان کو آگ میں ڈال دیا۔ سامری نے ان زیورات کو پگھلا کر بچھڑے کا مجسمہ بنالائے۔ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ وہ سونے کا بے جان مجسمہ تھا یا وہ گوشت پوست کا چلتا پھرتا جاندار بچھڑا بن گیا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ بے جان مجسمہ تھا کیونکہ یہ جائز نہیں ہے کہ ایک گمراہ میں سوراخ اور جھریاں رکھیں ان سے ہوا گزرتی تھی، اس مجسمہ میں ایک طرف سے ہوا داخل ہوتی اور دوسری طرف سے نکل جاتی اور ہوا کے گزرنے سے اس میں آواز پیدا ہوتی تھی جو بچھڑے کی سی آواز کے مشابہ تھی۔ [1]

مصری لوگ ہندوؤں کی طرح گائے کی پرستش کرتے تھے اور اس کی تقدیس کے قائل تھے۔ بنی اسرائیل میں بھی مسلمان ہونے کے باوجود قبطی مشرکوں کی غلامی اور ان سے میل جول کی وجہ سے یہ عقیدہ سرایت کر گیا تھا، جس کا وقتاً فوقتاً اظہار ہوتا رہتا تھا، جیسا کہ اس وقت ہوا جب موسیٰ (علیہ السلام)

۱۔ (جامع البیان جز16 ص249250 ملخصاً)

نے انھیں کوئی گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ دیکھیے سورہ بقرہ (٦٧) اب موسیٰ (علیہ السلام) کی عدم موجودگی میں سامری نے بنی اسرائیل کے زیوروں سے گائے کا بچھڑا بنایا جو بے جان تھا، مگر ایسی کاری گری سے بنایا گیا تھا کہ اس میں رکھے گئے سوراخوں کی وجہ سے خود بخود گائے کی سی آواز نکلتی تھی۔ وہ لوگ جنھوں نے سمندر سے پار ہوتے ہی چند بت پرستوں کے پاس سے گزرتے ہوئے موسیٰ (علیہ السلام) سے ان کے معبودوں جیسا معبود بنانے کا مطالبہ داغ دیا تھا، انھی جاہلوں نے فوراً اسے اپنا معبود تسلیم کرلیا اور کہنے لگے، تمہارا اور موسیٰ کا اصل معبود تو یہ ہے، موسیٰ بھول میں پڑ گئے جو طور پر کسی معبود سے کلام کے لیے گئے ہیں۔

﴿ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۝٩٠ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝٩١ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۝٩٢ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۝٩٣ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّىْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ۝٩٤ ﴾

اور ہارون علیہ السلام نے ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اے لوگو! تم اس کے ذریعہ سے فتنے میں ڈال دیئے گئے ہو، تمہارا رب تو رحمٰن ہے تو میری پیروی کرو اور میرا کہا مانو۔ (۹۰) مگر انہوں نے جواب دیا کہ جب تک موسیٰ علیہ السلام ہمارے پاس واپس نہ آجائے ہم تو اسی (کی پرستش) پر جمے رہیں گے۔ (۹۱) موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا، اے ہارون! (علیہ السلام) جب تو نے دیکھا وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو تم کو کس چیز نے روکا۔ (۹۲) اس بات سے کہ تم میرے پیچھے چلے آتے بھلا تم نے میرے حکم کے خلاف کیوں کیا۔ (۹۳) ہارون (علیہ السلام) نے کہا: اے میرے ماں جائے! میری ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو نہ پکڑیئے میں تو اس بات سے ڈرا کہ آپ یہ نہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا لحاظ نہ رکھا۔ (۹۴)

ہارون (علیہ السلام) نے بنی اسرائیل کو تنبیہ کی تھی کہ تم لوگ بچھڑے کو اپنا معبود بنا کر گمراہ ہو گئے ہو، تمہارا رب وہ اللہ ہے جس کی صفت رحمن ہے، اس لیے میری بات مانو اور اسی کی عبادت کرو، تو ان گمراہ لوگوں نے جواب دیا کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے واپس آنے تک ہم اپنے اسی معبود کی عبادت کریں گے۔ ہارون (علیہ السلام) نے جب اس بت پرستی پر ان کا اصرار دیکھا تو ان بارہ ہزار افراد کو لے کر الگ ہو گئے جنھوں نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی تھی۔ موسیٰ (علیہ السلام) جب واپس پہنچے اور لوگوں کو

بچھڑے کے گرد ناچتے اور گاتے دیکھا تو اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) سے کہنے لگے کہ جب آپ نے ان کو گمراہ ہوتے ہوئے دیکھا تو آ کر مجھے خبر کیوں نہ کی، آپ نے میرے حکم کی کیسے مخالفت کی! شدت ناراضی میں ان کے سر اور داڑھی کے بال پکڑ کر کھینچنے لگے، تو ہارون (علیہ السلام) نے کہا کہ میری ماں جائے بھائی! میری داڑھی اور سر کے بال نہ کھینچو، میں نے تو یہ سوچا کہ اگر میں صرف موحدین کو لے کر تمہارے پاس آجاتا ہوں اور بچھڑے کی عبادت کرنے والوں کو چھوڑ دیتا ہوں تو تم کہو گے کہ آپ نے بنی اسرائیل کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور میری بات کا خیال نہیں کیا کہ میری عدم موجودگی میں ان کی دیکھ بھال کیجیے گا۔

موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام پر ناراض ہونا

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبیؒ متوفی 668ھ لکھتے ہیں:

جب حضرت موسیٰ طور سے واس آئے تو انہوں نے لوگوں کے شور وشغب اور چلانے کی آوازیں سنیں اس وقت بنی اسرائیل بچھڑے کے گرد خوشی سے ناچ رہے تھے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ ستر (70) اسرائیلی تھے۔ آپ نے ان سے فرمایا یہ فتنہ کی آوازیں ہیں۔ پھر جب انہوں نے حضرت ہارون کو دیکھا تو غضب میں آ کر دائیں ہاتھ سے ان کے سر کے بال پکڑے اور بائیں ہاتھ سے ان کی داڑھی پکڑی اور کہا اے ہارون جب آپ نے دیکھا کہ یہ گمراہ ہو گئے تو آپ کو کس چیز نے منع کیا؟ جو آپ نے میری پیروی نہ کی اور میرے حکم کی نافرمانی کی۔ یعنی آپ نے میری اتابع میں ان پر انکار کیوں نہیں کیا۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ آپ کو علم تھا کہ اگر میں ان میں ہوتا تو میں ان کے کفر کی بناء پر ان سے قتال کرتا تو پھر آپ نے ان سے قتال کیوں نہیں کیا؟ جب وہ غیر اللہ کی عبادت کر رہے تھے تو پھر آپ کا

ان کے درمیان ٹھہرے رہنا میری نافرمانی تھی، آپ ان سے اس وقت الگ کیوں نہیں ہوئے؟
یہ تمام آیات نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی اصل ہیں اور جب کوئی شخص کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہوئے دیکھے تو اس پر واجب ہے کہ وہ ان کو اس برائی سے روکے اور اگر یہ نہ کر سکے تو ان کے درمیان سے اٹھ کر چلا جائے اور جو شخص ان کے درمیان بیٹھا رہے گا خصوصاً اس وقت جب وہ ان کے کام سے راضی ہو تو اس کا بھی وہی حکم ہوگا جو ان نافرمانی کرنے والوں کا حکم ہوگا۔
امام ابوبکر الطرطوشیؒ سے سوال کیا گیا کہ مذہب صوفیہ کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے انہیں بتایا گیا کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایک مجلس میں ذکر کرتے ہیں پھر وہ ڈھول پر چھڑیاں مارتے ہیں اور کچھ لوگ کھڑے ہو کر رقص کرتے ہیں اور وجد کا اظہار کرتے ہیں حتیٰ کہ ان میں ایک شخص بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے، پھر وہ مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کی مجلس میں بیٹھنا جائز ہے یا نہیں؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ صوفیہ کا مذہب بطالت، جہالت اور ضلالت ہے اور اسلام تو صرف کتاب اللہ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت ہے۔ رہا رقص کرنا اور وجد کا اظہار کرنا تو سب سے پہلے اس میں سے بیل کی سی آواز نکلنے لگی تو وہ اس کے گرد رقص کرنے لگے اور وجد کا اظہار کرنے لگے، سو یہ کفار اور بچھڑ نے کی عبادت کرنے والوں کا دین ہے اور رہا ڈھول بجانا تو سب سے پہلے اس کو زندیقوں نے ایجاد کیا تھا تاکہ مسلمانوں کو اللہ کی کتاب سے دور کر دیں اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے اصحاب کے ساتھ اس طرح وقار کے ساتھ بیٹھتے تھے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں، پس سلطان اور دیگر حکام پر لازم ہے کہ ان لوگوں کو مساجد وغیرہ میں ایسی مجلس منعقد نہ کرنے دیں اور جو شخص بھی اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے ان کی مجلس میں بیٹھنا

جائز نہیں ہے اور نہ ان کے مشغلہ میں تعاون کرنا جائز ہے۔ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر ائمہ مسلمین کا یہی مذہب ہے اور اللہ تعالیٰ سے ہی توفیق مطلوب ہے۔ [1]

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے تو یہ کہا تھا کہ اے ہارون! جب آپ نے دیکھا کہ یہ گمراہ ہو گئے تو آپ کو کس چیز نے منع کیا جو آپ نے میری پیروی نہ کی۔ کیا آپ نے میری حکم کی نافرمانی کی؟ حضرت ہارون (علیہ السلام) کو چاہیے تھا کہ یہ کہتے کہ میں نے آپ کی نافرمانی نہیں کی، لیکن انہوں نے جواب میں کہا: بیشک مجھے یہ خطرہ تھا کہ آپ کہیں گے تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میرے حکم کا انتظار نہیں کیا۔ بظاہر یہ جواب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے اعتراض سے مربوط اور منطبق نہیں ہے اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے یہ کہا تھا کہ میرے بعد میری نیابت کرنا اور قوم کی اصلاح کرنا اور ایسا کوئی کام نہ کرنا جس سے قوم میں تفرقہ ہو اور پھوٹ پڑ جائے۔ قرآن مجید میں ہے:

(الاعراف:142) تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور اصلاح کرنا اور فریاد کرنے والوں کے طریقہ کی پیروی نہ کرنا۔

پس حضرت ہارون (علیہ السلام) کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے مجھے قوم میں پھوٹ ڈالنے سے منع کیا تھا اور جب میں نے یہ دیکھا کہ ان کو شرک سے روکنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ان سے قتال کیا جائے تو پھر میں ان سے الگ ہو گیا۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي: "لِحْيَةٌ" سے مراد داڑھی ہے، یہ انبیاء (علیہ السلام)

---

[1] (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۱ ص 151-152 مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

کی عظیم سنت ہے اور امور فطرت میں سے ہے۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بہت سی احادیث اس کی فرضیت و اہمیت پر دلالت کرتی ہیں، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "مشرکین کی مخالفت کرو، یعنی داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھوں کو کاٹو۔" اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: "مونچھیں اچھی طرح کاٹو اور داڑھیاں چھوڑ دو۔"[1]

سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "مونچھیں کاٹو اور داڑھیوں کو ڈھیل دے دو اور مجوسیوں کی مخالفت کرو۔"[2]

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مونچھیں کاٹنے اور داڑھی چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے۔[3]

حضرت نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب حج یا عمرہ میں حلق کرواتے، تو اپنی داڑھی کو مُٹھی میں پکڑتے اور جو حصّہ مُٹھی سے زیادہ ہوتا اسے کاٹ دیتے تھے۔[4]

﴿ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا
بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ
سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿٩٦﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ

۱۔[بخاری، کتاب اللباس، باب تقلیم الأظفار: ۵۸۹۲، ۵۸۹۳۔ مسلم، کتاب الطھارۃ، باب خصال الفطرۃ: ۲۵۹/۵۴]

۲۔[مسلم، کتاب الطھارۃ، باب خصال الفطرۃ: ۲۶۰]

۳۔[مسلم، کتاب الطھارۃ، باب خصال الفطرۃ: ۲۵۹/۵۳]

۴۔(صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب تقلیم الأظفار وقص الشارب، حدیث نمبر: 5892)

تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى
اِلٰهِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ
فِی الْیَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ
كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

(پھر) موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے سامری تیرا کیا حال ہے۔(۹۵) سامری نے کہا کہ میں نے ایسی چیز دیکھی جو اوروں نے نہیں دیکھی تو میں نے رسول کے نقش قدم سے ایک مٹھی مٹی کی بھر لی، پھر اس کو اس (بچھڑے کے) بت میں ڈال دیا اور مجھے میرے دل نے اس کام کو اچھا بتایا۔(۹۶) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا بس تو چلا جا سو تیرے لیے اس دنیاوی زندگی میں تو یہ سزا ہے کہ تو یوں کہتا پھرے کہ مجھے ہاتھ نہ لگانا اور اس کے علاوہ تیرے لیے ایک اور وعدہ ہے جو تجھ سے ہرگز نہیں ٹلے گا، اور اب تو اپنے اس معبود کے انجام کو بھی دیکھ لے جس (کی پرستش) پر تو جما ہوا بیٹھا ہے، ہم ابھی اسے جلائے دیتے ہیں پھر اس (کی راکھ) کو دریا میں بہا دیں گے۔(۹۷) تمہارا معبود تو صرف اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی

عبادت کے لائق نہیں، اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔(۹۸)۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو یقین ہو گیا کہ یہ سامری نے جرم کیا ہے۔انھوں نے بڑے جلال میں آ کر سامری سے استفسار فرمایا کہ اے سامری! تو نے بنی اسرائیل کو کیوں گمراہ کیا؟ سامری نے کہا میں نے ایک ایسی چیز دیکھی جسے لوگ نہ دیکھ پائے۔ میں نے وہاں سے ایک مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور اسے پگھلے ہوئے زیورات میں ڈال کر بچھڑا بنایا اور یہ سب کچھ میرے اپنے دل و دماغ کا کیا دھرا ہے۔سامری کے الفاظ اور انداز سے معلو ہوتا ہے کہ اس نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے جلال سے ڈر کر اس بات کا اعتراف کیا کہ اس جرم میں کسی اور کا کوئی حصہ نہیں بلکہ یہ میرے ہی نفس کی شرارت ہے۔اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مفسرین نے بڑی معرکہ آراء بحث کی ہے۔ ایک طبقہ کا خیال ہے " اَثَرَ الرَّسُوْلِ " سے مراد حضرت جبرائیل امین (علیہ السلام) کے نقش قدم ہیں۔ جب انھوں نے ڈوبتے ہوئے فرعون کے منہ میں مٹی ڈالی تھی تو جبرائیل امین (علیہ السلام) کی سواری جہاں قدم رکھتی وہاں سبزہ اگ آتا۔سامری نے یہ منظر دیکھ کر وہ مٹی اٹھائی اور بعد ازاں بنی اسرائیل کے زیورات کو پگھلا کر ایک بچھڑا بنایا جس کے منہ میں یہ مٹی ڈالی تو وہ بولنے لگا۔دوسرا طبقہ اس معاملے میں اس حد تک آگے گزر گیا کہ انھوں نے اسرائیلی روایات کو بنیاد بنا کر حضرت ہارون (علیہ السلام) کو اس کام میں ملوث کر ڈالا حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ بنی اسرائیل کے زیورات سے سامری نے بچھڑا بنایا اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے جبرائیل امین (علیہ السلام) کے ساتھ اس مٹی کی نسبت جوڑی جس کو اس نے بچھڑے کے منہ میں ڈالا تھا۔اس میں مٹی کا کوئی کمال نہ تھا یہ سامری کی فنکاری کا نتیجہ تھا کہ اس نے زیورات کو ڈھال کر اس تکنیک کے ساتھ بچھڑے کا پتلا تیار کیا کہ جب اس کی ناک کی طرف سے ہوا داخل ہوتی تو

اس کے منہ سے مختلف قسم کی آوازیں آتی۔جس سے متاثر ہوکر جاہل اور ضعیف الاعتقاد لوگوں نے اسے معبود سمجھ لیا۔

موسیٰ (علیہ السلام) نے سامری کی زبانی تفصیلات سننے کے بعد اللہ کے حکم سے اسے شہر بدر کر دیا اور بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ کوئی آدمی بھی اس سے بات نہ کرے اور ہر شخص اس سے قطع تعلق کرے۔ایک مفہوم تو یہ ہے اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ انھوں نے اسے اللہ کا یہ فیصلہ سنا دیا کہ اسے ہمیشہ کے لیے چھوت چھات کی بدترین بیماری لگ جائے گی اور وہ جب تک زندہ رہے گا اس کا حال یہ ہوگا کہ کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دے گا اور ہر شخص سے کہے گا کہ میرے قریب نہ آؤ۔"لَا مِسَاسَ" کا بہترین مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سامری پر لوگوں کی قربت کو حرام کر دیا، وہ جب بھی کسی کو چھوتا تو دونوں کو شدید بخار آجاتا، اس لیے کسی آدمی کو اپنے سے قریب ہوتے دیکھ کر بھاگ پڑتا اور چیخنے لگتا کہ میرے قریب نہ آؤ۔ چنانچہ وہ شہر سے نکل کر جنگل میں چلا گیا اور جانوروں کی سی زندگی گزارنے لگا اور اسی حال میں مر گیا۔

امام بغویؒ نے لکھا ہے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بنی اسرائیل کو حکم دے دیا تھا کہ اس سے میل جول نہ رکھنا اس کے پاس بھی نہ جانا۔حضرت ابن عباسؓ نے لا مساس کی تفسیر میں فرمایا نہ تجھے چھونا ہے نہ تیری اولاد کو (یعنی نہ تجھے کوئی چھوئے گا نہ تیری اولاد کو) مَوْعِداً یعنی آخرت میں عذاب کا اللہ کی طرف سے مقرر وعدہ ہے۔

یہ دنیاوی سزا تھی جو سامری کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملی اور عذاب آخرت کے بارے میں اسے بتایا گیا کہ اس کے لیے ایک وقت مقرر ہے، جب وہ وقت آجائے گا تو اسے عذاب بھگتنا پڑے گا اور وہ کسی

صورت بھی اس سے بچ نہیں سکے گا۔آیت کے آخر میں ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے سامری سے کہا کہ تم جس معبود کے سامنے ہر دم جھکے رہتے تھے، ہم اسے جلا کر خاکستر بنا دیں گے اور اس کی راکھ سمندر میں پھینک دیں گے، تاکہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، درحقیقت ان کا مقصد سامری اور دیگر بت پرستوں کے سامنے ان کے اس جھوٹے معبود کی حقارت کا اظہار تھا۔

اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ ۚ: یہ موسیٰ (علیہ السلام) کا کلام ہے جنھوں نے سامری سے خطاب کے بعد اپنی امت کے لوگوں کو مخاطب فرمایا۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے کی دو دلیلیں بیان ہوئی ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔اہل علم فرماتے ہیں کہ اس صفت میں ساری صفات آجاتی ہیں، تفصیل اس کی علم کلام کی کتابوں میں "لا الٰہ الا اللہ" کی تشریح میں مذکور ہے۔دوسری دلیل خاص صفت علم ہے جس کے گھیرے سے کوئی چیز باہر نہیں۔"وَسِعَ" کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ گھیرا ڈالنے والی چیز میں اس کے اندر والی چیز سے زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔(ابن عاشور) جو "كُلَّ شَیْءٍ" سے بھی وسیع ہے، اس کی وسعت کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟۔

﴿ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ
اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾ مَّنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ

زُرۡقًا ﴿۱۰۲﴾ یَّتَخَافَتُوۡنَ بَیۡنَہُمۡ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا عَشۡرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحۡنُ
اَعۡلَمُ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ اِذۡ یَقُوۡلُ اَمۡثَلُہُمۡ طَرِیۡقَۃً اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا
یَوۡمًا ﴿۱۰۴﴾

(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس طرح ہم آپ کو گزرے ہوئے حالات کی خبریں سناتے ہیں اور ہم نے آپ کو اپنی طرف سے ایک "نصیحت (قرآن)" عطا کیا ہے۔ (۹۹) جو شخص اس سے منہ پھیرے گا تو یقیناً وہ قیامت کے دن (گناہ کا) بوجھ اٹھائے گا۔ (۱۰۰) ایسے لوگ اس (عذاب) میں ہمیشہ رہیں گئے اور یہ بوجھ قیامت کے دن ان کے لیے برا ہوگا۔ (۱۰۱) جس دن صور پھونکا جائے گا، اس دن ہم مجرموں کو اس حال میں اکٹھا کریں گے کہ خوف کے مارے ان کی آنکھیں نیلی نیلی ہوں گی۔ (۱۰۲) وہ آپس میں چپکے چپکے ایک دوسرے سے کہیں گے کہ تم دنیا میں کوئی دس دن ہی رہے ہوگے۔ (۱۰۳) جو باتیں یہ کریں گے ہم خوب جانتے ہیں اس وقت ان میں سب سے بہتر رائے والا (یعنی عقل مند اور ہوش مند) کہے گا کہ نہیں بلکہ صرف ایک ہی روز رہے ہو۔ (۱۰۴)

سورت کے آغاز میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہم نے یہ قرآن کریم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اس لیے نازل نہیں کیا تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی مشکل میں پڑ جائیں بلکہ اس کے نزول کا سبب تو یہ ہے کہ بگڑی ہوئی نوع انسانی کے لیے یہ ایک یاددہانی اور نصیحت ہے لیکن اس کا فائدہ صرف وہ اٹھا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہو۔ پھر اس کے بعد حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی سرگزشت کو بیان کیا گیا اور اس میں یہ دکھایا گیا کہ حضرت موسیٰ کو جب اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی تو اس کے بعد ان کو ایک کتاب بھی دی گئی جسے انسانی زندگی کی رہنما بنایا گیا۔ لیکن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر وہ لوگ ایمان لائے اور اس کتاب سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھایا جن کے دلوں میں خشیت الٰہی تھی۔ جادوگروں کے دل میں جب خشیت الٰہی کا نور جگمگا اٹھا تو فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک گئے لیکن فرعون اور آل فرعون اپنی نامرادی کے باعث اللہ تعالیٰ کی خشیت سے دور رہے تو وہ نہ صرف ایمان کی دولت سے محروم رہے بلکہ انھوں نے نبی کی نبوت کو ناکام کرنے بلکہ اسے بنی اسرائیل سمیت تباہ کرنے کے لیے بحر قلزم تک اس کا تعاقب کیا۔ لیکن انجام کیا ہوا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور ان پر ایمان لانے والے کامیاب و کامران ٹھہرے اور فرعون اور اس کی قوم اپنی حکومت، وجاہت اور دولت کے باوجود بحر قلزم کا شکار ہوئے۔ قریش کو اچھی طرح اس بات کو سوچ لینا چاہیے کہ یہ آیات ان کے لیے آئینہ ہیں۔ ان سے ان کو اپنے انجام کو جاننے میں مدد مل سکتی ہے اور انھیں معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں اور کامیابی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان پر ایمان لانے والوں کے انتظار میں ہے کیونکہ قریش کا وہی رویہ ہے جو فرعون اور اس کی قوم کا تھا اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہی دعوت پیش کر رہے ہیں جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے پیش کی تھی۔

قرآن کریم سے اعراض کرنے کا انجام

جب اللہ تعالیٰ کا کوئی رسول آتا ہے تو پھر اس پر ایمان لانے اور اس پر نازل ہونے والی کتاب کی رہنمائی کے قبول کرنے یا نہ کرنے پر لوگوں کی قسمتوں کا انحصار ہوتا ہے اگر وہ قبول کرلیں تو بچ جاتے ہیں، انکار کردیں اور تمرد اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوجاتے ہیں۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کے آخری رسول پر نازل ہونے والی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کی رسالت قیامت تک کے لیے ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی رہنمائی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ جو شخص اور جو قوم اس کی رہنمائی قبول کرنے سے اعراض کرتی ہے اولاً تو وہ دنیا ہی میں مختلف مصائب کا شکار ہوتی ہے ورنہ جہاں تک قیامت کا تعلق ہے اس دن قرآن وسنت سے پہلوتہی اور اعراض ان کے لیے ایک بہت برے بوجھ کا باعث بنے گا۔ یہ ایک ایسا بار گناہ ہوگا جس کے وبال سے کبھی انھیں خلاصی نہیں ہوگی اور قیامت کے دن بدترین سزا کا باعث بنے گا۔

قیامت کا پس منظر

قیامت کو معمولی بات نہ سمجھا جائے، یہ ایک ایسی ہمہ گیر جوابدہی کا دن ہے جس میں تمام نوع انسانی کے افراد صور پھونکے جانے کے بعد اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے جس دن میں صور پھونکا جائے گا اور مجرموں کو اکٹھا کیا جائے گا اس دن ان کی آنکھیں نیلگوں ہوں گیں۔ صور سے مراد وہ نرسنگا ہے جس میں حضرت اسرافیل اللہ تعالیٰ کے حکم سے پھونک ماریں گے تو قیامت واقع ہوگی۔ [1]

۱۔ (مسند احمد ج ۲ ص 191)

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے اسرافیل قرن کو منہ لگائے کھڑا ہے۔ پیشانی جھکائی یا موڑی ہوئی ہے اور رب کے حکم کا منتظر ہے کہ کب اسے حکم دیا جائے اور وہ اس میں پھونک مارے۔ [1]

دو مرتبہ صور پھونکا جائے گا۔ پہلی بار صور پھونکنے سے قیامت آجائے گی اور ساری مخلوق فنا ہو جائے گی اور دوسری بار صور پھونکنے سے تمام مردے زندہ ہو جائیں گے اور سب لوگوں کو میدان حشر کی طرف لے جایا جائے گا اور اس آیت میں یہی صور مراد ہے کیونکہ اس کے بعد فرمایا ہے اور مجرموں کو اکٹھا کیا جائے گا اس دن ان کی آنکھیں نیلگوں ہوں گی۔

بعض لوگوں کو فرشتے ہانکتے اور پیٹتے ہوئے میدانِ حشر میں لے جائیں گے۔ اس دن کی ہولناکی کا عالم یہ ہوگا کہ خوف کے مارے ان کے سارے جسم نیلے پڑ جائیں گے، کیونکہ جب خوف کی وجہ سے خون سکڑ جاتا ہے تو جسم نیلا پڑنے لگتا ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک "زُرق" ازرق کی جمع ہے اس سے مراد نیلی آنکھیں ہوتی ہیں یا نیلی آنکھوں والا۔ اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ خوف کی وجہ سے ان کی آنکھیں نیلی اور بے نور ہو جائیں گی، جیسے موت کے وقت پتلیاں نیلی پڑ جاتی ہیں۔ اس لیے اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی شکلیں بگڑ جائیں گی اور ان کے چہرے پر خوف کے گہرے اثرات ہوں گے کیونکہ عرب نیلی اور کرنجی آنکھ کو بدنما سمجھتے تھے۔

قیامت کی ہولناکی کا عالم یہ ہوگا کہ جب لوگ میدان حشر میں نہایت بے بسی کے ساتھ خوف کی حالت میں گرفتار ہوں گے تو ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ کہیں گے کہ دنیا کی زندگی یا برزخ کا دور ہم جو گزار کے آئے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ دس دن کی مدت ہوگی۔ یعنی یا تو اس ہیبت ناک منظر کی وجہ سے دنیا

۱۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 243)

میں قیام کا تصور ان کی نگاہوں میں سمٹ جائے گا اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے جس حال میں زندگی کا آخری سانس لیا انھیں صرف وہ یاد ہوگا برزخ کے تصور سے بالکل بے بہرہ ہوجائیں گے۔ وہ محسوس کریں گے کہ جان کنی کے بعد جو ہم پر حالت گزری ہے اس کی مدت زیادہ سے زیادہ دس دن ہوگی۔ لیکن یہ باتیں وہ سرگوشی کے انداز میں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ان کی سرگوشیوں کو بھی جانتے ہیں۔ اس لیے ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ کیا کہیں گے اور ان کی کیا حالت ہوگی۔ اور یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ ان کا محتاط ترین آدمی جو نہایت سوچ سمجھ کر بات کرنے کا عادی ہے اور یا ان کا بوجھ بجھکڑ جس کو یہ لوگ اپنا دانشور سمجھتے تھے وہ یہ کہے گا کہ دس دن کی مدت تو بہت ہوتی ہے۔ تم تو بصد مشکل دنیا میں ایک دن گزار کے آئے ہو۔

﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۙ﴿۱۰۵﴾
فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۙ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾
يَوْمَىِٕذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ
لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾ ﴾

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور لوگ آپ سے پہاڑوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیں کہ میرا رب ان کو ریزہ ریزہ کرکے بکھیر دے گا۔ (۱۰۵) پھر زمین کو ہموار میدان بنا کر چھوڑ دے گا۔ (۱۰۶) جس میں (اے مخاطب) تم کوئی

بل اور سلوٹ نہ دیکھو گے۔(۱۰۷)اس دن سب لوگ ایک پکارنے والے کے پیچھے پیچھے چلیں گے،کوئی روگردانی نہیں کر سکے گا اور اور خدائے رحمن کے سامنے تمام آوازیں خاموش ہو جائیں گی،پس تم نہ سنو گے مگر مدھم سی آہٹ۔(۱۰۸)

شان نزول:(آیت)"ویسئلونک عن الجبال"۔(الخ)

ابن مندرؒ نے ابن جریحؒ سے روایت کیا ہے کہ قریش نے کہا اے محمد(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کا پروردگار پہاڑوں کی قیامت کے دن کیا حالت کرے گا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لوگ آپ سے پہاڑوں کی نسبت پوچھتے ہیں(الخ)۔

رسول کریم(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کفار کے سامنے حشر کی ہولناکیوں کا تذکرہ کیا تو انھوں نے سوال اٹھایا۔ بتائیں کہ پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ اور جن کی بلندیاں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ اتنے بڑے، بڑے پہاڑوں کا کیا بنے گا؟ جس کا جواب دینے کے لیے آپ(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ارشاد ہوا کہ آپ انھیں فرمائیں کہ میرا رب انھیں دھول کی طرح اڑا دے گا اور زمین کو اس طرح ہموار اور چٹیل میدان بنائے گا کہ اس میں کوئی نشیب و فراز نہیں دیکھ پاؤ گے۔قرآن مجید نے یہ حقیقت کئی مقامات پر بیان فرمائی ہے کہ یہ پہاڑ ٹوٹ پھوٹ جائیں گے،اور یہ روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑنا شروع کر دیں گے۔(القارعۃ:۵)اس دن اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کو بدل ڈالیں گے اور ہر کسی کو اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہوگا۔(ابراہیم:۴۸)۔

اس دن تمام لوگ داعیٔ محشر کے پیچھے چل پڑیں گے،کوئی بھی اس کی راہ سے ادھر ادھر نہیں ہوگا اور اللہ

تعالیٰ کے رعب و دبدبہ سے پورے میدان محشر میں سکوت طاری ہوگا، کوئی دھیمی آواز بھی سنائی نہیں دے گی۔ یَوْمَئِذٍ یَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ لَا عِوَجَ لَهٗ: یعنی اس دن جب وہ یہ ہولناک حالات دیکھیں گے تو پکارنے والے کی آواز پر فوراً لبیک کہیں گے اور جہاں بھی انھیں جانے کا حکم دیا جائے گا فوراً لپکیں گے، ارشاد فرمایا: (فَتَوَلَّ عَنْهُمْ یَوْمَ یَدْعُ الدَّاعِ اِلٰی شَیْءٍ نُّكُرٍ ○ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ○ مُّهْطِعِیْنَ اِلَى الدَّاعِ یَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا یَوْمٌ عَسِرٌ)[القمر:٦ تا ٨] "سو ان سے منہ پھیر لے۔ جس دن پکارنے والا ایک ناگوار چیز کی طرف بلائے گا۔ ان کی نظریں جھکی ہوں گی، وہ قبروں سے نکلیں گے جیسے وہ پھیلی ہوئی ٹڈیاں ہوں۔ پکارنے والے کی طرف گردن اٹھا کر دوڑنے والے ہونگے، کافر کہیں گے یہ بڑا مشکل دن ہے۔" وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا : ارشاد فرمایا : (هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ ○ وَلَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فَیَعْتَذِرُوْنَ)[المرسلات:٣٥، ٣٦] "یہ دن ہے کہ وہ نہیں بولیں گے۔ اور نہ انھیں اجازت دی جائے گی کہ وہ عذر کریں۔"

﴿ یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا ۝١٠٩ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ۝١١٠ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ ؕ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ۝١١١ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا

يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

اس روز کوئی سفارش نفع نہیں دے گی، مگر اس آدمی کی جسے رحمٰن اجازت دے اور اس کے قول کو پسند فرمائے۔(۹) وہ لوگوں کے آنے والے اور گزرے ہوئے احوال کو جانتا ہے اور لوگ اپنے علم سے اللہ تعالیٰ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے۔(۱۰) اس دن لوگوں کے چہرے اس حیّ وقیوّم کے آگے جھک جائیں گے اور نامراد ہوگا وہ شخص جو (اس دن کوئی) ظلم کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔(۱۱) اور جو شخص نیک کام کرے گا اور مومن بھی ہوگا تو اس کو نہ کسی ظلم کا خوف ہوگا اور کسی نہ نقصان کا۔(۱۲)

قیامت کے روز شفاعت کی نوعیت

قیامت کے دن کسی کی مجال نہ ہوگی کہ دوسرے کے لیے شفاعت کرے ہاں جسے اللہ اجازت دے۔ نہ آسمان کے فرشتے بے اجازت کسی کی سفارش کر سکیں نہ اور کوئی بزرگ بندہ۔ سب کو خود خوف لگا ہوگا بے اجازت کسی کی سفارش نہ ہوگی۔ فرشتے اور روح صف بستہ کھڑے ہونگے، بے اجازت الٰہی کوئی لب نہ کھول سکے گا۔ خود سید الناس اکرم الناس رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی عرش تلے اللہ کے سامنے سجدے میں گر پڑیں گے اللہ کی خوب حمد وثنا کریں گے دیر تک سجدے میں پڑے رہیں گے پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنا سر اٹھاؤ کہو تمہاری بات سنی جائے گی، تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی پھر حد مقرر ہوگی آپ ان کی شفاعت کر کے جنت میں لے جائیں گے پھر

لوٹیں گے پھر یہی ہوگا چار مرتبہ یہی ہوگا۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلی سائر الانبیاء۔ اور حدیث میں ہے کہ حکم ہوگا کہ جہنم سے ان لوگوں کو بھی نکال لاؤ جن کے دل میں مثقال ایمان ہو۔ پس بہت سے لوگوں کو نکال لائیں گے پھر فرمائے گا جس کے دل میں آدھا مثقال ایمان ہو اسے بھی نکال لاؤ۔ جس کے دل میں بقدر ایک ذرے کے ایمان ہو اسے بھی نکال لاؤ۔ جس کے دل میں اس سے بھی کم ایمان ہو اسے بھی جہنم سے آزاد کرو، الخ۔ اس نے تمام مخلوق کا اپنے علم سے احاطہ کر رکھا ہے مخلوق اس کے علم کا احاطہ کر نہیں سکتی۔ جیسے فرمان ہے اس کے علم میں سے صرف وہی معلوم کر سکتے ہیں جو وہ چاہے۔ تمام مخلوق کے چہرے عاجزی پستی ذلت ونرمی کے ساتھ اس کے سامنے پست ہیں اس لیے کہ وہ موت وفوت سے پاک ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ ہی رہنے والا ہے وہ نہ سوئے نہ اونگھے۔ خود اپنے آپ قائم رہنے والا اور ہر چیز کو اپنی تدبیر سے قائم رکھنے والا ہے سب کی دیکھ بھال حفاظت اور سنبھال وہی کرتا ہے، وہ تمام کمالات رکھتا ہے اور ساری مخلوق اس کی محتاج ہے بغیر رب کی مرضی کے نہ پیدا ہو سکے نہ باقی رہ سکے۔ جس نے یہاں ظلم کئے ہوں گے وہ وہاں برباد ہوگا۔ کیونکہ ہر حق دار کو اللہ تعالیٰ اس دن اس کا حق دلوائے گا یہاں تک کہ بے سینگ کی بکری کو سینگ والی بکری سے بدلہ دلوایا جائے گا۔ حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ عزوجل فرمائے گا مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم کسی ظالم کے ظلم کو میں اپنے سامنے سے نہ گزرنے دوں گا۔ صحیح حدیث میں ہے لوگو ظلم سے بچو۔ ظلم قیامت کے دن اندھیرے بن کر آئے گا اور سب سے بڑھ کر نقصان یافتہ وہ ہے جو اللہ سے شرک کرتا ہوا مرا وہ تباہ وبرباد ہوا، اس لیے کہ شرک ظلم عظیم ہے۔ ظالموں کا بدلہ بیان فرما کر متقیوں کا ثواب بیان ہو رہا ہے کہ نہ ان کی برائیاں بڑھائی جائیں نہ ان کی نیکیاں گھٹائی جائیں۔ گناہ کی زیادتی اور نیکی کی کمی سے وہ بے کھٹکے ہیں۔

وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا: اس لیے کہ اس روز اللہ تعالیٰ مکمل انصاف فرمائے گا اور ہر صاحب حق کو اس کا حق دلائے گا۔ سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ہر صاحب حق کو اس کا حق دلایا جائے گا، حتیٰ کہ اگر ایک سینگ والی بکری نے بغیر سینگ والی بکری پر ظلم کیا ہوگا، تو اس کا بدلہ بھی دیا جائے گا۔ (۱)

سیدنا جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "لوگو! ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن تاریکیوں کا سبب ہوگا۔" (۲)

سیدنا ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "حکم ہوگا کہ واپس جاؤ اور جہنم سے ان لوگوں کو بھی نکال لاؤ جن کے دل میں ایک دینار کے برابر بھی ایمان ہو، چنانچہ وہ بہت سے لوگوں کو نکال لائیں گے اور کہیں گے، اے ہمارے رب! جن کو نکالنے کا تو نے حکم دیا تھا ہم نے ان سب کو نکال لیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا، پھر واپس جاؤ اور جس کے دل میں آدھے دینار کے برابر بھی ایمان ہو اسے بھی نکال لاؤ۔ چنانچہ وہ بہت سے لوگوں کو نکال لائیں گے اور کہیں گے، اے ہمارے رب! جن کو نکالنے کا تو نے حکم دیا تھا ہم ان سب کو نکال لائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پھر حکم دے گا کہ واپس جاؤ اور جس کے دل میں ایک ذرے کے برابر بھی ایمان ہو اسے بھی نکال لاؤ۔ چنانچہ وہ بہت سے لوگوں کو نکال لائیں گے اور کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہم ان سب کو نکال لائے ہیں جن کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان تھا۔" (۳)

۱۔ [مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظلم، ح: ۲۵۸۲]

۲۔ [مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظلم: ۲۵۷۸]

۳۔ [مسلم، کتاب الایمان، باب معرفۃ طریق الرؤیۃ: ۱۸۳۔ بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: (وجوہ یومئذ ناظرۃ۔۔الخ): ۷۴۳۹]

﴿ وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّ صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾ ﴾

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اسی طرح ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے اور اس میں طرح طرح سے وعید بیان کی ہے تا کہ وہ لوگ ڈر جائیں یا یہ (قرآن) ان کے لیے کوئی نصیحت پیدا کر دے۔ (۱۱۳) پس اللہ بادشاہ حقیقی بلند و بالا ہے۔ اور قرآن کی وحی جو تمہاری طرف بھیجی جاتی ہے اس کے پورا ہونے سے پہلے قرآن کے پڑھنے کے لیے جلدی نہ کیجئے اور دعا کیجئے کہ اے میرے رب! میرا علم اور زیادہ کر دے۔ (۱۱۴)

قرآن مجید کی صفات

اس آیت میں قرآن مجید کی دو صفتیں بیان فرمائی ہیں ایک یہ کہ یہ عربی زبان میں ہے اور دوسری یہ کہ اس میں کئی قسم کی سزاؤں کی خبر ہے۔ قرآن مجید کو عربی زبان میں اس لیے نازل فرمایا کہ عرب اس کو سمجھ سکیں اور وہ قرآن مجید کے معجز ہونے کی وجوہ کو جان سکیں، تا کہ ان پر یہ منکشف ہو جائے کہ یہ کسی انسان کا

کلام نہیں ہے۔ دوسری صفت یہ ہے کہ اس میں کئی قسم کی سزاؤں کی خبر ہے۔ یعنی ہم نے ان خبروں کو بار بار بیان فرمایا ہے اور ان کی تفصیل کی ہے اور ہم نے وہ احکام بیان فرمائے جن کو ہم نے فرض کیا ہے اور ان احکام کی تعمیل نہ کرنے پر ہم نے سزاؤں کو بیان فرمایا ہے، اسی طرح جن کاموں کو ہم نے حرام کیا ہے ان کے کرنے پر ہم نے سزاؤں کو بیان کیا ہے تا کہ لوگ فرائض اور واجبات کو ترک کرنے اور محرمات کا ارتکاب کرنے سے ڈریں اور ان کے دلوں میں نصیحت اور خوف خدا پیدا ہو۔

شان نزول: (آیت) "۔ولاتعجل بالقران"۔(الخ)

ابن ابی حاتمؒ نے سدیؒ سے روایت کیا ہے کہ جبرائیل امین (علیہ السلام) رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جب قرآن کریم لے کر آتے تو آپ اس کے یاد کرنے کی فکر میں اپنے آپ کو مشقت میں ڈال دیتے یہاں تک کہ آپ کو اس سے تکلیف ہونے لگتی، محض اس خوف کی بنا پر کہ کہیں جبرائیل امین (علیہ السلام) میرے یاد کرنے سے قبل تشریف نہ لے جائیں گے، اس پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی یعنی آپ قرآن کریم پڑھنے کے قبل اس کے کہ آپ پر اس کی وحی پوری نازل ہو چکے جلدی نہ کیا کیجیے، امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے بارے میں سورہ نساء میں دوسرا شان نزول بھی گزر چکا ہے مگر یہ زیادہ صحیح ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نزول وحی کی وجہ سے شدت محسوس فرمایا کرتے تھے اور آپ اسے جلد جلد پڑھنے کے لیے (زبان اور) ہونٹوں کو حرکت دیتے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا: (لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝16 اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝17 فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝18 ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ)[

القیامۃ: ۱۶ تا ۱۹] "تو اس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دے، تاکہ اسے جلدی حاصل کر لے۔ بلاشبہ اس کو جمع کرنا اور (آپ کا) اس کو پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔ تو جب ہم اسے پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کی پیروی کر۔ پھر بلاشبہ اسے واضح کرنا ہمارے ذمے ہے۔"[1]

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا: یہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کو نصیحت کی ہے کہ آپ اپنے رب سے علم میں اضافے کی دعا کرتے رہیں ارشاد فرمایا: (قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ)[الزمر:۹] "کہہ دے کیا برابر ہیں وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے؟ نصیحت تو بس عقلوں والے ہی قبول کرتے ہیں۔" اور فرمایا: (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ)[المجادلۃ:۱۱] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کھل جاؤ تو کھل جاؤ، اللہ تمہارے لیے فراخی کر دے گا اور جب کہا جائے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو جاؤ، اللہ ان لوگوں کو درجوں میں بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنھیں علم دیا گیا اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، پوری طرح باخبر ہے۔"

سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت اور علم مجھے دے کر بھیجا ہے، اس کی مثال زوردار بارش کی سی ہے جو زمین پر برسی، تو جو زمین عمدہ تھی اس نے پانی جذب کر لیا اور گھاس اور سبزی خوب اگائی اور جو زمین سخت تھی اس نے پانی جذب تو

---

[1] [بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی۔۔الخ:۵۔ مسلم، کتاب الصلوۃ، باب الاستماع للقراءۃ:۱۴۸/۴۴۸]

نہیں کیا لیکن اپنے اوپر روک رکھا، تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس پانی سے فائدہ پہنچایا۔ لوگوں نے وہ پانی پیا، (جانوروں کو) پلایا اور کھیتی کو سیراب کیا اور کچھ زمین صاف اور چٹیل تھی، جب بارش ہوئی تو اس نے نہ تو پانی کو روکا اور نہ اس نے گھاس اگائی۔ بالکل ایسی ہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ کے دین میں سمجھ بوجھ حاصل کی اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مجھے دے کر بھیجا ہے اس کو اس سے فائدہ ہوا، تو اس نے خود سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اور یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے نہ اس کی طرف سر اٹھا کر دیکھا اور نہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت، جس کو دے کر میں بھیجا گیا ہوں، اس کو قبول کیا۔"[1]

﴿ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿١١٥﴾

اور بلاشبہ ہم نے اس سے پہلے آدم (علیہ السلام) سے عہد لیا تھا مگر وہ اسے بھول گئے اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو جنت میں داخل کرتے وقت عہد لیا تھا کہ اے آدم (علیہ السلام)! تو اور تیری بیوی جنت میں قیام کرو۔ تمہیں اس بات کی کھلی اجازت ہے جہاں سے چاہو اور جو چاہو کھاؤ اور پیو۔ لیکن جس درخت کی نشاندہی کی گئی ہے اس کے قریب نہیں جانا۔ اگر تم اس درخت کے قریب جاؤ گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔ (البقرۃ: ۳۵) لیکن آدم (علیہ السلام) اس عہد کو بھول گئے اور اس پر استقامت نہ دکھا سکے۔ حضرت آدم (علیہ السلام) کا واقعہ موقع کی مناسبت سے قرآن مجید

---

[1]۔ [بخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلّم: ۷۹]

کے کئی مقامات پر بیان ہوا ہے۔لیکن قرآن مجید کا حسن اسلوب ہے کہ کہیں بھی الفاظ اور انداز کا تکرار نہیں پایا جاتا۔ جہاں بھی یہ واقعہ بیان ہوا ہے اس کے الفاظ، انداز میں نمایاں فرق ہونے کے ساتھ ساتھ استدلال کی نئی شکل میں انسان کو رہنمائی کے لیے ایک الگ سبق دیا گیا ہے۔جس کی اس موقع پر واضح مثال یہ ہے کہ قرآن مجید کے کسی دوسرے مقام پر حضرت آدم (علیہ السلام) کے بارے میں یہ بیان نہیں ہوا کہ آدم (علیہ السلام) نے درخت کے قریب جانے کی غلطی عزم بالجزم کے ساتھ کی تھی۔ صرف یہاں قرآن مجید نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ آدم (علیہ السلام) نے یہ خطا بھول کر کی تھی اور وہ اپنے کیے ہوئے عہد پر عزم دکھلانے میں ناکام رہے۔کیونکہ آدم (علیہ السلام) بھول گئے ان کی اولاد بھی بھول جائے گی۔[1]

﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ ﴾

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ" آدم کے آگے سجدہ کرو،تو سب سجدے میں گر پڑے مگر ابلیس نے اس نے انکار کر دیا۔(۱۶) پھر ہم نے

۱۔[رواہ الترمذی: کتاب تفسیر القران، باب ومن سورہ المعوذتین]

فرمایا: اے آدم! بیشک یہ (شیطان) تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے، تو یہ تم دونوں کو کہیں بہشت سے نکلوا نہ دے، پھر تم مشقت پڑ جاؤ۔ (۱۷) یقیناً یہاں تمہارے لیے یہ (سہولت) ہے کہ نہ بھوکے رہو اور نہ ننگے۔ (۱۸) اور یہ کہ تم یہاں نہ پیاسے رہو گے اور نہ دھوپ تمہیں لگے گی۔ (۱۹)

اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے آدم (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ ابلیس سے بچو، کہیں وہ کوشش کر کے تمہیں جنت سے نہ نکلوا دے، ورنہ تم طلب رزق کے لیے محنت و مشقت میں پڑ جاؤ گے، گویا آدم کا قصہ بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کا مقصد یہی ہے کہ انسان شیطان سے دھوکا نہ کھائے، جس طرح انسانوں کے باپ آدم (علیہ السلام) اور ان کی زوجہ محترمہ نے دھوکا کھایا تھا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ) [الاعراف: ۲۷] "اے آدم کی اولاد! کہیں شیطان تمہیں فتنے میں نہ ڈال دے، جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا، وہ دونوں سے ان کے لباس اتارتا تھا، تاکہ دونوں کو ان کی شرمگاہیں دکھائے، بیشک وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھتے۔ بیشک ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کے دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔"

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اگر حوا نہ ہوتیں تو کوئی

عورت اپنے شوہر کے خلاف شیطان کے کہنے میں نہ آتی۔"[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسا نہ ہو کہ یہ آپ کو جنت سے نکلوا دے تو آپ مشقت میں پڑ جائیں گے۔

شمقت سے مراد ہے تلاش معاش اور روزی کی طلب میں جدو جہد اور محنت اور مشقت کرنا جس کے نتیجہ میں انسان تھکاوٹ میں مبتلا ہوتا ہے، اور یہ محنت اور مشقت صرف مرد کرتا ہے عورتیں نہیں کرتیں اس لیے اس آیت میں صرف حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا ہے ورنہ آپ مشقت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ امام ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ کھیتی باڑی کرنے، ہل چلانے اور دیگر اسباب معیشت سے جو مشقت اور تھکاوٹ حاصل ہوتی ہے اس سے وہ مراد ہے، سعید بن جبیرؒ نے بیان کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ایک سرخ بیل کے ساتھ ہل چلاتے تھے اور اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے تھے اور یہ ان کی مشقت تھی۔

﴿ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۛ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ ﴾

پھر شیطان نے آدم (علیہ السلام) کے دل میں وسوسہ ڈالا، کہا کہ اے آدم (علیہ

---

[1]۔ [بخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب خلق آدم وذریتہ: ۳۳۳۰]

اسلام)! کیا میں تمھیں دائمی زندگی کے درخت کا پتہ بتاؤں اور ایسی بادشاہی کا جس کو کبھی زوال نہ ہو۔(۱۲۰) پھر ان دونوں نے اس درخت میں سے کھا لیا تو ان دونوں کے ستر کھل گئے اور وہ دونوں اپنے آپ کو جنت کے پتوں سے ڈھانپنے لگے۔ اور آدم (علیہ السلام) نے (بہ ظاہر) اپنے رب کی نافرمانی کی تو وہ لغزش میں مبتلا ہو گئے۔(۱۲۱) پھر ان کے رب نے انھیں چن لیا، تو ان کی توبہ قبول فرمائی اور سیدھی راہ بتائی۔(۱۲۲)

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ : سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی خراب نہ ہوتا اور اگر حوا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے خاوند کی خیانت نہ کرتی۔"[1]

وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى: سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "سیدنا آدم (علیہ السلام) اور سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) کی ملاقات ہوئی تو سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا، آپ نے لوگوں کو مشقت میں ڈال دیا اور انھیں جنت سے نکلوا دیا؟ سیدنا آدم (علیہ السلام) نے فرمایا، آپ وہی ہیں جنھیں اللہ نے اپنی رسالت سے ممتاز فرمایا اور اپنے لیے پسند فرمایا اور تورات عطا فرمائی؟ سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا، ہاں! پھر سیدنا آدم (علیہ السلام) نے فرمایا، کیا اس میں آپ نے یہ نہیں پڑھا کہ میری پیدائش سے پہلے یہ سب میرے لیے لکھ دیا گیا تھا؟ کہا، ہاں!

---

[1]۔ [بخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب خلق آدم وذریتہ: ۳۳۳۰]

الغرض سیدنا آدم (علیہ السلام) سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) پر دلیل میں غلبہ پا گئے۔"[1]

انبیاء (علیہم السلام) صغیرہ وکبیرہ گناہ نہیں کرتے

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبیؒ متوفی 668ھ لکھتے ہیں:

اس میں علماء کا اتفاق ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہیں کرتے، اور اس میں ان کا اختلاف ہے کہ آیا وہ گناہ صغیرہ کرتے ہیں جن سے ان کا مواخذہ ہوتا ہے اور ان پر اعتاب ہوتا ہے یا نہیں، اسی طرح اس پر بھی علماء کا اتفاق ہے وہ ایسے ذلیل کام نہیں کرتے جس سے ان کی ذات پر نقص یا عیب لگے یا جس کی وجہ سے ان کی مذمت کی جائے اور لوگ ان سے متنفر ہوں، ہمارے نزدیک اس کی دلیل معجزہ ہے اور معتزلہ کے نزدیک اس کی دلیل عقل ہے۔ امام طبری اور دیگر فقہاء متکلمین اور محدثین نے کہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے صغائر واقع ہوتے ہیں اس میں رافضیوں کا اختلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ انبیاء (علیہم السلام) تمام گناہوں سے معصوم ہیں۔

امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، ان کے اصحاب اور جمہور فقہاء اور محدثین کا یہ مذہب ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) جس طرح کبائر سے معصوم ہوتے ہیں اسی طرح صغائر سے بھی معصوم ہوتے ہیں، کیونکہ ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم انکے افعال، ان کے آثار اور ان کی سیرتوں کی اتباع کریں اور یہ حکم مطلق دیا گیا ہے اس میں کوئی استثناء نہیں ہے اور نہ کسی قرینہ کے التزام کا ذکر ہے، اگر ہم انبیاء (علیہم السلام) سے صغائر کے وقوع کو جائز قرار دیں تو ان کی اقتداء کرنا ممکن نہیں ہوگی، کیونکہ ان کے افعال میں سے ہر فعل اس سے متمیز نہیں ہے کہ وہ عبادت ہے یا اباحت ہے یا ممنوع ہے یا معصیت ہے، اور نہ کسی شخص کو

---

[1] [بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ: (واصطنعتک لنفسی): ٤٧٣٦۔ مسلم، کتاب القدر، باب حجاج آدم وموسی صلی اللہ علیہما وسلم: ٢٦٥٢]

یہ حکم دینا صحیح ہوگا کہ وہ ان کے کسی حکم پر عمل کرے کیونکہ ہوسکتا ہے ان کا وہ حکم معصیت ہو۔

قاضی ابواسحاق اسفرائنی نے کہا کہ صغائر کے ارتکاب میں اختلاف ہے اور اکثر کا مختار یہ ہے کہ ان سے صغائر کا صدور جائز نہیں ہے اور بعض نے جائز کہا ہے اور اس قول کی کوئی اصل نہیں ہے۔

بعض متاخرین نے پہلے قول کو اختیار کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بعض گناہوں کے وقوع کی خبر دی ہے اور ان کو انبیاء (علیہم السلام) کی طرف منسوب کیا ہے اور ان کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام پر عتاب کیا ہے اور خود انبیاء علیہم نے بھی ان گناہوں کے وقوع کی خبر دی اور ان سے ڈرے اور ان پر توبہ کی اور یہ تمام امور بہت جگہ وارد ہیں اور یہ مجموعی طور پر تاویل کو قبول نہیں کرتے اگرچہ فرداً فرداً تاویل کو قبول کرتے ہیں اور ان تمام امور سے ان کے مناصب میں کمی نہیں ہوتی اور یہ کام ان سے شاذ اور نادر طور پر خطا اور نسیان سے واقع ہوئے ہیں یا انہوں نے یہ کام کسی تاویل سے کئے ہیں کیونکہ کبھی وزیر سے اس کام پر گرفت کی جاتی ہے جس کام پر سائیس کو انعام دیا جاتا ہے، اس وجہ سے وہ میدان حشر میں امن امان اور سلامتی ملنے کے باوجود ان کاموں کے ارتکاب سے ڈرتے رہیں گے اور یہ قول حق ہے اور جنید نے کیا خوب کہا ہے کہ ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کے نزدیک گناہ ہوتی ہیں اور ہر چند کہ بعض نصوص ان سے گناہوں کے وقوع پر شاہد ہیں لیکن اس سے ان کے مناصب پر طعن نہیں ہوگا اور نہ ان کے مراتب میں کوئی کمی ہوگی بلکہ انہوں نے ان گناہوں کی تلافی کر لی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بزرگی دی اور ان کو ہدایت دی اور ان کی مدذح کی اور ان کا تزکیہ کیا اور ان کو پسند کیا اور ان کو فضیلت دی۔ صلوت اللہ علیہم وسلامہ [1]

ا۔ (الجامع لاحکام القرآن جز اص 291-292 مطبوعہ دالفکر بیروت 1415ھ)

اور علامہ قرطبی و عصی ادم ربہ غفوی کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

فغویٰ کا معنی ہے ان کی زندگی کا عیش و آرام جاتا رہا اور ان کی زندی خراب ہوگئی، غوی کا ایک معنی ضلالت اور گمرایہ ہوتا ہے اور دوسرا معنی فساد ہے اور یہاں پر یہی معنی مراد ہے، نقاش، قشیری اور استاذ ابوجعفر نے بھی یہی مراد لیا۔ یعنی جب وہ جنت سے ابہر آ گئے تو جنت کے عیش و آرام کے بجائے ان کو محنت اور مشقت کی زندگی گزارنی پڑی اور وہ مشقت میں پڑ گئے۔ [1]

عصی ادم ربہ فغوی کے متعلق علامہ آلوسی کی تفسیر

علامہ سید محمود آلوسیؒ متوفی 1270ھ لکھتے ہیں:

حضرت آدم علیہ السلام نے اس درخت سے کھانے کی ممانعت میں اپنے رب کی معصیت کی اور ان کا جو مطلوب تھا کہ ان کو دائمی زندگی اور لازوال سلطنت حاصل ہو اس سے بھٹک گئے یعنی اس کو نہ پاس سکے۔ یہ اس صورت میں ہے جب غوی کا معنی ضلالت کیا جائے اور غوی کا معنی فسا بھی ہے یعنی انکی زندگی میں جنت سے آنے کے بعد محنت، مشقت اور تھکاوٹ ہوگئی عیش و آرام جاتا رہا اور وہ مشقت میں پڑے گئے۔

علامہ تفتازانی نے شرح المقاصد میں ذکر کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جو یہ کام صادر ہوا یہ نبوت سے پہلے تھا اور اس کا صدور سہو یا تاویل سے ہوا، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان پر گرفت فرمائی کیونکہ ان کا مقام بہت بلند تھا اور ان پر اللہ تعالیٰ کا بہت فضل اور حسان تھا اور ان جیسے شخص کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہر وقت یاد رکھنا چاہیے تھا تا کہ سہو اور نسیان کی نبوت نہ آتی اور مشہور ہے کہ نیک لوگوں کی نیکیاں بھی مقربین

1۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۱ ص 168، مطبوعہ دار الفکر بیروت 1415ھ)

کے نزدیک گناہ ہوتی ہیں۔ [1]

﴿ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا
يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا
يَشْقٰى ﴿١٢٣﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا
وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿١٢٤﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى
وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿١٢٥﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ
وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿١٢٦﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ
يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿١٢٧﴾ ﴾

فرمایا کہ تم دونوں اکٹھے یہاں سے اتر جاؤ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہوں گے پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ شقی (بدبخت) ہوگا۔ (۲۳) اور جو شخص میرے ذکر سے منہ موڑے گا اس کے لیے اس دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت

---

[1] ۔ (روح المعانی جز ۱۶ ص 401-402 مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1417ھ)

کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔(۲۴) وہ کہے گا اے میرے رب تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا میں تو آنکھ والا تھا۔(۲۵) اللہ فرمائے گا ایسا ہی (ہوا کہ دنیا میں) تیرے پاس میری آیتیں آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا اسی طرح آج ہم تم کو بھلا دیں گے۔(۲۶) اور اسی طرح ہم بدلہ دیں گے ہر اس شخص کو جس نے حد سے تجاوز کیا اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہ لایا، اور بیشک آخرت کا عذاب بڑا سخت اور بہت دیر پا رہنے والا ہے۔(۲۷)

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ " اهْبِطَا" سے مراد ابلیس و آدم ہیں اور حوا اپنے شوہر آدم کے تابع ہیں، جبکہ بعض دوسروں کا خیال ہے کہ اس سے مراد آدم و حوا (علیہ السلام) ہیں، اس لیے کہ باقی انسان ان دونوں سے وجود میں آئے ہیں۔ اس کے بعد جمع کے صیغہ سے وہ دونوں اور ان کی اولاد بھی مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا (علیہ السلام) سے کہا کہ تم لوگ جنت سے نکل کر زمین پر چلے جاؤ، جہاں تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ وہاں جب تمہارے پاس میرا کوئی رسول آئے اور میرا پیغام پہنچائے، تو جو شخص میرے بھیجے گئے دین کی پیروی کرے گا، نہ وہ دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ آخرت میں بد بخت ہوگا۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا: سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "بہترین دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے، وہ جمعہ کا دن ہے، آدم (علیہ السلام) کو جمعہ کے

دن ہی پیدا کیا گیا اور اسی دن انھیں جنت میں داخل کیا گیا اور اسی دن انھیں جنت سے نکالا گیا۔"[1]

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌ: یعنی آدم اولاد آدم اور ابلیس اور اس کی ذریت کی ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی ہوگی، لیکن جنت میں مومنوں کے دلوں کو اللہ تعالیٰ کینہ اور بغض وعناد وغیرہ جیسی بیماریوں سے پاک صاف کردیں۔ سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "پہلا گروہ جو جنت میں جائے گا ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن اور نورانی ہونگے، وہ نہ اس میں تھوکیں گے نہ انھیں ناک سے کوئی آلائش آئے گی اور نہ وہ پیشاب و پاخانہ کریں گے، ان کے برتن سونے کے ہونگے، ان کی کنگھیاں سونے اور چاندی کی ہوں گی اور ان کی انگیٹھیوں کا ایندھن عود کا ہوگا اور ان کے پسینے میں سے مشک کی خوشبو پھوٹے گی۔ ان میں سے ہر ایک کی دو بیویاں ہوں گی، جن کا حسن کی وجہ سے پنڈلیوں کا گودا گوشت کے نیچے سے نظر آئے گا۔ جنتیوں کا آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا اور نہ بغض وعناد، ان کے دل ایک دل کی مانند ہوں گے اور وہ صبح وشام اللہ کی تسبیح پڑھا کریں گے۔"[2]

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى: ارشاد فرمایا: (قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ) [البقرۃ:۳۸] "ہم نے کہا سب کے سب اس سے اتر جاؤ، پھر اگر کبھی تمہارے پاس میری طرف سے واقعی کوئی ہدایت آجائے تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا سو ان پر نہ کوئی خوف

---

[1]۔[مسلم، کتاب الجمعۃ، باب فضل یوم الجمعۃ: ۸۵٤]

[2]۔[بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی صفۃ الجنۃ وأنھا مخلوقۃ: ۳۲٤٥۔ مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ اھلھا، باب فی صفات الجنۃ وأھلھا: ۲۸۳٤/۱۷]

ہے اور نہ وہ غم گین ہونگے۔" اور فرمایا: (یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ یَقُصُّوۡنَ عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ)[الاعراف:۳۵]" اے آدم کی اولاد! اگر کبھی تمہارے پاس واقعی تم میں سے کچھ رسول آئیں، جو تمہارے سامنے میری آیات بیان کریں تو جو شخص ڈر گیا اور اس نے اصلاح کر لی تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غم کھائیں گے۔"

حافظ سیوطیؒ متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

امام ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے "معیشۃ ضنکا" کی تفسیر میں روایت کیا ہے ہر وہ مال جو میں اپنے بندوں میں سے کسی بندہ کو دیتا ہوں خواہ وہ کم ہو یا زیادہ وہ اس میں میری اطاعت نہ کرے تو اس میں کوئی خیر نہیں اور وہی معیشت میں ضنک (تنگی) ہے۔

امام ابن ابی حاتم نے عکرمہؒ سے "معیشۃ ضنکا" کی تفسیر میں روایت کیا ہے جب اللہ کسی بندہ کو رزق میں وسعت دے اور وہ اپنی معیشت کو حرام کر لیتا ہے تو اللہ اس کے لیے دوزخ کی آگ میں تنی کر دیتا ہے۔

امام ابن جریر نے روایت کیا ہے یہ وہ معیشت ہے جس میں حرام کی وسعت ہو۔

امام ابن ابی حاتم نے مالک بن دینار سے "معیشۃ ضنکا" کی تفسیر میں روایت کیا، اللہ اس کا رزق حرام میں کر دیتا ہے اور اس کو تا دم مرگ حرام کھلاتا ہے حتیٰ کہ وہ مر جاتا ہے پھر اس کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔

امام عبد بن حمید اور امام ابن ابی حاتم نے "معیشۃ ضنکا" کی تفسیر میں روایت کیا ہے اس سے مراد برے عمل اور رزق خبیث ہے۔ [1]

۱۔ الدر المنثور ج ۵ ص ۶۰۹، (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷ ص ۲۴۴۰)

امام ابن جریرؒ نے ابو حازمؒ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے یہ وہ معیشت ہے جس میں معصیت کا رزق ہو۔ (۱)

امام ابن جریرؒ نے ضحاکؒ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے اس سے مراد کسب خبیث ہے ایک اور سند سے روایت کیا ہے اس سے مراد عمل خبیث اور برا رزق ہے۔ (۲)

جس شخص کو قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھایا جائے گا وہ اپنے رب کے حضور التجا کی صورت میں سوال کرے گا کہ میرے رب مجھے آج اندھا کر کے کیوں اٹھایا گیا ہے۔ جبکہ دنیا میں میں سب کچھ دیکھا کرتا تھا۔ رب ذوالجلال کی طرف سے اسے جواب دیا جائے گا کہ یہ سزا تجھے اس لیے دی گئی ہے کیونکہ تو نے ہماری آیات کو بھلا دیا تھا۔ اس لیے آج تمہیں بھی بھلا دیا گیا ہے۔ یہ اس شخص کی سزا ہے جس نے حدود سے تجاوز کیا اور اپنے رب کے احکام کو ماننے سے انکار کر دیا۔ آخرت کا عذاب بہت سخت اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔

پہلی آیت میں اس شخص کی سزا دنیا کی تنگی کے حوالے سے بیان ہوئی۔ اس کے مقابلے میں یہاں فرمایا کہ دنیا کے مقابلے میں آخرت کی تنگی اذیت ناک عذاب کی صورت میں ہوگی جو ہمیشہ رہنے والا ہوگا۔ دوسرا اس کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے یہ بتلایا جائے گا کہ تو اندھا ہونے پر پریشانی کا اظہار کر رہا ہے۔ یہ تو تیری پریشانی کی ابتداء ہے۔ اس کے بعد جو تجھے سزا ملنے والی ہے وہ بڑی ہی سخت اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ سے جب فریاد کریں گے تو انھیں یہ کہہ کر ٹھکرا دیا جائے گا کہ آج تمہیں اس طرح ہی فراموش کیا جاتا ہے۔ جس طرح تم نے دنیا میں اپنے رب اور اس کے احکام کو

---

۱ (جامع البیان رقم الحدیث: 18416)

۲۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 18417)

فراموش کیا تھا۔

كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى: یعنی جب تو نے اللہ تعالیٰ کی آیات سے منہ پھیر لیا، انھیں یاد نہ رکھا بلکہ انھیں بھلا دیا، ان سے اعراض کیا اور ان سے غفلت برتی تو آج تجھ سے بھی اسی طرح معاملہ کیا جائے گا کہ گویا تجھے بھلا دیا جائے گا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: (فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا)[الاعراف:۵۱] "تو آج ہم انھیں بھلا دیں گے، جیسے وہ اپنے اس دن کی ملاقات کو بھول گئے۔" سیدنا ابو ہریرہؓ راوی ہیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مومن کو قبر میں رکھے جانے اور پھر اس سے ہونے والے سوال و جواب کا ذکر کیا اور پھر کافر سے ہونے والے سوال و جواب کا بھی ذکر کیا اور فرمایا: "پھر کافر پر اس کی قبر تنگ ہو جائے گی یہاں تک کہ اس کی پسلیاں آر پار ہو جائیں گی اور یہی وہ "المعیشۃ الضنکۃ" یعنی تنگ گزران ہے، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے: (فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى) "تو بیشک اس کے لیے تنگ گزران ہے اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے۔"[1]

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى: دنیا کے عذاب کی نسبت آخرت کا عذاب زیادہ دردناک بھی ہوگا اور ہمیشہ باقی رہنے والا بھی اور یہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ مبتلا رہیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (لعان کرنے والے جوڑے کو آخرت کے عذاب سے ڈراتے ہوئے) فرمایا: "دنیا کی سزا آخرت کے عذابوں کے مقابلے میں بہت ہی ہلکی اور ناچیز ہے۔"[2]

---

[1] [ابن حبان:۳۱۱۳۔ مستدرک حاکم:۱/۳۷۹، ۳۸۰، ح:۱۴۰۳]

[2] [مسلم، کتاب اللعان:۱۴۹۳۔ أبوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی اللعان:۲۲۵۶]

﴿ اَفَلَمۡ یَهۡدِ لَهُمۡ كَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ یَمۡشُوۡنَ
فِیۡ مَسٰكِنِهِمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ﴿۱۲۸﴾ وَلَوۡلَا كَلِمَةٌ
سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّی ﴿۱۲۹﴾ فَاصۡبِرۡ عَلٰی
مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ
غُرُوۡبِهَا ۚ وَمِنۡ اٰنَآئِ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡ وَاَطۡرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ
تَرۡضٰی ﴿۱۳۰﴾ ﴾

کیا یہ بات ان لوگوں کے لیے ہدایت کا موجب نہ ہوئی کہ ہم ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں، جن کے رہنے کے مقامات پر یہ چلتے پھرتے ہیں؟ بلاشبہ اس میں عقل والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔(۱۲۸) اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی اور ایک وقت معین مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان پر ضرور عذاب نازل ہو جاتا۔(۱۲۹) پس (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ صبر کریں ان باتوں پر جو یہ کہتے ہیں۔ اور آپ تسبیح بیان کریں اپنے رب کی تعریف کے ساتھ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے، اور سورج کے غروب

ہونے سے پہلے، اور رات کی بعض گھڑیوں میں تسبیح بیان کریں، اور دن کے اطراف میں بھی، تاکہ آپ راضی ہو جائیں۔ (۱۳۰)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ کیا اہل مکہ کو ان کی خبر معلوم نہیں ہوئی جو ان سے صدیوں پہلے اپنے گھروں میں رہتے تھے، یعنی جب اہل مکہ تجارت کرنے اور اپنی روزی طلب کرنے کے لیے سفر پر نکلتے ہیں اور پچھلی امتوں کے شہروں کے کھنڈرات دیکھتے ہیں اور ان بستیوں کو دیکھتے ہیں جو اپنی بنیادوں پر گری پڑی ہیں تو کیا ان کو یہ خوف لاحق نہیں ہوتا کہ اگر وہ اسی طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب کرتے رہے تو ان پر بھی وہ عذاب آ سکتا ہے جو پچھلی امتوں پر آ چکا ہے۔

عذاب میں تاخیر کا سبب

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب قریش کو اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دیتے تو ان کی معاندانہ مخالفت پر تنبیہ کرتے ہوئے انھیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بھی ڈراتے، تو وہ بجائے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے کے نہایت ڈھٹائی سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا منہ چڑاتے اور بار بار مطالبہ کرتے کہ وہ عذاب کہاں رک گیا ہے، وہ آ کیوں نہیں پاتا۔ معلوم ہوتا ہے یہ محض ایک ڈراوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس آیت کریمہ میں ان کی اس مہمل بات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک قانون ہے جو پہلے سے طے ہو چکا ہے کہ جب بھی کوئی رسول کسی قوم کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا جاتا ہے تو اس قوم کو ایمان لانے اور ہدایت قبول کرنے کے لیے ایک مہلت دی جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ جیسے ہی کوئی انکار کرے تو سزا میں دھر لیا جائے بلکہ انھیں زیادہ سے زیادہ موقع دیا

جاتا ہے تا کہ وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں اور اچھی طرح اپنے انجام پر غور کرلیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو یہاں کلمہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ ان پر عذاب کب آئے گا اور یہ مہلت کب ختم ہوگی، اس کے لیے ایک اجل اور مدت معین کردی جاتی ہے۔ جب وہ معین مدت آ پہنچتی ہے تو پھر عذاب کے آنے میں تقدیم وتاخیر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کے اسی قانون اور فیصلے کے تحت اہل مکہ اور دوسرے عرب بھی جن تک یہ دعوت پہنچ چکی ہے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچے ہوئے ہیں اور اگر یہ فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو ان کے رویئے اور کرتوتوں کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان پر اب تک عذاب نازل ہو چکا ہوتا۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دی جارہی ہے کہ یہ کفار مکہ جو آپ کو جادوگر، شاعر، کاہن اور کذاب وغیرہ کہا کرتے ہیں تو آپ ان باتوں کا خیال نہ کیجیے، ان کو عذاب دیے جانے کا جو وقت مقرر ہے اس وقت انھیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔ آپ صبر وسکون کے ساتھ اپنے رب کی حمد وثنا میں لگے رہیے۔ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اپنے رب کی تعریف بیان کرنے کے لیے تسبیح پڑھیے، یعنی فجر وعصر کی نمازوں کا خوب اہتمام کیجیے اور رات کے اوقات میں بھی اپنے رب کی خوب پاکی بیان کیجیے، یعنی مغرب وعشاء کی نمازوں کا بھی خیال رکھیے اور ہاں دیکھیے! دن کے دونوں کناروں میں اپنے رب کی پاکی بیان کرنے کا زیادہ خیال رکھیے۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ آپ اس پر عمل کیجیے، تو آپ کو اپنے رب کی جانب سے ایسا اجر ملے گا کہ آپ خوش ہوجائیں گے۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا: سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جو شخص صبح وشام "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ" سو مرتبہ پڑھے، تو قیامت کے دن اس سے افضل عمل لے کے آنے والا کوئی شخص نہیں

ہوگا، سوائے اس شخص کے جس نے اس کی مثل یا اس سے زیادہ مرتبہ یہ کلمات کہے۔"[1]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، مجھے گزشتہ رات بچھو کے کاٹنے سے شدید تکلیف پہنچی۔ آپ نے فرمایا: "اگر تو شام کے وقت یہ دعا پڑھ لیتا: (اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ) تو بچھو تجھے نقصان نہ پہنچاتا۔"[2]

سیدنا عثمان بن عفانؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جو بندہ ہر روز صبح اور ہر رات شام کو تین مرتبہ یہ دعا پڑھے: (بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ) تو اسے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچائے گی۔"[3]

قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا: اس سے نماز فجر اور نماز عصر بھی مراد ہو سکتی ہیں، جیسا کہ سیدنا جریر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس (بیٹھے ہوئے) تھے کہ اسی اثنا میں آپ نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھا تو فرمایا: "تم (ایک دن) اپنے مالک کو اس طرح دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھتے ہو، اس کو دیکھنے میں تم کو کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی، پھر اگر تم سے یہ ہو سکے کہ سورج نکلنے سے پہلے جو نماز ہے (یعنی فجر کی) اور سورج ڈوبنے سے پہلے جو نماز ہے (یعنی عصر کی) ان کو چھوڑ کر (کسی اور کام میں) نہ پھنس جاؤ تو (ضرور) ایسا کرو۔" پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: (وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا) "اور سورج طلوع

۱۔ [مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل التھلیل والتسبیح والدعاء: ۲۶۹۲]

۲۔ [مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فی التعوذ من سوء القضاء ودرک الشقاء وغیرہ: ۲۷۰۹]

۳۔ [ترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی الدعاء إذا أصبح وإذا أمسی: ۳۳۸۸۔ أبوداؤد، کتاب الأدب، باب مایقول إذا أصبح: ۵۰۸۸]

ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر۔"[1]

سیدنا عمارہ بن رویبہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ان دونوں وقتوں کی نماز (فجر وعصر) پڑھنے والا آگ میں نہیں جائے گا۔"[2]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "رات اور دن کے فرشتے یکے بعد دیگرے تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں، فجر اور عصر کی نماز میں یہ فرشتے اکٹھے ہوجاتے ہیں، پھر جو فرشتے رات کو تمہارے ساتھ رہے تھے وہ اوپر (آسمان پر) چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے، حالانکہ وہ ان سے زیادہ واقف ہوتا ہے، تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ وہ کہتے ہیں، ہم نے ان کو نماز پڑھتے ہوئے چھوڑا اور جب ہم ان کے پاس گئے تھے اس وقت بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔"[3]

وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى: ارشاد فرمایا: (وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ) [ھود: ۱۱٤] "اور دن کے دونوں کناروں میں نماز قائم کر اور رات کی کچھ گھڑیوں میں بھی، بیشک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔ یہ یاد کرنے والوں کے لیے یاددہانی ہے۔"

لَعَلَّكَ تَرْضٰى: سیدنا ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اے جنتیو! تو وہ کہیں گے، اے ہمارے رب! ہم بار بار تیری خدمت میں حاضر

۱۔ [بخاری، کتاب مواقیت الصلوۃ، باب فضل صلوٰۃ العصر: ٥٥٤۔ مسلم، کتاب المساجد، باب فضل صلاتی الصبح والعصر: ٦٣٣]

{8910 ??} [مسلم، کتاب المساجد، باب فضل صلاتی الصبح والعصر: ٦٣٤۔ أبوداؤد، کتاب الصلوۃ، باب الحافظۃ علی الصلوات: ٤٢٧]

۳۔ [بخاری، کتاب مواقیت الصلوۃ، باب فضل صلوۃ العصر: ٥٥٥۔ مسلم، کتاب المساجد، باب فضل صلوتی الصبح والعصر: ٦٣٢]

ہیں اور ساری خیر تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کیا تم خوش ہو گئے؟ وہ کہیں گے، اے اللہ! ہم کیوں خوش نہیں ہونگے، حالانکہ تو نے ہمیں وہ نعمتیں عطا کر رکھی ہیں جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیں۔ اللہ فرمائے گا، کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز نہ عطا کروں؟ وہ کہیں گے، اے ہمارے رب! ان نعمتوں سے بہتر کیا ہوسکتا ہے؟ اللہ فرمائے گا، میں تمہیں اپنی رضا مندی دیتا ہوں کہ اب کسی وقت بھی میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔"[1]

سیدنا صہیبؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جب جنتی جنت میں چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا، کیا تم کچھ مزید چاہتے ہو کہ میں تمہیں دوں؟ وہ کہیں گے (اے اللہ!) کیا تو نے ہمارے چہروں کو روشن نہیں کیا، تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا اور جہنم سے نجات نہیں دی؟ (تو اب ہمیں اور کیا چاہیے؟) تو اس وقت اللہ تعالیٰ حجاب اٹھائے گا تو انھیں کوئی ایسی نعمت عطا نہیں ہوئی ہوگی جو انھیں اپنے رب عزوجل کے دیدار سے زیادہ محبوب ہو۔"[2]

﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿١٣١﴾ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا ۖ

---

[1]۔ [بخاری، کتاب التوحید، باب کلام الرب مع أہل الجنۃ: ۷۵۱۸۔ مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا، باب إحلال الرضوان علی أہل الجنۃ: ۲۸۲۹]

[2]۔ [مسلم، کتاب الإیمان، باب إثبات رؤیۃ المومنین فی الآخرۃ ربہم سبحانہ وتعالیٰ: ۱۸۱۔ ترمذی، کتاب صفۃ الجنۃ، باب ما جاء فی رؤیۃ الرب: ۲۵۵۲]

نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ
مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾

اور آپ ان چیزوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیے جو ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیوی زندگی کی زینت کے لیے دے رکھی ہیں تا کہ ان چیزوں کے ذریعہ ہم انھیں آزمائش میں ڈالیں اور آپ کے رب کا دیا ہوا رزق ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔(۱۳۱) اور آپ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیں اور خود بھی اس پر قائم رہیں، ہم آپ سے روزی طلب نہیں کرتے (بلکہ) ہم خود آپ کو روزی دیتے ہیں اور اچھا انجام اہل تقویٰ کا ہے۔(۱۳۲) اور کفار کہتے ہیں کہ یہ اپنے رب کے پاس سے ہمارے لیے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتے، کیا ان کے پاس پہلے صحیفوں میں واضح دلیل نہیں آ چکی؟۔(۱۳۳)

شان نزول: (آیت) "ولاتمدن عینیک"۔(الخ)

ابن شیبہؒ، ابن مردویہؒ، بزازؒ اور ابو یعلیؒ نے حضرت ابو رافعؓ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاں ایک مہمان آئے، آپ نے مجھے ایک یہودی کے پاس بھیجا کہ رجب کے چاند تک کچھ آٹا قرض لے آؤ اس نے انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ کوئی چیز رہن رکھ دو میں وہاں

سے آپ کی خدمت میں آیا اور آپ کو صورت حال بتائی، آپ نے فرمایا اللہ کی قسم میں آسمان والوں میں بھی امین ہوں اور زمین میں بھی امین ہوں، ابو رافعؓ بیان کرتے ہیں کہ میں آپ کے پاس سے نہیں آیا تا آنکہ فوراً آپ پر یہ آیت کریمہ نازل ہوگئی، یعنی اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیے جن کو ہم نے کفار کی مختلف جماعتوں کو ان کی آزمائش کے لیے دے کر رکھا۔

ہر مسلمان کو قرآن مجید کی عظیم نعمت پر فخر کرنا چاہیے اور نافرمانوں کی ظاہری زیب وزینت کی طرف رغبت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ شان وشوکت اس لیے دی ہے تا کہ ان کی آزمائش کرے۔ نیز یہ چند روزہ بہار ہے اس کے بعد ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور مسلمانوں کو آخرت میں اللہ تعالیٰ جو نعمتیں عطا فرمائے گا وہ سب سے بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے، آپ کے اور چٹائی کے درمیان اور کوئی چیز نہیں تھی (یعنی کوئی گدا یا چادر وغیرہ نہیں تھی) آپ کے سر کے نیچے چمڑے کا ایک تکیہ تھا جس میں کھجور کی کھال بھری ہوئی تھی اور آپ کے پیروں کے پاس درخت کے پتوں کا ایک ڈھیر تھا۔ میں نے نبی کریم کے پہلو میں چٹائی کے نشانات دیکھے تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ نبی کریم نے فرمایا: عمر کیوں روتے ہو؟ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! قیصر وکسری کس قدر عیش وآرام میں ہیں (حالانکہ وہ کافر ہیں) اور آپ تو اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ نبی کریم نے فرمایا: تمہیں یہ پسند نہیں کہ ان کے حصہ میں دنیا ہو اور ہمارے لیے آخرت ہو۔ [1]

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اس

۱۔ (صحیح مسلم: حدیث نمبر ۱۴۷۹، اجماع المسلمین)

شخص نے فلاح پائی جس نے اسلام قبول کیا اور ضرورت کے مطابق رزق دیا گیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اس چیز پر جو اسے عطا فرمائی، قناعت کی توفیق بخشی۔"[1]

سیدنا حکیم بن حزامؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے (کچھ مال) مانگا، آپ نے مجھے دے دیا، میں نے آپ سے پھر مانگا تو آپ نے مجھے پھر دے دیا، میں نے (تیسری بار) پھر مانگا تو پھر عنایت فرما دیا اور ساتھ (نصیحت کرتے ہوئے) فرمایا: "اے حکیم! یہ (دنیا کا) مال شیریں وخوش گوار (نظر آتا) ہے۔ (سنو!) جو شخص اسے بغیر کسی طمع ولالچ کے لے گا اس کے لیے تو اس میں برکت ہوگی اور جو شخص دل میں لالچ رکھ کر اسے لے گا تو اس کے لیے اس میں برکت نہیں ہوگی۔ اس کا حال اس شخص کا سا ہوگا جو کھاتا تو ہے لیکن سیر نہیں ہوتا۔ (یاد رکھو!) اوپر والا ہاتھ (یعنی مال خرچ کرنے والا شخص) نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔"[2]

سیدنا ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منبر پر آ کر تشریف فرما ہوئے اور ہم بھی آپ کے اردگرد بیٹھ گئے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "مجھے اپنے بعد جس چیز کا تم پر ڈر ہے وہ دنیا کی زیب وزینت ہے کہ اس کے دروازے تم پر کھول دیے جائیں گے۔" ایک شخص نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! کیا اچھی چیز سے بھی برائی پیدا ہوتی ہے؟ آپ خاموش ہو گئے۔ لوگوں نے اس شخص سے کہا، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بات کرتے ہو، حالانکہ وہ تم سے بات نہیں کرتے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ آپ پر وحی اتر رہی ہے۔ آپ نے چہرے سے پسینا صاف کیا اور فرمایا: "وہ سوال کرنے والا کہاں ہے؟" گویا آپ کو اس کا پوچھنا اچھا

۱۔ [مسلم، کتاب الزکوۃ، باب فی الکفاف والقناعۃ: ۱۰۵٤]

۲۔ [بخاری، کتاب الزکوۃ، باب الاستعفاف عن المسئلۃ: ۱٤۷۲۔ مسلم، کتاب الزکوۃ، باب بیان أن الید العلیا خیر من الید السفلی: ۱۰۳۵]

معلوم ہوا۔ تب آپ نے فرمایا: "یہ بات تو صحیح ہے کہ اچھی چیز برائی نہیں لاتی، مگر (بے موقع استعمال سے برائی پیدا کرتی ہے) دیکھو! موسم بہار میں جو گھاس اگتی ہے وہ کبھی تو جانور کو مار ڈالتی ہے، یا کبھی مارنے کے قریب کر دیتی ہے، لیکن وہ جانور جو ہری ہری گھاس چرے، حتیٰ کہ اس کی دونوں کوکھیں پھول جائیں تو سورج کی طرف منہ کر کے لید کرے، پیشاب کرے اور پھر چرتا ہے (وہ نہیں مرتا)۔ اسی طرح (دنیا کا) یہ مال بھی بیشک بڑا شیریں اور سرسبز ہے، لیکن مسلمان کا وہ مال ہی اچھا ہے جس میں سے وہ مسکین کو، یتیم کو اور مسافر کو دیتا رہتا ہے اور بیشک جو شخص ناجائز طریقے سے مال کماتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کھاتا ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا اور وہ مال قیامت کے دن (اس کے خلاف) گواہی دے گا۔"[1]

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم مسافر ہو یا راہ گیر۔"[2]

سیدنا عمرو بن عوفؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ابوعبیدہ ابن جراحؓ کو بحرین والوں سے جزیہ لانے کے لیے بھیجا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بحرین والوں سے صلح کر لی تھی اور وہاں کا حاکم علاء بن حضرمی کو مقرر کیا تھا۔ اب ابوعبیدہؓ بحرین سے جزیے کا مال لے کر آئے اور انصار نے جب ابوعبیدہؓ کی آمد کی خبر سنی تو صبح کی نماز میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ شریک ہوئے اور سلام پھرنے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ان کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: "شاید تم ابوعبیدہ کے آنے اور مال لانے کی خبر سن کر آئے ہو؟" انھوں نے عرض کی،

۱۔ [بخاری، کتاب الزکوۃ، باب الصدقۃ علی الیتامیٰ: ۱۴۶۵]

۲۔ [بخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): کن فی الدنیا کأنک غریب أو عابر سبیل: ۶۴۱۶]

جی ہاں، اے اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا: "خوش ہو جاؤ اور اس چیز کی امید رکھو جو تمہیں خوش کر دے گی، اللہ کی قسم! مجھ کو تمہارے متعلق فقر و فاقہ اور محتاجی کا ڈر نہیں ہے، بلکہ میں تو اس بات سے ڈرتا ہوں کہ دنیا تم پر بھی اسی طرح کشادہ کر دی جائے گی، جس طرح ان لوگوں پر کر دی گئی تھی جو تم سے پہلے تھے، پھر تم بھی اسی طرح دنیا کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو گے جیسے انھوں نے دنیا کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی اور پھر دنیا تم کو بھی اسی طرح (آخرت سے) غافل کر دے گی جس طرح اس نے ان کو غافل کیا تھا۔"[1]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تباہ ہو گیا دینار و درہم کا بندہ، چادر کا بندہ اور دھاری دار کپڑے کا بندہ۔ (انھوں نے اپنی آخرت برباد کی) اگر ان کو (یہ سب) ملا تو خوش ہو گئے اور نہیں ملا تو ناخوش ہو گئے۔"[2]

سیدنا کعب بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "دو بھوکے بھیڑیے اگر بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیے جائیں تو وہ ان کو اتنا تباہ و برباد نہیں کرتے جتنا مال و جاہ کی حرص کسی شخص کے دین کو تباہ کرتی ہے۔"[3]

سیدنا ابو ذرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جو لوگ دنیا میں بہت مال و دولت رکھتے ہیں، آخرت میں وہی نادار اور خسارے میں ہونگے، سوائے ان لوگوں کے جنھیں اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہو، پھر انھوں نے اس دولت کو دائیں بائیں اور آگے پیچھے خرچ کیا ہو اور اسے نیکی کے

۱۔ [بخاری، کتاب الرقاق، باب مایحذر من زھرۃ الدنیا والتنافس فیھا: ٦٤٢٥]

۲۔ [بخاری، کتاب الرقاق، باب ما یتقی من فتنۃ المال: ٦٤٣٥]

۳۔ [ترمذی، کتاب الزھد، باب حدیث: ماذئبان جائعان أرسلا فی غنم۔۔الخ: ٢٣٧٦۔ طبرانی کبیر: ٩٦/١٩، ح: ١٨٩]

کاموں میں صرف کیا ہو۔"[1]

سیدنا ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں، انصار کے کئی لوگوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے (مال کا) سوال کیا تو جس کسی نے بھی مانگا آپ نے اسے کچھ نہ کچھ دے دیا، یہاں تک کہ آپ کے پاس جو کچھ تھا وہ ختم ہو گیا۔ جب آپ نے دونوں ہاتھوں سے جو کچھ تھا وہ خرچ کر ڈالا تو فرمایا: "میرے پاس جو کچھ بھی آئے گا میں اس کو تم سے بچا کر رکھنے والا نہیں، بات یہ ہے کہ جو کوئی سوال سے بچنا چاہے گا اللہ بھی اس کو سوال سے بچائے گا اور جو شخص خود پر جبر کر کے صابر بننا چاہے گا تو اللہ اس کو صبر دے گا اور جو شخص بے پروا رہنا پسند کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو بے پروا کر دے گا اور صبر سے بہتر اور وسیع تر کوئی نعمت تم کو ہرگز نہیں ملے گی۔"[2]

سیدنا عمرؓ ایک مرتبہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھر گئے، بیان کرتے ہیں کہ میں نے نظر اٹھا کر آپ کے گھر کو دیکھا تو اللہ کی قسم! مجھے وہاں تین کھالوں کے سوا کوئی چیز نظر نہ آئی، تو میں نے کہا، (اے اللہ کے رسول!) آپ اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ آپ کی امت کو فراخی عطا فرمائے، فارس اور روم کو تو بہت فراخی دی گئی ہے اور انھیں دنیا کا مال ومتاع عطا کیا گیا ہے، حالانکہ وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتے اور آپ اللہ کے رسول اور اس کے برگزیدہ ہونے کے باوجود کس حالت میں ہیں؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تکیہ لگائے بیٹھے تھے، (یہ سن کر) آپ سیدھے ہو گئے، آپ نے فرمایا: "اے ابن خطاب! کیا تم شک میں ہو؟ ان لوگوں کو ان کی اچھائیوں کا بدلہ دنیا ہی میں جلدی دے دیا گیا ہے۔"[3]

۱۔[بخاری، کتاب الرقاق، باب المکثرون هم المقلون: ٦٤٤٣۔ مسلم، کتاب الزکوۃ، باب الترغیب فی الصدقۃ: ٩٤، بعد الحدیث: ٩٩١]

۲۔[بخاری، کتاب الرقاق، باب الصبر عن محارم اللہ: ٦٤٧٠۔ مسلم، کتاب الزکوۃ، باب فضل التعفف والصبر: ١٠٥٣]

۳۔[بخاری، کتاب المظالم، باب الغرفۃ: ٢٤٦٨۔ مسلم، کتاب الطلاق، باب فی الإیلاء واعتزال النساء وتخییرهن۔۔الخ: ١٤٧٩]

سیدنا ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو تو مجھے یہ پسند نہیں کہ تین راتیں گزر جائیں اور اس میں سے کوئی چیز میرے پاس باقی ہو، سوائے اس کے کہ جو میں قرض کی ادائیگی کے لیے رکھ لوں۔"[1]

سیدنا عمرو بن حارثؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نہ کوئی دینار، نہ کوئی درہم، نہ کوئی غلام اور نہ کوئی لونڈی (اپنے پاس جمع کیے) سوائے ایک سفید خچر کے جس پر آپ سوار ہوا کرتے تھے، یا پھر ہتھیار تھے، یا وہ زمین تھی جسے آپ نے مسافروں کے لیے صدقہ کر دیا تھا۔[2]

وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى : ارشاد فرمایا: (لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝۱۹۶ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۚ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۱۹۷ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ)[آل عمران:۱۹۶،۱۹۸] "تجھے ان لوگوں کا شہروں میں چلنا پھرنا ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے جنھوں نے کفر کیا۔ تھوڑا سا فائدہ ہے، پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے لیکن وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈر گئے، ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہیں، اللہ کے پاس سے مہمانی کے طور پر اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لیے بہتر ہے۔"

سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے ابن آدم! میری عبادت کے لیے فارغ ہو جا، میں تیرا سینہ غنا سے بھر دوں گا، تیری فقیری اور حاجت کو دور کر دوں گا اور اگر تو نے یہ نہ کیا تو میں تیرے دونوں ہاتھ مصروفیت سے بھر دوں گا اور تیری

۱۔[بخاری، کتاب المغازی، باب قول النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): مایسرنی أن عندی مثل أحد ہذا ذہبًا: ٤٤٤٦]

۲۔[بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ووفاتہ: ٤٤٦١]

فقیری وحاجت دور نہیں کروں گا۔"[1]

سیدنا عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جس شخص کا مقصود حصول دنیا ہوتو اللہ تعالیٰ اس کے کام بکھیر دیتا ہے اور اس کا فقر اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے اور اسے دنیا اتنی ہی ملتی ہے جتنی اس کے لیے مقدر ہے اور جس کی نیت آخرت کا حصول ہوتو اللہ تعالیٰ اس کے کام مرتب کر دیتا ہے اور اس کے دل میں غنا پیدا فرما دیتا ہے اور دنیا ذلیل ہو کر اس کے پاس آتی ہے۔"[2]

وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى: یعنی دنیا وآخرت میں اچھا انجام اہل تقویٰ ہی کا ہے، جیسا کہ سیدنا انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "میں نے رات کو خواب میں دیکھا، گویا ہم عقبہ بن رافع کے گھر میں ہیں اور ہمارے پاس ابن طاب کے باغ کی کھجوریں لائی گئی ہیں، میں نے اس خواب کی تعبیر یہ کی کہ دنیا میں سربلندی اور آخرت میں اچھا انجام ہمیں ہی حاصل ہوگا اور ہمارا دین بے حد پاکیزہ ہے۔"[3]

کفار کی عادت تھی اور ہے کہ وہ بار بار ایک ہی بات دھراتے جاتے ہیں۔ اسی بری عادت اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پریشان کرنے کی خاطر کفار وقفے، وقفے کے بعد مطالبہ کرتے کہ اگر آپ واقعی سچے نبی ہیں تو کوئی ایسی دلیل اور معجزہ پیش کریں جس سے ہم مجبور ہو جائیں کہ آپ واقعی ہی نبی ہیں۔ قرآن مجید میں اس کے کئی جواب دیے گئے ہیں۔ لیکن اس موقعہ پر صرف اتنا کہنا ہی کافی سمجھا گیا

۱۔[ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق، باب أحادیث ابتلینا بالضراء۔۔الخ: ۲٤٦٦۔ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب الھم بالدنیا: ٤١٠٧]

۲۔[ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب الھم بالدنیا: ٤١٠٥]

۳۔[مسلم، کتاب الرؤیا، باب الرؤیا النبی طغرہ۔۔الخ: ۲۲۷۰۔أبوداؤد، کتاب الأدب، باب فی الرؤیا: ٥٠٢٥]

کہ کیا آپ کی نبوت کے ثبوت تورات، انجیل، زبور میں نہیں پائے جاتے۔

مثال کے طور پر تورات اور انجیل کے حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں جہاں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آمد کے متعلق صاف اشارات موجود ہیں: استثناء، باب ۱۸، آیت ۱۵ تا ۱۹۔ متی، باب ۲۱، آیت ۳۳ تا ۴۶۔ یوحنا، باب، آیت ۱۹ تا ۲۱۔ یوحنا، باب ۱۴، آیت ۱۵ تا ۱۷ و آیت ۲۵ تا ۳۰، یوحنا، باب ۱۵، آیت ۲۵ تا ۲۶۔ یوحنا، باب ۱۶، آیت ۷ تا ۱۵۔

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ہر نبی کو کوئی نہ کوئی معجزہ عطا کیا گیا اور اس معجزہ کی مناسبت سے لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور جو معجزہ مجھے دیا گیا ہے وہ وحی (یعنی قرآن مجید) ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھے دیا ہے، لہٰذا میں امید کرتا ہوں کہ میرے ماننے والے سب نبیوں کے ماننے والوں سے زیادہ ہونگے۔" (۱)

﴿ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾ ﴾

اور اگر ہم ان کو اس (پیغمبر بھیجنے) سے پہلے ہی کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو یہ

{8930 ؟؟ [بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کیف نزل الوحی وأول ما نزل؟: ۴۹۸۱۔ مسلم، کتاب الإیمان، باب وجوب الإیمان برسالۃ نبینا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): ۱۵۲]

کہتے، اے ہمارے رب! تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیرے احکام کی پیروی کرتے۔ (۱۳۴) اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کہہ دیجیے کہ ہر شخص انجام کا انتظار کر رہا ہے، تو تم بھی انتظار کر لو، پس عنقریب تم جان لوگے کہ سیدھی راہ پر (چلنے والے) کون ہیں اور کون ہدایت یافتہ ہیں۔ (۱۳۵)

اللہ تعالیٰ نے از راہ کرم یہ ضابطہ اپنے لیے طے کر رکھا ہے کہ اس وقت تک لوگوں کو ہلاک نہ کیا جائے جب تک ان پر اتمام حجّت نہ ہو جائے۔ اسی لیے انبیاء (علیہ السلام) کو مبعوث کیا گیا اور یہی نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آخری نبی کے طور پر مبعوث کرنے کا مقصد ہے تا کہ اہل کتاب اور قیامت تک کے لیے پیدا ہونے والے لوگوں پر حجت قائم ہو جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو لوگ بہانہ بناتے اور کہتے کہ اے رب ہمارے پاس کوئی سمجھانے والا آتا تو ہم اس کی بات مان کر اس ذلت اور عذاب سے بچ جاتے۔ کیونکہ اب نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مبعوث ہو چکے ہیں۔ لہٰذا نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت اور دعوت کو ماننا تمام لوگوں کا فرض ہے۔ اگر آپ کی بے پناہ کوشش کے باوجود لوگ حق بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ارشاد ہوا کہ آپ ان لوگوں پر مزید وقت صرف کرنے کی بجائے صرف یہ ارشاد فرمائیں کہ حق کا انکار کرنے والو! مجھ سے مزید الجھنے کی بجائے آخری فیصلے کا انتظار کرو۔ میں بھی اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کا انتظار کرتا ہوں۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون صراط مستقیم اور ہدایت پر ہے۔

(مَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا)[بنی اسرائیل:۱۵]

"جس نے ہدایت پائی اس نے اپنے ہی لیے ہدایت پائی اور جو گمراہ ہوا اس کا وبال اسی پر ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور ہم پیغام پہنچانے سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیتے۔"

گزشتہ امتوں نے بھی یہی کیا اور یہی کہا جو آج تم کہہ رہے ہو اور کر رہے ہو' لیکن اس دار فانی میں کچھ وقت کے لیے ان کو بھی انتظار کرنا پڑا کیونکہ ہمارا قانون امہال سب کے لیے ڈھیل چاہتا ہے اور ہم اپنے قانون کے مطابق سب کو کچھ وقت کے لیے ڈھیل دیتے آئے اور آج اس پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے بھی ہمارا قانون وہی ہے اس لیے ہم نے تم کو ڈھیل دے رکھی پہلوں نے اس انتظار اور ڈھیل سے بھی بہت کم فائدہ حاصل کیا اور تم بھی بہت کم فائدہ حاصل کرو گے اور یہ بھی کہ جب سے یہ تحریک اٹھی اور ہمارے نبی ورسول محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نبوت و رسالت کا دعوی کیا ہے کتنے ہیں جو ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے کہ انجام کیا ہوتا ہے اور اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اور تم بھی اب وہی کر رہے ہو جو وہ کر رہے تھے لہٰذا وہ بھی ابھی تک انتظار میں ہیں اور تم بھی انتظار کرو عنقریب تم کو" معلوم ہو جائے گا کہ کون سیدھے راستے پر ہے اور کون منزل مقصود پر پہنچتا ہے؟"

اور ظاہر ہے کہ سیدھی راہ پر وہی ہے جو منزل مقصود تک پہنچ گیا اور اسی طرح منزل مقصود تک وہی پہنچ پائے گا جو سیدھی راہ پر گامزن ہوا۔ منزل مقصود کیا ہے؟ آخرت کی کامیابی' سو اس کا آج نہیں تو آنے والے کل پتہ چل جائے گا لہٰذا اس کے لیے پھر وہی انتظار ہے بس اب تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار میں

ہیں اور اسی مضمون پر سورہ طہ کی تفسیر ختم ہوتی ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں سیدھی بات کرنے اور سیدھی بات مان لینے کی توفیق عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہوں۔

سورہ الانبیاء

یہ پوری سورت مکی ہے، اس سورت میں ایک سو بارہ آیات اور ایک ہزار ایک سو تراسی کلمات اور چار ہزار آٹھ سو ساٹھ حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام الانبیاء ہے، اس کے علاوہ اس سورت کا اور کوئی نام معروف نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس سورت کو الانبیاء کہا ہے۔ عبدالرحمٰن بن یزید بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: بنی اسرائیل، الکہف، مریم، طٰہٰ اور الانبیاء قدیم سورتوں میں سے ہیں، اور ان کو ابتداء اسلام سے حفظ کیا جاتا ہے۔[1]

اس سورت کا نام الانبیاء رکھنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سورت میں اٹھارہ انبیاء (علیہم السلام) کا ذکر ہے۔ اکثر انبیاء علیہم اسلام کے اسماء کی تصریح ہے اور بعض کی صفات اور القاب کا ذکر ہے ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) حضرت موسیٰ (۲) حضرت ہارون، (۳) حضرت ابراہیم (۴) حضرت لوط (۵) حضرت اسحٰق (۶) حضرت یعقوب (۷) حضرت نوح (۸) حضرت داؤد (۹) حضرت سلیمان (۱۰) حضرت ایوب

۱۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 4739 مطبوعہ بیروت)، [بخاري، التفسير، سورہ الانبیاء: ٤٧٣٩]

(۱۱) حضرت اسماعیل، (۱۲) حضرت ادریس (۱۳) حضرت ذی الکفل، (۱۴) حضرت ذوالنون، (۱۵) حضرت زکریا، (۱۶) حضرت یحییٰ (۱۷) حضرت عیسیٰ کا بھی ذکر ہے مگر ان کا نام ذکر نہیں، انہیں مریم کا بیٹا فرمایا ہے، (۱۸) اور ہمارے نبی کو رحمۃ للعلمین فرمایا، خلاصہ یہ ہے کہ ذکر تو اٹھارہ انبیاء (علیہم السلام) کا ہے مگر نام پندرہ کے مذکور ہیں۔

سورہ الانعام میں اٹھارہ انبیاء (علیہم السلام) کے ناموں کا ذکر ہے (الانعام:83-86) اور وہ سورہ الانبیاء سے پہلے نازل ہوئی ہے کیونکہ اس کے نزول کا نمبر ہے ۵۵ اور الانبیاء کے نزول کا نمبر ہے 71 اس لیے الانعام کا نام الانبیاء ہونا چاہیے تھا، لیکن چونکہ اس میں مویشیوں کا ذکر ہے اور اس سورت میں الانعام (مویشیوں) کا لفظ چھ بار آیا ہے۔ اس لیے اس سورت کا نام الانعام رکھا۔ اور اس سورت کا نام الانبیاء رکھا اس کے علاوہ ہم یہ کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ وجہ تسمیہ جامع مانع نہیں ہوتی۔

زمانہ نزول

حافظ ابن حجر عسقلانی ؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے پانچ مسلسل ایک دوسرے کے بعد آنے وال سورتوں کے نام ذکر کئے ہیں اور یہ سب سورتیں مکہ میں نازل ہوئی ہیں جمہور علماء کا یہی موقف ہے، اس کے خلاف جو قول ہے وہ شاذ ہے۔ [1]

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سورہ الکہف اور مریم اور طٰہٰ اور الانبیاء چاروں سورتیں نزول کے اعتبار سے ابتدائی سورتیں ہیں اور میری یہ قدیم دولت اور کمائی ہیں جن کی میں ہمیشہ حفاظت کرتا ہوں۔ (قرطبی) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے اس قول سے گمان کیا جاسکتا ہے کہ یہ سورہ ابتدائی

۱۔ (فتح الباری ج ۹ ص 363، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1420ھ)

زمانے میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔

مضامین کا خلاصہ

رکوع ۱: ابتدا میں قرب قیامت کی خبر دی گئی ہے۔ پھر تمام سابقہ انبیاء کا انسان ہونا بیان کیا گیا ہے۔

رکوع ۲: منکرین خدا کا عذاب سے بچنا محال بیان کیا گیا ہے، پھر حق کا باطل پر غالب آنا، شرک کا ابطال اور توحید کا اثبات ہے۔ آخر میں مشرکین کا فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینا مذکور ہے۔

رجوع ۳: اثبات وحدانیت، تمام جانداروں کا فانی ہونا مذکور ہے۔ پھر کفار کے استہزاء کا جواب اور ان کا آگ کی حقیقت سے بے خبر ہونا بیان کیا گیا ہے۔

رکوع ۴: باطل معبودوں کی حقیت، کفار کی غفلت وغرور اور ان کا حق سے بے بہرہ ہونے کا بیان ہے۔ پھر قیامت کے روز عدل وانصاف کی ترازو قائم کرنے اور حضرت موسیٰ وہارون (علیہما السلام) کا واقعہ مذکور ہے۔

رکوع ۵: حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا واقعہ، ان کا بتوں کو توڑنا۔ کفار کی ندامت اور ان کی طرف سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو زندہ جلانے کا فیصلہ مذکور ہے۔ پھر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) وحضرت لوط (علیہ السلام) کی ہجرت کا بیان ہے۔

رکوع ۶: حضرت نوح وحضرت داؤد (علیہما السلام) کے واقعات اور حضرت داؤد (علیہما السلام) کا زرہیں بنانا بیان کیا گیا ہے۔ پھر حضرت سلیمان، حضرت ایوب، حضرت اسماعیل وادریس، حضرت یونس، حضرت زکریا (علیہم السلام) اور حضرت مریم (علیہا السلام) کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ آخر میں توحید خداوندی پر انبیا کا اجماع مذکورہ ہے۔

رکوع ۷: معذب قوموں کی محرومی، مشرکین اور ان کے بتوں کا جہنم کا ایندھن ہونا بیان کیا گیا ہے۔ پھر مومنوں کا حال، قیامت کے روز آسمانوں کا لپیٹا جانا مذکور ہے۔ آخر میں مومنین سے اللہ کے وعدے اور دعوت توحید کا بیان ہے۔

﴿ اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمۡ وَهُمۡ فِىۡ غَفۡلَةٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ۚ﴿۱﴾ مَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ ذِكۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ مُّحۡدَثٍ اِلَّا اسۡتَمَعُوۡهُ وَهُمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ لَاهِيَةً قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجۡوَى ۖ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ۖ هَلۡ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ ۚ اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳﴾ ﴾

لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا ہے اور وہ اب تک غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں۔ (۱) ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے کوئی نئی نصیحت نہیں آتی مگر وہ لوگ اس کو سنتے ہیں کھیل میں لگے ہوئے۔ (۲) ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ظالم لوگ آپس میں چپکے چپکے سرگوشی کرتے ہیں کہ یہ شخص کچھ بھی نہیں مگر تمہارے جیسا آدمی ہے تو تم آنکھوں دیکھتے جادو کی لپیٹ میں کیوں

آتے ہو۔(۳)

علامہ قرطبی مالکیؒ نے لکھا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب میں سے ایک شخص ایک دیوار بنا رہا تھا، جس دن یہ سورت نازل ہوئی اس دن اس کے پاس سے ایک شخص گزرا، دیوار بنانے والے شخص نے پوچھا آج قرآن میں کیا نازل ہوا ہے، اس نے بتایا یہ آیت نازل ہوئی ہے: لوگوں کے حساب کا وقت آ گیا اور وہ پھر بھی غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کر رہے ہیں، اس شخص نے اس دیوار سے اسی وقت ہاتھ جھاڑ لیے اور کہا اللہ کی قسم! جب حساب کا وقت قریب آ گیا ہے تو پھر یہ دیوار نہیں بنے گی۔ [1]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے پاس سے گزرے اس وقت ہم اپنی جھونپڑی کو درست کر رہے تھے، آپ نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو؟ ہم نے عرض کیا یہ جھونپڑی ٹوٹ پھوٹ رہی تھی تو ہم اس کو بنا رہے ہیں، (اس خدشہ سے کہ اس کی چھت گر نہ جائے) آپ نے فرمایا، اجل سے سے بھی پہلے آنے والی ہے۔ [2]

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا منشاء یہ ہے کہ گھر کی مرمت اور اصلاح سے پہلے اپنے نفس کی اصلاح کر لو، تم گھر کی اصلاح کرتے رہو اور کیا پتا گھر تیار ہونے سی پہلے موت آ جائے۔

اس معنی میں یہ حدیث ہے: حضرت انس بن مالکؓ کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باہر نکلے تو آپ نے ایک اونچا گنبد دیکھا، آپ نے پوچھا، یہ کس کا ہے؟ آپ کے اصحاب نے کہا یہ

۱۔(الجامع لاحکام القرآن جز۱۰ ص177، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

۲۔(سنن الترمذی رقم الحدیث: 2335، مصنف ابن ابی شیبہ ج13 ص218، مسند احمد ج۲ ص161 سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 5235، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث 4160، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: 2996، شرح السنۃ رقم الحدیث: 4030)

انصار میں سے فلاں شخص کا ہے، آپ خاموش ہو گئے اور اس کو دل میں رکھ لیا، حتیٰ کہ جب وہ گنبد بنانے والا شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور اعراض کرنے کی آثار دیکھے، اس نے اپنے اصحاب سے اس کی شکایت کی اور کہا اللہ کی قسم! میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بدلا ہوا پا رہا ہوں، اس کے اصحاب نے بتایا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باہر نکلے تو آپ نے تمہارا بنایا ہوا گنبد دیکھا تھا، وہ شخص واپس اپنے گنبد کی طرف گیا اور اس کو گرا دیا حتیٰ کہ اس کو زمین کے برابر کر دیا۔ پھر ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باہر نکلے تو اس گنبد کو نہیں دیکھا پوچھا وہ گنبد کہاں گیا؟ صحابہ نے کہا اس شخص نے ہم سے آپ کے منہ موڑنے کی شکایت کی تھی ہم نے اس کو اس کی خبر دی تو اس نے اس گنبد کو گرا دیا تو آپ نے فرمایا ہر عمارت اس کے بنانے والے پر وبال ہے سوا اتنی مقدار کے جس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو۔ [1]

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تمہارا دنیا میں رہنا اگلی امتوں کے مقابلہ میں ایسا ہی ہے جیسے عصر کی نماز سے سورج ڈوبنے تک کا وقت۔" [2]

سیدنا انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "میں اور قیامت ان دونوں انگلیوں کی طرح (نزدیک نزدیک) بھیجے گئے ہیں۔" [3]

سیدنا عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "بہشت تمہاری جوتی

۱۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 5237، اتحاف ج ۹ ص 362، کنز العمال رقم الحدیث: 20724، تاریخ کبیر ج ۱ ص 87 ج ۹ ص 45)

۲۔ [بخاری، کتاب مواقیت الصلوۃ، باب من أدرک رکعۃ من العصر قبل الغروب: ۵۵۷]

۳۔ [بخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): بعثت أنا والساعۃ کھاتین: ۶۵۰۴۔ مسلم، کتاب الفتن، باب قرب الساعۃ: ۲۹۵۱/۱۳۴]

کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے، اسی طرح دوزخ بھی (اتنا ہی قریب ہے)۔"[1]

سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ بہت سے دیہاتی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آتے اور دریافت کرتے کہ قیامت کب ہوگی؟ آپ ان لوگوں میں جو سب سے کم عمر ہوتا اس کی طرف دیکھتے، پھر فرماتے: "اگر یہ بچہ زندہ رہا تو اس کے بوڑھا ہونے سے پہلے تمہاری قیامت آجائے گی (یعنی تم مر جاؤ گے)۔"[2]

سیدنا انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا، قیامت کب آئے گی؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کچھ دیر خاموش رہے، تب آپ کے سامنے قبیلہ ازدشنوءہ کا ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا، آپ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا: "اگر اس بچے کی عمر دراز ہوئی تو اس کے بوڑھا ہونے سے پہلے (تمھاری) قیامت آجائے گی۔"[3]

یعنی قرآن جو وقتاً فوقتاً حسب حالات وضروریات اترتا رہتا ہے، وہ اگرچہ انھی کی نصیحت کے لیے اترتا ہے، لیکن وہ اسے اس طرح سنتے ہیں جیسے وہ اس سے استہزا و مذاق اور کھیل کر رہے ہوں، یعنی اس میں تدبر اور غور وفکر نہیں کرتے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ)[یٰس: ۳۰] "ہائے افسوس بندوں پر! ان کے پاس کوئی رسول نہیں آتا رہا مگر وہ اس کے ساتھ ٹھٹھا کیا کرتے تھے۔" سیدنا عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا، تم اہل کتاب سے اس بارے میں پوچھتے ہو جو ان کے پاس ہے، حالانکہ انھوں نے اس میں تحریف کر دی، اسے بدل دیا اور

۱۔[بخاری، کتاب الرقاق، باب الجنۃ أقرب إلی أحدکم من شراک نعلہ والنار مثل ذلک: ٦٤٨٨]

۲۔[بخاری، کتاب الرقاق، باب سکرات الموت: ٦٥١١۔ مسلم، کتاب الفتن، باب قرب الساعۃ: ٢٩٥٢]

۳۔[مسلم، کتاب الفتن، باب قرب الساعۃ: ١٣٨/٢٩٥٣]

اس میں کمی بیشی کردی ہے، جبکہ تمہاری کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی کتابوں میں سے جدید ترین کتاب ہے، تم اسے بالکل اصل اور خالص حالت میں پڑھتے ہو، اس میں کسی چیز کی آمیزش نہیں ہے۔ [1]

ان لوگوں کے دل یوم حشر سے بالکل غافل ہیں اور یہ ظالم لوگ یعنی مشرکین مکہ ابوجہل اور اس کے ساتھی رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن کریم کی تکذیب کے بارے میں آپس میں چپکے چپکے سرگوشی کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم جیسے ایک معمولی آدمی ہیں تو کیا پھر بھی ان کے سحر میں مبتلا ہو اور جھوٹ سنتے جاتے، حالانکہ تم خوب جانتے ہو، کہ یہ جادو اور جھوٹ ہے۔

﴿ قُلْ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۴ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝۵ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶ ﴾

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے) فرمایا جو بات آسمانوں اور زمین میں کہی جاتی ہے میرا رب اسے جانتا ہے اور وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (۴) بلکہ وہ

۱۔ [بخاری، کتاب الشہادات، باب لا یسأل أہل الشرک عن الشہادۃ وغیرہا: ۲۶۸۵]

(کفار) کہتے ہیں کہ قرآن پریشان خیالات ہیں بلکہ یہ اس نے جھوٹ باندھ لیا ہے بلکہ یہ شاعر ہے پس اسے چاہیے کہ ہمارے پاس کوئی نشانی لے آئے جس طرح اگلے پیغمبر (نشانیوں کے ساتھ) بھیجے گئے۔(۵) حالانکہ ان سے پہلے جس بستی والوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں وہ ایمان نہیں لائے سو کیا یہ لوگ ایمان لے آئیں گے۔(۶)

قُلۡ رَبِّیۡ یَعۡلَمُ الۡقَوۡلَ ۔۔: یعنی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تم نے خفیہ مشورے سے جو بات طے کی ہے وہ میرے رب سے مخفی نہیں۔ وہ آسمان و زمین میں ہونے والی ہر بات کو جانتا ہے، کیونکہ وہ سمیع بھی ہے اور علیم بھی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے "یَعۡلَمُ السِّرَّ" (وہ چھپی بات کو جانتا ہے) کے بجائے "یَعۡلَمُ الۡقَوۡلَ" فرمایا، یعنی وہ ہر بات جانتا ہے، تمہاری خفیہ سرگوشیاں بھی اور بلند آواز سے گفتگو بھی۔ اس لیے اس کے پیغمبر کے خلاف تمہاری یہ خفیہ مجلسیں یا علانیہ مخالفت تمہارے کسی کام نہیں آئیں گی اور تم غلبہ اسلام کو کسی طرح نہیں روک سکو گے۔ ایک قراءت میں "قُلۡ رَّبِّیۡ" ہے، یعنی کہہ دے کہ میرا رب آسمان و زمین میں ہونے والی ہر بات جانتا ہے۔

سرورِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت میں کفار اس حد تک بدحواس ہو چکے تھے کہ وہ قرآن مجید کی تاثیر اور اس کی فصاحت و بلاغت ماننے کے باوجود لوگوں کے سامنے یہ پراپیگنڈہ کرتے کہ یہ تو خواب میں دیکھے جانے والے پراگندہ خیالات ہیں۔ جنھیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو سراسر جھوٹ ہے۔ کبھی کہتے یہ شخص تو شاعر ہے۔ اگر یہ واقعی ہی رسول ہوتا تو جس طرح پہلے انبیاء (علیہ

السلام) معجزات کے ساتھ بھیجے گئے یہ بھی کوئی معجزہ پیش کرتا۔ یہاں ان الزامات کا فقط یہ جواب دیا گیا ہے کہ جنھیں ہم نے ہلاک کیا تھا۔ وہ بھی معجزات دیکھنے کے باوجود اپنے انبیاء پر ایمان نہیں لائے تھے اگر ان کے پاس ان کا منہ مانگا معجزہ آجائے تو کیا پھر یہ ایمان لے آئیں گے؟ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے چاند کا دو ٹکڑے ہونا، معراج کے موقعہ پر مسجد اقصیٰ کا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے لایا جانا اور اس کو دیکھ دیکھ کر کفار کو ٹھیک ٹھیک مسجد اقصیٰ کی نشانیاں بتلانا، پتھروں کا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کی شہادت دینا۔ اس طرح کے کئی معجزات کفار کے مطالبات پر ظاہر ہو چکے تھے۔ مگر اس کے باوجود اہل مکہ کی غالب اکثریت فتح مکہ سے پہلے ایمان نہیں لائی تھی۔ جس بناء پر ارشاد ہوا کہ اگر ان کا منہ مانگا معجزہ بھی انھیں دکھلا دیا جائے تو پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ جہاں تک آپ پر شاعر ہونے کا الزام ہے۔ اس کا جواب یوں دیا گیا کہ "شاعر کے دماغ میں شیطان ادھر ادھر کی باتیں ڈالتا ہے اور وہ اکثر جھوٹ ہوتی ہیں اور شاعروں کی پیروی کرنے والے اکثر لوگ گمراہ ہوتے ہیں۔" (نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر شاعر ہونے کا الزام لگانے والو! غور کرو) کہ شاعر تو ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں اور وہ باتیں کہتے ہیں جن پر ان کا عمل نہیں ہوتا۔ (الشعراء: ۲۲۳ تا ۲۲۶) قرآن مجید کے دوسرے مقام پر اس الزام کا یہ بھی جواب دیا گیا ہے۔ "ہم نے اپنے پیغمبر کو شاعری نہیں سکھلائی اور نہ ہی اس کی شایان شان ہے۔ وہ شعر کہیں جس بات کو یہ شاعری کہتے ہیں یہ تو نصیحت اور واقع ہی قرآن مجید ہے۔ (یٰس: ۶۹) ستائیسویں پارہ میں اس الزام کا اس طرح جواب دیا ہے: کفار کہتے ہیں کہ یہ تو شاعر ہے۔ اس لیے ہم اس کے متعلق حادثات زمانہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان سے فرما دیں کہ انتظار کرو میں بھی تمہارے بارے میں منتظر ہوں۔ (الطور: ۲۹۔۳۰)

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ
الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٧ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا
يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝٨ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ
فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝٩ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ
اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝١٠ ﴾

اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ سے پہلے ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا اور ان پر ہم وحی کرتے تھے۔ اگر تمہیں علم نہیں تو اہل ذکر (اہل کتاب) سے پوچھ لو۔ (۷) اور ہم نے ان (رسولوں) کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ (دنیا میں) ہمیشہ رہنے والے تھے۔ (۸) پھر ہم نے ان سے اپنا وعدہ سچا کر دیا اور ان کو اور جن جن کو ہم نے چاہا نجات دی اور حد سے تجاوز کرنے والوں کو ہلاک کر دیا۔ (۹) یقیناً ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ۔ (۱۰)

قرآن مجید نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور انبیاء (علیہ السلام) کے حوالے سے کئی مقامات پر اس

بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ آپ اور پہلے انبیاء کرام (علیہ السلام) بشر تھے۔ اور سب کے سب کھانے، پینے والے انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جسم ایسے نہیں بنائے تھے جو کھانے پینے کی حاجت سے بے نیاز ہوں اور نہ ہی وہ ہمیشہ رہنے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس دنیا سے انتقال کر گئے۔ کہ اگر ان لوگوں کو اس بات پر پھر بھی یقین نہیں آتا تو انھیں چاہیے کہ اہل ذکر سے پوچھ لیں کہ جتنے پیغمبر بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے مبعوث کیے گئے ہیں وہ سب کے سب انسان تھے۔ اس لیے کہ یہاں "اَهْلَ الذِّكْرِ" سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور اگر بالفرض اسے عام بھی مان لیا جائے، تو مقصود قرآن وسنت کے نصوص پوچھنا ہے، نہ کہ کسی انسان کی رائے، جسے قرآن وسنت سے بغیر دلیل مانگے مان لیا جاتا ہے۔

یعنی ہم نے ان انبیاء کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ کھانا نہ کھاتے ہوں، بلکہ وہ ایسے جسم والے تھے جو کھانا کھاتے تھے، جیسا کہ فرمایا: (وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً اَتَصْبِرُوْنَ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا)[الفرقان: ٢٠] "اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجے مگر بلاشبہ وہ یقیناً کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔" اور وہ انبیاء دنیا میں ایک متعین مدت تک زندہ رہنے کے بعد فوت ہوجاتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: (وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَاْئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ)[الانبیاء: ٣٤] "اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی بشر کے لیے ہمیشگی نہیں رکھی، سو کیا تو مر جائے تو یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔" کفار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے انسان ہونے، ان کے کھانے پینے اور بازاروں میں آمد و رفت رکھنے پر اعتراض کرتے تھے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (وَقَالُوْا مَالِ

هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ○ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ○ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا)[الفرقان:۷ تا ۹] "اور انھوں نے کہا اس رسول کو کیا ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اس کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا کہ اس کے ساتھ ڈرانے والا ہوتا۔ یا اس کی طرف کوئی خزانہ اتارا جاتا، یا اس کا کوئی باغ ہوتا جس سے وہ کھایا کرتا اور ظالموں نے کہا تم تو بس ایسے آدمی کی پیروی کر رہے ہو جس پر جادو کیا ہوا ہے۔ دیکھ انھوں نے تیرے لیے کیسی مثالیں بیان کیں، سو گمراہ ہو گئے، پس وہ کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔"

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ۔۔: "صَدَقَ يَصْدُقُ" لازم بھی آتا ہے، یعنی سچ کہنا اور متعدی بھی، یعنی سچا کر دکھانا، "پھر ہم نے ان سے وعدہ سچا کر دیا۔" "ثُمَّ" (پھر) کا لفظ یہ بتانے کے لیے ہے کہ رسولوں کی مخالفت ہوئی، انھیں ستایا گیا، جنگیں بھی ہوئیں مگر پھر آخر کار ہم نے ان سے مدد کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا، سو ہم نے رسولوں کو نجات دی اور ان کو بھی جنھیں ہم چاہتے تھے۔ اس میں رسولوں کے پیروکار بھی شامل ہیں اور کفار میں سے وہ بھی جنھیں آئندہ ایمان لانا تھا، یا جن کی اولاد کو ایمان کی توفیق ملنا تھی۔ عربوں پر سب کو ہلاک کرنے والا عذاب نہ آنے میں یہی حکمت تھی۔ "اور حد سے بڑھنے والوں کو ہلاک کر دیا" اس میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے پیروکاروں کے لیے خوش خبری ہے اور کفار کے لیے وعید ہے۔

اگلی آیت میں فرمایا ہے ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے۔ اس میں

ذکر کے تین محامل ہیں:

(۱) اس کتاب میں تمہارے شرف اور تمہارے مرتبہ کا ذکر ہے اور دوسری امتوں پر تمہاری افضلیت کا بیان ہے۔

(۲) اس کتاب میں تمہیں نصیحت کی گئی ہے تا کہ جو کام تمہارے لیے ناجائز ہیں تم ان سے بچو اور جو کام تمہارے لیے ضروری ہیں تم ان کو انجام دو اور ذکر سے مراد نیک کاموں پر تمہارے لیے بشارت ہے اور برے کاموں پر تمہاری سزا کی وعید ہے۔

(۳) ذکر سے مراد تمہارے دین اور تمہارے احکام شرعیہ کا بیان ہے، جن پر عمل کر کے تم دین اور دنیا کی فلاح حاصل کر سکتے ہو۔ پھر فرمایا کیا تم نہیں سمجھتے۔ یعنی کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے، یعنی تم قرآن مجید میں غور و فکر کر کے اپنی دین اور دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔

﴿ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ⑪ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ⑫ ؕ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ⑬ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ⑭ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ⑮ ﴾

اور کتنی ہی ظالم بستیاں ایسی تھیں جن کو ہم نے پیس کر رکھ دیا جو ظلم کرنے والی تھیں، اور ہم نے ان کے بعد دوسری قوموں کو پیدا کر دیا۔(۱۱) پھر جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس کر لیا تو فوراً وہاں سے بھاگنے لگے۔(۱۲) ہم نے کہا) مت بھاگو اور جن نعمتوں میں تم عیش و آرام کرتے تھے ان کی اور اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاؤ شاید کہ تم سے پوچھا جائے۔(۱۳) کہنے لگے، ہائے ہماری کم بختی، بیشک ہم ہی ظالم تھے۔(۱۴) پس وہ یہی پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے انہیں کٹی ہوئی کھیتی کی طرح اور بجھی ہوئی آگ کی طرح کر دیا۔(۱۵)

ماضی میں تباہ شدہ اقوام

ان آیات میں جن بستیوں کے تباہ کرنے کا ذکر ہے بعض مفسرین نے ان کو یمن کی بستیاں حضوراء اور قلابہ قرار دیا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک رسول بھیجا تھا۔ جس کے نام میں روایات مختلف ہیں بعض میں موسیٰ بن میشا اور بعض میں شعیب ذکر کیا گیا ہے اور اگر شعیب نام ہے تو وہ مدین والے شعیب (علیہ السلام) کے علاوہ کوئی اور ہیں ان لوگوں نے اللہ کے رسول کو قتل کر ڈالا اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک کافر بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں تباہ کرایا بخت نصر کو ان پر مسلط کر دیا جیسا کہ بنی اسرائیل نے جب فلسطین میں بے راہی اختیار کی تو ان پر بخت نصر کو مسلط کر کے سزا دی گئی تھی مگر صاف بات یہ ہے کہ قرآن نے کسی خاص بستی کو معین نہیں کیا اس لیے عام ہی رکھا جائے اس میں یہ یمن کی بستیاں بھی داخل ہوں گی۔

واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ نے کتنی ہی بستیوں کو ہلاک کیا جن کے رہنے والے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے بارے میں ظلم کرنے والے تھے۔ انھیں تباہ و برباد کر کے دوسری قوم کو پیدا فرمایا۔ قوموں کی تباہی اور دوسری اقوام کو لانے کے عمل کا ذکر کرتے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں جمع کی ضمیر (هُمْ) استعمال فرمائی ہے۔ جس کا مقصد جلالت و جبروت کا اظہار کرنا ہے۔ چنانچہ جب ظالم لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے غضب کا مظاہرہ کیا اور ظالموں کو یقین ہو گیا کہ اب ہمارا بچنا مشکل ہے تو وہ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے انبیائے کرام (علیہ السلام) کو حکم فرمایا کہ انہیں کہو بھاگنے کی بجائے اپنے مال و دولت، عیش و عشرت اور محلات میں ٹھہرے رہو تا کہ تمہاری اچھی طرح پوچھ گچھ کی جا سکے۔ پوچھ گچھ سے مراد وہ عذاب ہے جس میں وہ مبتلا کیے گئے۔ گویا کہ انھیں ان کے مال و دولت سمیت تباہ کر دیا گیا۔ جن محلات اور مکانات میں رہتے تھے وہی ان کے لیے قبرستان بن گئے۔ جب ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا تو وہ اس بات کا اقرار کرتے رہے کہ ہم پر ظلم نہیں ہوا بلکہ ہم خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرنے والے تھے۔ ان کے اقرار کے باوجود۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں کٹی ہوئی کھیتی کی طرح ریزہ ریزہ کر دیا جس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ تھی۔ اس حالت میں ان کی کوئی مدد کرنے والا نہ تھا، باوجود اس کے وہ آہ و زاریاں کر رہے تھے۔

﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝١٦ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝١٧

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

اور ہم نے آسمان وزمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کوئی کھیل تماشہ کے طور پر نہیں بنایا ہے۔(۱۶) اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے تو اپنے پاس سے ہی بنا لیتے اگر ہم (ایسا) کرنے والے ہوتے۔(۱۷) نہیں' بلکہ ہم حق کو باطل پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا سر کچل دیتا ہے اور جھوٹ اسی وقت مٹ جاتا ہے اور تمہارے لیے ان باتوں کی وجہ سے بڑی خرابی ہے جو تم بناتے ہو۔(۱۸)

اللہ تعالیٰ آگاہ فرماتا ہے کہ اس نے زمین اور آسمان کو کھیل تماشے کے طور پر عبث اور بے فائدہ پیدا نہیں کیا بلکہ ان کو حق کے ساتھ اور حق کے لیے پیدا کیا ہے تاکہ بندے اس کائنات سے استدلال کریں کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق، عظمت والا، کائنات کی تدبیر کرنے والا، حکمت والا اور رحمان ورحیم ہے، جو کمال کلی، ہر قسم کی تعریف اور تمام تر عزت کی مالک ہے۔ وہ اپنے قول میں سچا ہے اس کے رسول بھی اس کی طرف سے خبر دینے میں سچے ہیں۔ وہ قادر ہستی جو زمین وآسمان کو ان کی وسعت اور عظمت کے ساتھ پیدا کرنے پر قادر ہے وہ جسموں کے مرنے کے بعد ان کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قدرت رکھتی ہے تاکہ نیک کو اس کی نیکی کی جزا اور بد کو اس کو بدی کی سزا دے۔

(لواردنا ان نتخذ لھو) "اگر ہم کھیل تماشے ہی کا ارادہ کرتے" یعنی بفرض محال اگر یہ تسلیم کرلیا جائے (لا

تخذ نہ من لدنا) تو ہم اسے بنا لیتے اپنی ہی طرف سے (ان کنا فعلین) اگر ہوتے ہم کرنے والے۔ اور کھیل تماشے کی بابت تمہیں مطلع بھی نہ کرتے کیونکہ یہ نقص اور برا وصف ہے، جسے ہم تمہیں دکھانا پسند نہ کرتے۔ یہ زمین و آسمان جو ہمیشہ سے تمہارا سامنے ہیں، ممکن نہیں کہ ان کو عبث اور کھیل تماشے کے مقصد سے پیدا کیا گیا ہو۔ یہ سب کچھ موٹی عقل کے لوگوں کی سطح پر اتر کر کہا گیا ہے تا کہ ان کو ہر لحاظ سے مطمئن کیا جائے۔ پس پاک ہے وہ ذات جو حلم والی، رحم کرنے والی اور حکمت والی ہے، وہ تمام اشیاء کو ان کے اپنے مقام پر رکھنے میں حکمت سے کام لیتی ہے۔

یعنی تخلیق کائنات کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ ہے کہ یہاں حق و باطل کی جو معرکہ آرائی اور خیر و شر کے درمیان جو تصادم ہے، اس میں ہم حق اور خیر کو غالب اور باطل اور شر کو مغلوب کریں۔ چنانچہ ہم حق کو باطل پر یا سچ کو جھوٹ پر یا خیر کو شر پر مارتے ہیں، جس سے باطل، جھوٹ اور شر چشم زدن میں نابود ہو جاتا ہے۔ "دَمُغٌ" سر کی ایسی چوٹ کو کہتے ہیں جو دماغ تک پہنچ جائے۔ "زَهُقٌ" کے معنی "ختم یا ہلاک و تلف ہو جانے کے ہیں، جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: (وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا) [بنی اسرائیل: ۸۱] "اور کہہ دے حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بیشک باطل مٹنے والا تھا۔"

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فتح مکہ کے دن مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت خانہ کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ بت تھے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی، جس سے آپ ان بتوں کو کچوکے مارتے جاتے اور یہ فرماتے جاتے تھے: "حق آ گیا اور باطل چلا گیا، حق آ گیا

اور باطل سے نہ شروع میں کچھ ہوسکا اور نہ آئندہ کچھ ہوسکتا ہے۔"[1]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کعبہ کا طواف کیا، پھر ایک بت کے پاس آئے جو کعبہ کے پہلو میں رکھا گیا تھا، لوگ اس کی پوجا کرتے تھے، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھ میں ایک کمان تھی، جس کا ایک کونا آپ نے تھاما ہوا تھا، تو جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس بت کے پاس آئے تو اس کی آنکھ میں کچوکا لگانے لگے اور فرمانے لگے: "حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔"[2]

﴿ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ ﴾

اور اسی کا ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے، اور جو (فرشتے) اس کے پاس ہیں وہ نہ تو اس کی عبادت سے سرکشی کرتے ہیں اور نہ تھکتے ہیں۔ (۱۹) وہ رات دن اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور سستی نہیں کرتے۔ (۲۰) کیا ان لوگوں نے زمین

۱۔ [بخاری، کتاب المغازی، باب أین رکز النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) الرایۃ یوم الفتح؟: ۴۲۸۷]

۲۔ [مسلم، کتاب الجہاد، باب فتح مکۃ: ۱۷۸۰]

(کی مخلوقات میں) سے کچھ ایسے معبود بنا رکھے ہیں جو انہیں (مرنے کے بعد) دوبارہ اٹھا کھڑا کریں گے۔(۲۱)

شرک کا رد

سب سے پہلی یہ بات ارشاد فرمائی کہ تمام آسمانوں اور تمام زمینوں اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ان میں سے ایک ایک مخلوق کا خالق، مالک اور حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ان میں سے کسی چیز کو اس کے سوا کسی نے تخلیق نہیں کیا۔اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا وہ اس کی ملکیت کا دعویٰ کرے۔ان دونوں باتوں کے قبول کرنے کے بعد یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ ہی اس کائنات کا حاکم مطلق ہے، اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس میں آزادانہ تصرف کرے اور کسی اور کو اس کی مرضی کے بغیر کسی طرح کے تصرف کی بھی قطعاً آزادی نہیں۔رہی وہ مخلوقات جو اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہیں یعنی جو آسمانوں میں ہیں اور جن کی حیثیت کارکنانِ قضاء وقدر کی ہے یا جو حاملین عرش ہیں اور یا زمین میں وہ مقدس نفوس جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی اتاری اور کتابیں نازل کی ہیں ان میں سے کوئی بھی اس کی بندگی سے سرتابی کی جرأت نہیں کرسکتا۔ان میں فرشتے ہوں یا اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول، اس کی اطاعت میں سرمو کمی بیشی کرنا ان کے بس میں نہیں۔البتہ! یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی فضائل سے نوازا ہے اور فرشتے تخلیقی طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کے احکام کو براہ راست کائنات پر نافذ کرنا انھیں کی ذمہ داری ہے۔لیکن ان تمام فضائل اور صلاحیتوں، ذمہ داریوں اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی سے سرتابی تو کیا کریں گے وہ تو اس کی عبادت اور

بندگی سے نہ کبھی تھکتے اور نہ کبھی سیر ہونے کا نام لیتے ہیں۔جس طرح مرغن غذاؤں سے پیٹ بھر جانے کے باوجود کھانے کے لطف ولذت سے نیت بھرنے میں نہیں آتی اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا ذوق بخشا ہے کہ وہ اس کی عبادت اور اس کے احکام کی بجا آوری میں اس سے بڑھ کر لطف ولذت محسوس کرتے ہیں جتنا ایک شخص پر تکلف کھانے کو کھاتے ہوئے لذت محسوس کرتا ہے۔اہل عرب نے فرشتوں کی طرف خصوصیت سے بہت سی باتیں منسوب کر رکھی تھیں، مثلاً یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔اللہ تعالیٰ ہر ممکن طریقے سے بیٹیوں کی طرح ان کی ناز برداریاں کرتا ہے اور ان کی ہر ضد کے سامنے اپنے اختیارات سے دستبردار ہو جاتا ہے۔اس لیے اہل عرب کا خیال یہ تھا کہ اولاً تو قیامت کا تصور ہی محال ہے لیکن اگر قیامت آ ہی گئی تو اللہ تعالیٰ کی یہ بیٹیاں جن کو ہم اپنی عبادت اور بندگی سے خوش رکھتے ہیں وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچا لیں گی اور اگر اللہ تعالیٰ غضبناک ہوا تو وہ ضد کر کے اپنے باپ سے ہمیں چھڑا لیں گی۔ان کے بارے میں اہل عرب کو توجہ دلاتے ہوئے بطور خاص ارشاد فرمایا گیا ہے کہ فرشتے جنھیں تم اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں سمجھتے ہو وہ تو ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے لرزاں اور ترساں رہتے ہیں اور تم نے جو بعض مشرکانہ باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر رکھی ہیں وہ ان باتوں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کرتے رہتے ہیں کیونکہ تسبیح کا معنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو ان صفات سے پاک اور منزہ ٹھہرانا ہے جو اس کی شان اور عظمت کے لائق نہیں۔وہ شب و روز اس کام میں مصروف رہتے ہیں اور کبھی ان میں اس کے لیے اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے لوگو! جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ خود اللہ کی عبادت کرتے ہیں، وہ بھی تمہاری طرح اللہ کے محتاج ہیں۔ایسی صورت میں ان کی عبادت لغو ہے، عبادت تو اس کی ہونی چاہیے

جس کی عبادت تمہارے خودساختہ معبود کرتے ہیں۔ الٰہ تو صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ کیا اس حقیقت کے باوجود انھوں نے زمین پر پیدا ہونے والوں میں سے الٰہ بنا لیے ہیں، جو انھیں مرنے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کریں گے؟ نہیں، زمین میں کوئی الٰہ نہیں ہے جو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر سکے۔ زمین و آسمان دونوں جگہ بس ایک ہی الٰہ ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَاۗءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝۸۴ وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ) [الزخرف: ۸۴، ۸۵] "اور وہی ہے جو آسمانوں میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہی کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ اور بہت برکت والا ہے وہ جس کے پاس آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس کی بھی جو ان دونوں کے درمیان ہے اور اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔"

﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۲۲ لَا يُسْـَٔـلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔـلُوْنَ ۲۳﴾

اگر آسمان میں اور زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے پس اللہ تعالیٰ جو عرش کا مالک ہے وہ ان باتوں سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔ (۲۲) وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا اور سب

سے باز پرس کی جائے گی۔(۲۳)

یعنی اگر زمین وآسمان میں متعدد خدا ہوتے تو کائنات کا یہ نظام چل نہیں سکتا تھا۔ ہر خدا اپنے اختیارات کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا۔ اس صورت میں وہ نظم باقی نہیں رہ سکتا تھا جو اس کائنات میں قائم ہے اور نہ اس کے مختلف اجزاء ایک دوسرے سے موافقت پیدا کر سکتے تھے اور نہ کسی منصوبہ اور اسکیم کے ساتھ اس کائنات میں کوئی کام انجام پاتا۔ مثال کے طور پر بارش کے لیے زمین سمندر سورج اور ہوائیں سب کی موافقت ضروری ہے ورنہ انسان کو زمین کے گوشہ میں پانی پہنچانے کی یہ اسکیم بروئے عمل نہیں آسکتی۔ اگر یہ چیزیں الگ الگ خداؤں کے تصرف میں ہوتیں تو بارش کا یہ انتظام کس طرح ممکن تھا ؟۔

یہ توحید کی زبردست دلیل ہے اس سے شرک اور الحاد دونوں کی تردید ہوتی ہے۔ اگر یہ کائنات بے خدا ہوتی تو یہ کارخانہ اس باقاعدگی کے ساتھ کس طرح چل سکتا تھا؟۔

علامہ ابوعبداللہ قرطبی مالکیؒ متوفی 668ھ لکھتے ہیں:

ابن جریج نے کہا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں جو قضاء اور فیصلہ کرتا ہے اس کے متعلق اس سے سوال نہیں کیا جائے گا اور مخلوق سے ان کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا، کیونکہ وہ اس کے غلام ہیں، کل حضرت مسیح اور ملائکہ سے سوال کیا جائے گا کیونکہ وہ معبود ہونے کے لائق اور قابل نہ تھے، ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی قول اور فعل پر گرفت نہیں ہوگی اور مخلوق کے اقوال اور افعال پر گرفت ہوگی۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا اے امیر المومنین! کیا ہمارا رب یہ پسند کرتا ہے کہ ہم اس کی نافرمانی کریں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کیا ہمارے رب کی زبردتی نافرمانی کی جاتی

ہے! اس شخص نے کہا یہ بتائیں اگر اللہ مجھے ہدیات پر عمل کرنے سے روک دے اور مجھے برے کاموں پر لگا دے تو کیا اس نے اچھا کیا یا برا کیا حضرت علیؓ نے فرمایا اگر اللہ تم کو (بالفرض) تمہارا حق نہ دے تو اس نے (معاذ اللہ) برا کیا (ہم نے بالفرض اس لیے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کسی کا کوئی حق نہیں ہے) اور اگر وہ تم پر فضل اور احسان نہ کرے تو وہ مالک ہے جس پر چاہے اپنا فضل فرمائے۔ پھر حضرت علیؓ نے یہ آیت پڑھی:

لایسئل عما یفعل وھم یسئلون (الانبیاء:23) اس سے ان کاموں کا سوال نہیں کیا جائے گا جو وہ کرتا ہے اور ان سب سے باز پرس کی جائے گی۔ [1]

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ متوفی 310ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں جو کچھ تصرف فرماتا ہے کسی کو زندگی دیتا ہے کسی کو موت دیتا ہے، کسی کو درجنوں بچے دیتا ہے کسی کو لاولد رکھتا ہے، کسی کو مال و دولت عطا کرتا ہے کسی کو فقر و فاقہ میں مبتلا کرتا ہے، کسی کو صحت اور قوت عطا فرماتا ہے اور کسی کو بیمار اور کمزور رکھتا ہے، کسی کو عزت دیتا ہے اور کسی کو ذلت میں مبتلا رکھتا ہے، اس سے کسی بات کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا کیونکہ سب اسی کی مخلوق، مملوک اور غلام ہیں، سب اس کے زیر سلطنت اور زیر حکم ہیں، سب پر اس کی قضا نافذ ہے، اس کے اوپر کوئی ہستی نہیں ہے جو اس سے سوال کر سکے، اور آسمان اور زمین میں جو بھی مخلوق ہے وہ سب اس کے بندے ہیں اور ان سب سے ان کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا اور ان کے اعمال کا حساب لیا جائے گا کیونکہ وہ سب کا مالک اور معبود ہے۔ [2]

۱۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۱ ص 188 – 189 مطبوعہ دار الفکر بیروت 1415ھ)

۲۔ (جامع البیان جز 17 ص 20، مطبوعہ دار الفکر بیروت 1415)

﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا
ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ
الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ
اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾ ﴾

کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں؟ (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہو کہ تم اپنی دلیل تو پیش کرو۔ یہ (قرآن) بھی موجود ہے جس میں میرے ساتھ والوں کے لیے نصیحت ہے، اور وہ (کتابیں) بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی۔ بلکہ بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حق (بات) کو جانتے ہی نہیں، پس (جب حق کا ذکر آتا ہے تو) یہ منہ پھیر لیتے ہیں۔ (۲۴) اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر ان کی طرف یہی وحی کرتے رہے ہیں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میری ہی عبادت کرو۔ (۲۵)

جنھوں نے اِلٰہِ حق کو چھوڑ کر دوسرے اِلٰہ بنا رکھے ہیں۔ ان کے لیے کھلا چیلنج ہے کہ اگر ان کے پاس اپنے معبودوں کے برحق ہونے کی کوئی عقلی و نقلی دلیل ہے تو وہ سامنے لائیں۔ مجھ پر اور مجھ سے پہلے جتنے انبیائے کرام (علیہ السلام) پر کتابیں نازل ہوئی ہیں ان میں عقلی و نقلی دلائل موجود ہیں کہ اللہ تعالیٰ

کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے۔ لیکن لوگوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ اس حقیقت سے نا آشنا اور اپنی بے علمی کی وجہ سے حق سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

یہاں "ذکر" کا معنی نصیحت بھی ہے اور عقیدہ توحید بھی۔ مراد یہ ہے یہی میرا، میرے ساتھیوں اور مجھ سے پہلے انبیاء (علیہ السلام) کا عقیدہ اور نصیحت ہے۔ جہاں تک اِلٰہِ حقیقی کے سوا کسی دوسرے اِلٰہ کا تعلق ہے اس کی کوئی عقلی و نقلی دلیل موجود نہیں۔ جس کا بین اور ٹھوس ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو اِلٰہ مانتا ہے اس کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں اس کا حساب اس کے رب کے ہاں ہوگا۔ یقین جانو کہ کافر کبھی فلاح نہیں پائے گا۔ (المومنون: ۱۱۷) کافر سے مراد یہاں کلمہ نہ پڑھنے والا بھی ہے اور مشرک بھی۔ اِلٰہ کا معنیٰ ہے حاجت روا، مشکل کشا اور وہ ذات جس کے ساتھ انتہا درجے کی محبت کرتے ہوئے نہایت عاجزی کے ساتھ اس کی عبادت کی جائے۔

یعنی آدم (علیہ السلام) سے لے کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے تک جتنے انبیاء مبعوث ہوئے اور جتنی آسمانی کتابیں نازل ہوئیں، ان سب کا ایک ہی پیغام تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس لیے صرف اسی کی عبادت ہونی چاہیے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ) [النحل: ۳۶] "اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔" اور فرمایا: (وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ۝45) [الزخرف: ۴۵] "اور ان سے پوچھ جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا، کیا ہم نے رحمٰن کے سوا کوئی معبود بنائے ہیں، جن کی عبادت کی جائے؟" سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم) نے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف روانہ فرمایا تو آپ نے ارشاد فرمایا: "تم ایک ایسی قوم کے پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب ہیں، اس لیے جب تم وہاں پہنچو تو انھیں (سب سے پہلے) اس بات کی طرف دعوت دینا کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، پھر اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں تو انھیں آگاہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، پھر اگر وہ تمہاری یہ بات بھی تسلیم کر لیں تو انھیں خبردار کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوۃ فرض کی ہے جو ان کے مال داروں سے وصول کی جائے گی اور ان کے غریبوں پر خرچ کی جائے گی اور اگر وہ اس میں بھی تمہاری فرماں برداری کریں تو ان کے نفیس وعمدہ مال (بطور زکوۃ لینے) سے بچنا اور مظلوم کی بد دعا سے بھی بچنا، کیونکہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔"[1]

سیدنا مسیبؓ بیان کرتے ہیں کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت آیا تو رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے پاس آئے، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دیکھا کہ ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ بھی اس کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اے چچا جان! آپ "لا الٰہ الا اللہ" کا اقرار کر لیں، یہ ایسا کلمہ ہے کہ جس کی بنا پر میں اللہ کے ہاں آپ کے حق میں گواہی دوں گا۔" اس پر ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ کہنے لگے، اے ابو طالب! کیا تم عبدالمطلب کے دین کو چھوڑ دو گے؟ اب (ایک طرف) رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسلسل اسے "لا الٰہ الا اللہ" کی دعوت دیتے رہے اور (دوسری طرف) وہ دونوں ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ بھی اپنی پہلی بات دہراتے

۱۔[بخاری، کتاب الزکوۃ، باب أخذ الصدقۃ من الأغنیاء وترد فی الفقراء حیث کانوا: ۱۴۹۶۔ مسلم، کتاب الإیمان، باب الدعاء إلی الشہادتین و شرائع الإسلام: ۱۹]

رہے، حتیٰ کہ ابو طالب نے جو آخری بات کی وہ یہ تھی کہ وہ عبد المطلب کے دین پر قائم ہے اور یوں اس نے "لا الٰہ الا اللہ" کا اقرار کرنے سے انکار کر دیا۔ [1]

﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ﴿۲۶﴾
لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ
اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ
مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ
فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ ﴾

اور (مشرکین) کہتے ہیں کہ رحمٰن نے اولاد بنالی ہے، وہ اس سے پاک ہے، بلکہ وہ سب اس کے باعزت بندے ہیں۔ (۲۶) وہ اس سے آگے بڑھ کر بات بھی نہیں کر سکتے اور وہ اسی کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ (۲۷) وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اسی کی شفاعت کریں گے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو اور وہ اس کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں۔ (۲۸) اور (بالفرض

۱۔ [بخاری، کتاب الجنائز، باب إذا قال المشرک عند الموت: لا إلٰہ إلا اللہ: ۱۳۶۰۔ مسلم، کتاب الإیمان، باب الدلیل علی صحۃ إسلام من حضرہ الموت۔۔الخ: ۲۴]

اگر) جوکوئی ان میں سے کہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا میں معبود ہوں تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے، (اور) ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔(۲۹)

امام محمد بن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ابن جریج ؒ نے اس کی تفسیر میں کہا کہ فرشتوں میں سے جس نے یہ کہا، اور ابلیس کے سوا کسی نے یہ نہیں کہا تھا اس نے لوگوں کو اپنی عبادت اور اطاعت کی دعوت دی تھی سو یہ آیت ابلیس کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

قتادہؒ نے کہا خصوصیت کے ساتھ یہ آیت اللہ کے دشمن ابلیس کے متعلق نازل ہوئی ہے جب اس لعین نے وہ کہا جو اس نے کہا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو مردود قرار دے دیا تھا۔ [1]

فرشتوں کا مکلف ہونا

علامہ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ قرطبی مالکی ؒ متوفی 668ھ لکھتے ہیں:

اس آیت سے ابلیس مراد ہے، کیونکہ اس نے اللہ کا شریک ہونے کا دعویٰ کیا اور لوگوں کو اپنی عبادت کرنے کی دعوت دی اور وہ فرشتوں میں سے تھا (حقیقت میں وہ جنات میں سے تھا لیکن چونکہ وہ فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا اس لیے حکماً ان ہی میں سے تھا) اور فرشتوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اللہ کے سوا معبود ہے، اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ فرشتے معصوم ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور فرشتے مجبوراً اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے جیسا کہ بعض جاہلوں کا گمان ہے۔

۱۔ (جامع البیان جز ۱۱ ص 24، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

(۱)

اللہ کے لیے بیٹا ہونے کا تصور زمانہ جاہلیت میں مختلف لوگوں کے درمیان مختلف تھا۔ مشرکین عرب خیال کرتے تھے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ مشرکین یہود کہتے تھے کہ عزیز ابن اللہ ہیں اور مشرکین نصاریٰ کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ سب شرکیہ عقائد ہیں اور دوسری اقوام مشرک کے ہاں اور طرح کے ہیں۔

یہاں اشارہ عربوں کے عقیدہ کی طرف ہے جو ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ یہاں ان کے عقیدے کی تردید فرشتوں کی نوعیت اور حقیقت کے بیان سے کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی بیٹیاں نہیں' جس طرح ان لوگوں کا زعم ہے بلکہ یہ اللہ کے ہاں مکرم بندے ہیں۔ یہ ایسی مخلوق ہے کہ اللہ کے سامنے جذبہ اطاعت' ادب اور خوف خدا کی وجہ سے بات ہی نہیں کرتے۔ پس جو ان کو حکم دیا جاتا ہے' بے چون و چرا اس پر عمل کرتے ہیں۔ اللہ کا علم پوری طرح ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ لوگ کسی کی سفارش بھی نہیں کرتے الا یہ کہ اللہ کسی کی سفارش پر راضی ہو جائے۔ وہ مزاجاً اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں اور اللہ کے خوف سے بھی ڈرتے ہیں حالانکہ وہ اللہ کے قریب تر ہیں' پاکباز ہیں' پوری طرح مطیع فرمان ہیں اور ان کے اندر کوئی انحراف نہیں ہے۔ پھر ان کا یہ دعویٰ بھی نہیں ہے کہ وہ اِلٰہ ہیں۔ اور اگر وہ ایسا کوئی دعویٰ کر بھی بیٹھیں' بفرض محال' تو وہ بھی ایسی ہی سزا کے مستحق ہوں گے جس کا اعلان دوسروں کے لیے ہے' یعنی جہنم اور یہ سب ظالم مشرکین کے لیے ہے۔ یہ اس لیے کہ الوہیت کا حق صرف اللہ کا ہے۔ اس طرح مشرکین عرب کا یہ دعویٰ غلط' خلاف عقل اور مکروہ ہے' کوئی بھی ایسا دعویٰ نہیں کرتا اور اگر کرے گا تو مقررہ

۱۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۱۱ ص 191، مطبوعہ دار الفکر بیروت 1415ھ)

سزا پائے گا۔ جو بھی ہو یہ مدعی ۔۔ یہاں فرشتوں کی اطاعت شعاری کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے خلاف میں ڈوبے رہتے ہیں جبکہ مشرکین مکہ جسارت کرتے ہیں۔

وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى: سیدنا ابوسعید خدریؓ سے اللہ تعالیٰ کے دیدار سے متعلق جو حدیث مروی ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "آج تم لوگ اپنے حق کے لیے جتنا تقاضا (یا مطالبہ) مجھ سے کرتے ہو اس سے کہیں زیادہ شدید تقاضا اہل ایمان (قیامت کے روز) اللہ تعالیٰ سے اس وقت کریں گے جب انھیں اپنے بارے میں اطمینان ہو جائے گا کہ وہ اپنے بھائیوں میں سے نجات پا گئے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کریں گے، اے ہمارے رب! ہمارے بھائی بھی ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے اور دوسرے نیک اعمال کرتے تھے (انھیں بھی معاف فرما دیجیے)۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے، جاؤ جس کے دل میں ایک دینار کے برابر بھی ایمان پاؤ اسے نکال لاؤ۔ اللہ تعالیٰ ان گناہ گار لوگوں کے چہرے (جلانا) جہنم پر حرام کر دیں گے، پس جب اہل ایمان آئیں گے تو دیکھیں گے کہ بعض لوگوں کے قدموں تک آگ ہے اور بعض لوگوں کی نصف پنڈلیوں تک آگ پہنچی ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ جس جس کو پہچانیں گے، انھیں نکال کر لے جائیں گے۔ پھر اللہ کے حضور حاضر ہوں گے (اور دوبارہ سفارش کریں گے) اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اچھا جاؤ اور جس کے دل میں نصف دینار کے برابر بھی ایمان پاؤ اسے نکال لاؤ۔ چنانچہ یہ لوگ (جائیں گے اور) جسے جسے پہچانیں گے، اسے نکال لائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں گے (اور پھر سفارش کریں گے) اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اچھا جاؤ اور جس شخص کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان پاؤ اسے بھی نکال لاؤ۔ (چنانچہ یہ لوگ جائیں گے اور) جسے پہچانیں گے اسے نکال لائیں گے۔

"___ [1]

مرتکب کبیرہ کے لیے شفاعت کا جواز

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے: اور وہ (فرشتے) اس کی شفاعت کریں گے جس کی شفاعت سے وہ راضی ہوگا۔ (الانبیاء:28)

معتزلہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لیے شفاعت نہیں ہوگی کیونکہ اہل کبائر کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے امام فخر الدین رازی متوفی 606ھ ان کے رد میں فرماتے ہیں:

حضرت ابن عباسؓ اور ضحاکؒ نے لمن ارتضیٰ (جس سے اللہ راضی ہو) کی تفسیر میں کہا ہے یعنی جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہو۔

یہ آیت اہل کبائر کے لیے شفاعت کو ثابت کرنے کے لیے ہماری انتہائی قوی دلیل ہے، اور اس کی تقریر اس طرح ہے کہ جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہا اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا اور جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا وہ اس آیت کے عموم میں داخل ہو گیا اور اس کے لیے فرشتوں کی شفاعت جائز ہوگی، اسی طرح اس کے لیے نبیوں اور دیگر مقربین کی شفاعت بھی جائز ہو گئی۔ [2]

علامہ ابو عبداللہ قرطبی مالکیؒ متوفی 668ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ وہ مسلمان ہیں جنہوں نے لا الہ الا اللہ کی شہادت دی ہو، مجاہدؒ نے کہا اس

۱۔ [بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: (وجوہ یومئذ ناضرۃ، إلی ربہا ناظرۃ): ۷۴۳۹]

۲۔ (تفسیر کبیر ج ۸ ص 135-136 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت 1415ھ)

سے مراد ہر وہ مسلمان ہے جس سے اللہ راضی ہو اور فرشتے کل آخرت میں بھی شفاعت کریں گے اور دنیا میں بھی، کیونکہ وہ مومنین کے لیے استغفار کرتے ہیں اور زمین والوں کے لیے بھی جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی تصریح ہے۔ [1]

علامہ آلوسی نے بھی اس آیت سے اہل کبائر کے لیے شفاعت کے جواز پر استدلال کیا ہے اور حضرت ابن عباس کی روایت سے ثابت کیا ہے کہ لا الہ الا اللہ کہنے والوں سے اللہ تعالیٰ راضی ہے، علامہ ابوالحیان اندلسی نے بھی حضرت ابن عباس کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ [2]

﴿ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا
فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا
يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۪
وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَجَعَلْنَا
السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚۖ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾
وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِيْ

۱۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۷ ص 190 – 191، مطبوعہ دار الفکر بیروت 1415ھ)

۲۔ (روح المعانی جز ۱۷ ص 49، دار الفکر، 1417، البحر المحیط ج ۷ ص 423، دار الفکر، 1412ھ)

فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾

کیا کافروں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے جدا جدا کر دیا اور پانی سے تمام زندہ چیزیں پیدا کر دیں پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔(۳۰) اور ہم نے زمین میں اس لیے پہاڑ بنائے تا کہ وہ ان (لوگوں) کے ساتھ جھک نہ پڑے، اور اس میں کشادہ رستے بنائے تا کہ لوگ راستہ پا سکیں۔(۳۱) اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا اور یہ لوگ اس کی نشانیوں سے منہ پھیر رہے ہیں۔(۳۲) اور وہی اللہ ہے جس نے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو پیدا کیا (اور) سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔(۳۳)

آسمان اور زمین کے رتق اور فتق کی مفسرین نے حسب ذیل تفسیریں کی ہیں:

(۱) عبداللہ بن دینار نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے آسمان بند تھے۔ان سے بارش نہیں ہوئی تھی اور زمین بند تھی اس سے سبزہ نہیں اگتا تھا، پھر آسمان کو بارش سے کھول دیا گیا اور زمین کو سبزہ اگانے کے ذریعہ کھول دیا گیا، عطا اور مجاہد اور ضحاک سے بھی یہی مروی ہے۔

(۲) العوفی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ آسمان اور زمین پہلے ملے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو کھول کر الگ الگ اور متمیز کر دیا، حسنؒ، سعید بن جبیرؒ اور قتادہؒ سے بھی یہی روایت ہے۔

(۳) ابونیع نے مجاہدؒ سے روایت کیا ہے اللہ تعالیٰ نے زمین سے چھ زمینیں اور نکالیں تو وہ سات زمینیں ہوگئیں اور آسمان سے چھ آسمان اور نکالے تو وہ سات آسمان ہوگئے۔ [1]

یعنی زمین پر بڑے اور اونچے پہاڑوں کو کھڑا کر دیا، تاکہ زمین حرکت نہ کرے اور زمین پر کشادہ راستے بنا دیے، تاکہ لوگ ان پر چل کر حصول معاش اور دیگر مقاصد کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکیں، پھر آسمان کو زمین کے لیے چھت بنایا اور اسے زمین پر گرنے سے محفوظ رکھا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَاۗءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ)[آ:٦] "تو کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کیسے اسے بنایا اور اسے سجایا اور اس میں کوئی درزیں نہیں ہیں۔" آخری آیت میں فرمایا کہ اس نے رات اور دن، اور شمس وقمر کو پیدا کیا اور شمس وقمر میں سے ہر ایک کا ایک محدود دائرہ بنایا جس میں وہ اللہ کے حکم سے گردش کرتا رہتا ہے، کوئی ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتا اور اپنے محدود دائرے سے باہر نہیں ہوتا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ)[الانعام:٩٦] "صبح کو پھاڑ نکالنے والا ہے اور اس نے رات کو آرام اور سورج اور چاند کو حساب کا ذریعہ بنایا۔ یہ اس زبردست غالب، سب کچھ جاننے والے کا مقرر کردہ اندازہ ہے۔" اور فرمایا: (يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ)[فاطر:١٣] "وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اس نے

---

[1] ۔(زاد المسیر ج ٥ ص 348، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، 1415ھ)

سورج اور چاند کو مسخر کر دیا، ہر ایک ایک مقرر وقت تک چل رہا ہے۔ یہی اللہ تمہارا پروردگار ہے، اسی کی بادشاہی ہے اور جن کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے مالک نہیں۔" یہی حال دیگر تمام سیاروں کا بھی ہے، ہر ایک اپنے مخصوص دائرے میں گھومتا رہتا ہے اور سرمو بھی اس سے باہر نہیں ہوتا۔ ورنہ نظام عالم درہم برہم ہو جاتا، تمام سیارے آپس میں ٹکرا جاتے اور سارا عالم ہلاک و برباد ہو جاتا، یقیناً قدرتِ الٰہیہ کے یہ تمام مظاہر اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ ایک ہے اور صرف وہی عبادت کا مستحق ہے۔

﴿ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۭ اَفَاْىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝۳۴ كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝۳۵ ﴾

اور (اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)!) ہم نے آپ سے پہلے کسی انسان کو ہمیشہ زندہ نہیں رکھا۔ تو اگر آپ انتقال کر جائیں تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ ۔(۳۴) ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے، ہم تمہیں آزمانے کے لیے برائی اور بھلائی میں مبتلا کرتے ہیں اور تم سب ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔(۳۵)

شان نزول: (آیت)"۔ وما جعلنا لبشر من قبلک"۔ (الخ)

ابن منذرؒ نے ابن جریجؒ سے روایت کیا ہے کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آپ کے انتقال فرمانے کی خبر دی گئی آپ نے عرض کیا اے میرے پروردگار میرے بعد میری امت کی کون نگرانی کرے گا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، یعنی ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی انسان کے لیے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا۔

سیدنا ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے خطبہ میں فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا کہ چاہے تو دنیا رکھ لے اور چاہے تو اسے چن لے جو اللہ کے پاس ہے، تو اس بندے نے اسے پسند کیا جو اللہ کے پاس ہے۔" یہ سنتے ہی سیدنا ابوبکرؓ رونے لگے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس بزرگ آدمی کا رونا سمجھ میں نہیں آیا، اگر اللہ اپنے ایک بندے کو اس دنیا اور اپنی اخروی نعمتوں میں سے کسی ایک کو پسند کر لینے کا اختیار دیتا ہے اور وہ اللہ کے ہاں کی نعمتیں پسند کر لیتا ہے، تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ (لیکن دراصل ہم سمجھ نہ سکے تھے اور سیدنا ابوبکرؓ سمجھ گئے تھے، کیونکہ) بندے سے مراد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی تھے اور ابوبکرؓ ہم سے کہیں زیادہ سمجھ دار تھے۔ بہرحال! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سیدنا ابوبکرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: "اے ابوبکر! نہ رو، ساتھ دینے اور مال خرچ کرنے کے اعتبار سے جس قدر مجھ پر ابوبکر کے احسان ہیں کسی اور کے نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس امت میں سے اگر میں نے کسی کو اپنا جگری دوست بنانا ہوتا تو میں ابوبکرؓ ہی کو بناتا، لیکن اس کے بدلہ میں اسلام کا بھائی چارہ اور باہمی مودت کافی ہے۔ (سنو!) مسجد میں کھلنے والا ہر دروازہ بند کر دیا جائے، صرف ابوبکرؓ کا دروازہ کھلا رہے۔"[1]

۱۔ [بخاری، کتاب الصلاۃ، باب الخوخۃ والممر فی المسجد: ٤٦٦]

سیدہ عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی روح کو جب قبض کیا تو آپ کا سر اقدس میری گود میں تھا۔ [1]

سیدنا انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ شدت مرض کے زمانہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بے چینی بہت بڑھ گئی تھی، تو سیدہ فاطمہ (رض) نے کہا، آہ! ابا جان کو کتنی بے چینی ہے، اس پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے فرمایا: "(اے میری بیٹی!) آج کے بعد تمہارے باپ کی یہ بے چینی باقی نہیں رہے گی۔" [2]

سیدہ عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ اپنی رہائش سے، جو مقام سخ میں تھی، گھوڑے پر تشریف لائے اور گھوڑے سے اتر کر مسجد میں داخل ہو گئے، لوگوں سے کوئی بات نہ کی اور پھر میرے پاس چلے آئے (جہاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نعش مبارک تھی) وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گئے، اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دھاری دار حبری (یمنی) کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا۔ صدیق اکبرؓ نے آپ کے چہرہ مبارک سے کپڑا کو ہٹایا، آپ پر جھک گئے، آپ کو بوسہ دیا اور رونے لگ گئے اور کہا، میرے ماں باپ آپ پر قربان! اللہ کی قسم! اللہ آپ پر دو موتوں کو جمع نہیں فرمائے گا، جو موت آپ کے لیے لکھ دی گئی تھی وہ آپ پر وارد ہو چکی ہے۔ [3]

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا ابوبکرؓ جب آئے تو سیدنا عمرؓ لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے، انھوں نے فرمایا، عمر! بیٹھ جاؤ۔ عمرؓ نے بیٹھنے سے انکار کیا تو لوگ عمرؓ کو چھوڑ کر آپ کی طرف متوجہ

---

[1]۔ [بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ووفاتہ: ٤٤٤٦]

[2]۔ [بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ووفاتہ: ٤٤٦٢]

[3]۔ [بخاری، کتاب الجنائز، باب الدخول علی المیت بعد الموت۔۔الخ: ١٢٤١، ١٢٤٢]

ہو گئے، تو ابو بکرؓ نے فرمایا، اما بعد! جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عبادت کرتا تھا تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وفات پا گئے ہیں اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ کی ذات زندہ ہے، جس کو کبھی فنا نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ) [آل عمران: ۱٤٤] "اور نہیں ہے محمد مگر ایک رسول، بیشک اس سے پہلے کئی رسول گزر چکے تو کیا اگر وہ فوت ہو جائے، یا قتل کر دیا جائے تو تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے اور جو اپنی ایڑیوں پر پھر جائے تو وہ اللہ کو ہرگز کچھ بھی نقصان نہیں پہنچائے گا اور اللہ شکر کرنے والوں کو جلد جزا دے گا۔" سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کی قسم! یوں معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ یہ آیت نازل کی ہے اور جب ابو بکرؓ نے اس کی تلاوت فرمائی، تو لوگوں نے ابو بکرؓ سے اس آیت کو سیکھا اور جس جس نے بھی اس آیت کو سنا تو بے ساختہ اس کی تلاوت شروع کر دی، سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ عمرؓ نے فرمایا، اللہ کی قسم! مجھے اس وقت ہوش آیا جب میں نے ابو بکرؓ کو اس آیت کی تلاوت کرتے سنا، تو جس وقت میں نے انھیں تلاوت کرتے سنا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات ہو گئی ہے تو میں سکتے میں آ گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ میرے پاؤں میرا بوجھ نہیں اٹھا پائیں گے اور میں زمین پر گر جاؤں گا۔ [1]

سیدہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حالت صحت میں فرمایا کرتے تھے: "جب بھی کسی نبی کی روح قبض کی گئی تو پہلے اسے جنت میں اس کی قیام گاہ ضرور دکھا دی گئی، پھر اسے (دنیا

۱۔ [بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ووفاتہ: ٤٤٥٤]

اور آخرت کے درمیان) اختیار دیا گیا۔" پھر جب آپ بیمار ہوئے اور موت کا وقت قریب آ گیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سر مبارک میری گود میں تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر غشی طاری ہوگئی، پھر جب کچھ افاقہ ہوا، تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی نظریں چھت کی جانب پیوست کر دیں، پھر فرمایا: "اے میرے اللہ! میں تیری بلند رفاقت کو پسند کرتا ہوں۔" اس وقت میں نے (دل میں) کہا کہ اب آپ ہمارے ہاں رہنا پسند نہیں فرمائیں گے اور یہ راز اس وقت ہم پر کھلا کہ حالت صحت میں جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم سے ایسی گفتگو کرتے تھے، اس سے آپ کیا بتانا چاہتے تھے۔ [1]

یہ آیت مبارکہ کفار کے جواب کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ بدبخت آپ کے انتقال فرما جانے کے منتظر تھے اور اس کی خوشیاں مناتے تھے، موت تو ایسی چیز ہے کہ تم میں سے ہر جاندار موت کا مزہ چکھے گا اور ہم تمہیں سختی اور فراخی سے آزماتے ہیں، یہ دونوں باتیں اللہ کی طرف سے آزمائش ہیں اور مرنے کے بعد پھر تم سب ہماری طرف چلے آؤ گے اور ہم تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دیں گے۔

سیدنا انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کسی مومن پر ایک نیکی کے معاملہ میں بھی ظلم نہیں کرے گا، اسے اس کا بدلہ دنیا میں بھی دے گا اور آخرت میں بھی دے گا اور کافر کو اس کی ان نیکیوں کا بدلہ جو اس نے اللہ کے لیے کی ہوں گی، دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کے پاس کوئی نیکی نہیں ہوگی، جس کا بدلہ اسے دیا جائے۔" [2]

۱۔ [بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ووفاتہ: ۴۴۳۷]

۲۔ [مسلم، کتاب صفات المنافقین وأحکامھم، باب جزاء المؤمن بحسناتہ فی الدنیا والآخرۃ وتعجیل حسنات الکافر فی الدنیا: ۲۸۰۸]

﴿ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿٣٦﴾

اور جب کافر لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا صرف مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا یہی وہ آدمی ہے جو تمہارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے، حالانکہ وہ خود رحمٰن کے ذکر کا انکار کرتے ہیں۔

مقاتلؒ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوجہل کے متعلق نازل ہوئی ہے، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے پاس سے گزرے اس وقت اس کے پاس ابوسفیان بیٹھا ہوا تھا، ابوجہل نے ابوسفیان سے کہا یہ شخص بنوعبد مناف کا نبی ہے۔ ابوسفیان نے کہا کیا تم بنی عبد مناف کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہو، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کی باتیں سنیں تو ابوجہل سے فرمایا: میرا خیال ہے تم اس وقت تک باز نہیں آؤ گے جب تک کہ تم پر وہ وبال نازل نہ ہو جو تمہارے چچا ولید بن مغیرہ پر نازل ہوا ہے اور اے ابوسفیان تم نے جو کچھ کہا ہے وہ عار کی بنا پر کہا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ یہ لوگ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مذمت اس لیے کرتے ہیں کہ آپ ان کے معبودوں کا برائی کے ساتھ ذکر کرتے ہیں حالانکہ ان کے معبود کسی کو نقصان سے بچا سکتے ہیں نہ اس کو نفع پہنچا سکتے ہیں اور جبکہ یہ رحمٰن کی برائی کرتے ہیں حالانکہ رحمٰن منعم حقیقی ہے وہ ان کو زندگی دینے والا ہے اور وہی ان پر موت کو طاری کرے گا

اور اس سے بری بات اور کیا ہوگی کہ بے جان بتوں کی مذمت کا برا منایا جائے اور اس کے انتقام میں خالق حقیقی اور قادر و مختار کی مذمت کی جائے۔

وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ: سیدنا مسور بن مخرمہ اور سیدنا مروانؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مشرکوں کے درمیان صلح (حدیبیہ) کے معاہدہ کی تحریر سیدنا علیؓ نے لکھی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سیدنا علیؓ سے فرمایا: "بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھو۔" اس پر سہیل اعتراض کرتے ہوئے کہنے لگا، یہ جو رحمن ہے، اللہ کی قسم! میں تو نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟ آپ "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ" (اے اللہ! تیرے نام کے ساتھ) لکھیں، جس طرح آپ پہلے لکھا کرتے تھے۔ مسلمان کہنے لگے، اللہ کی قسم! ہم "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے بجائے کوئی دوسرا جملہ نہیں لکھیں گے، لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (سیدنا علیؓ سے) فرمایا: "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ" ہی لکھ دو۔"[1]

﴿ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ

---

[1] [بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد۔۔الخ: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲]

يُنْظَرُوْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ
سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۱﴾

آدمی بہت جلد باز بنایا گیا ہے۔ میں تم کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھاؤں گا، پس تم مجھ سے جلدی نہ کرو۔ (۳۷) وہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو (بتلاؤ) آخر وہ (عذاب کا) وعدہ کب آئے گا۔ (۳۸) کاش! ان کافروں کو اس وقت کا علم ہوتا جب وہ اپنے چہروں سے اور اپنی پیٹھوں سے آگ کو نہ روک سکیں گے اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ (۳۹) بلکہ وہ (قیامت) اچانک ان پر آجائے گی، اور ان کے ہوش کھودے گی پھر نہ وہ اسے روک سکیں گے اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔ (۴۰) اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا۔ پھر جن لوگوں نے ان میں سے مذاق اڑایا تھا، ان کو اسی عذاب نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ (۴۱)۔

شان نزول:

امام شوکانیؒ نے اس آیت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے کہا ہے یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی جس نے کہا تھا کہ اے اللہ اگر یہ پیغمبر تیری جانب سے سچا پیغمبر ہے تو ہم پر پتھروں کی

بارش برسادی جائے یا ہمارے اوپر دردناک عذاب لے آئیں۔

عجلت کا انسان کی فطرت میں شامل ہونا

اس آیت میں فرمایا: انسان جلد باز پیدا کیا گیا ہے، اس میں انسان سے کیا مراد ہے اس میں تین قول ہیں ایک یہ کہ اس سے جنس انسان مراد ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے حضرت آدم علیہ السلام مراد ہیں، اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے نصر بن حارث مراد ہے۔

اگر یہ مراد لیا جائے کہ اس آیت میں انسان سے جنس انسان مراد ہے تو پھر اس کی تقریر اس طرح ہے کفار عذب الٰہی کے رسول میں جلدی کرتے تھے وہ کہتے تھے اگر یہ نبی برحق ہیں اور ہم ان کی تکذیب کرنے میں جھوٹے ہیں تو چاہیے کہ فوراً ہم پر عذاب آئے، یا وہ یہ کہتے تھے کہ اگر یہ نبی سچے ہیں تو ان کو چاہیے کہ یہ بہت جلد ایسے معجزات لے کر آئیں جن کی وجہ سے ہم فوراً ایمان لے آئیں، یا جن نشانیوں کا ہم نے مطالبہ کیا ہے ان نشانیوں کو وہ جلد از جلد لے آئیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت آدم (علیہ السلام) ہیں:

امام محمد بن جریر طبریؒ متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

جب حضرت آدمؑ میں رح پھونکی گئی تو جب وہ روح ان کے سر میں پہنچی تو ان کو چھینک آئی، فرشتوں نے کہا آپ کہیے الحمد اللہ، حضرت آدم نے کہا الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا رحمک ربک، آپ کا رب آپ پر رحم کرے، پھر جب روح آپ کی آنکھوں میں پہنچی اور آپ نے جنت کے پھلوں کی طرف لپکے تو یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مصداق ہے کہ انسان جلد باز پیدا کیا گیا ہے۔

مجاہد نے اس کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ حضرت آدم کو تمام چیزوں کے پیدا کرنے کے بعد دن کے آخری

حصہ میں پیدا کیا گیا جب روح ان کی آنکھوں، زبان اور سر تک پہنچی اور ابھی سر کے نچلے حصہ میں نہیں پہنچی تھی تو انہوں نے کہا اے میرے رب میری خلقت کو غروب شمس سے پہلے مکمل کر دے۔ امام ابن جریر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے یعنی انسان کی فطرت اور خلقت میں عجلت رکھی گی ہے۔ (۱)

اور عطاءؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد نضر بن الحارث ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کفار جو عذاب کی طلب میں عجلت کرتے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عذاب کی وعید کی تکذیب کرتے تھے درحقیقت وہ عجلت نہیں کرتے تھے بلکہ عذاب کی وعید کو جھوٹا کہتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس اعتبار سے وہ زیادہ لائق مذمت ہیں، کیونکہ جو چیز معلوم ہوا اور پتا ہو کہ وہ کب حاصل ہوگی تو اس کی طلب میں عجلت رنا لائق مذمت ہے تو جس چیز کے وقوع کا وقت معلوم نہ ہو اس کی طلب میں عجلت کرنا تو زیادہ لائق مذمت ہے، نیز وہ عذاب کی طل میں جلدی کرتے تھے یا قیامت کی طل میں جلدی کرتے تھے، حالانکہ عذاب کا آنا یا قیامت کا آنا تو ان کی ہلاکت کا موجب ہے پس اس سے زیادہ لائق مذمت اور کیا چیز ہوگی کہ وہ اپنی ہلاکت کی طلب میں جلدی کرتے تھے۔

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قبیلہ عبدالقیس کے ایک آدمی اشجؓ سے فرمایا: "تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو اللہ پسند فرماتا ہے، ایک حلم و بردباری اور دوسری جلد بازی نہ کرنا۔" (۲)

سَاُورِیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنِ: یعنی اے کافرو! میں عنقریب تم کو اپنی نشانیاں دکھاؤں گا، ان نشانیوں ہی سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ حق کس طرف ہے، ہوسکتا ہے کہ تم ان نشانیوں کو دیکھ کر حق

۱۔ (جامع البیان جز17 ص35–37 ملخصاً مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

۲۔ [مسلم، کتاب ال إیمان، باب الأمر بال إیمان باللہ تعالیٰ ورسولہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وشرائع الدین۔۔الخ: ۱۷/۲۰]

قبول کرلو اور عذاب سے بچ جاؤ۔ لہٰذا تم مجھ سے عذاب کے جلدی بھیجنے کا مطالبہ نہ کرو۔ نشانیوں سے مراد مسلمانوں کی فتوحات اور کافروں کی پے در پے شکستیں ہیں، ارشاد فرمایا: (اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ)[الانبیاء:٤٤] "پھر کیا وہ نہیں دیکھتے کہ بیشک ہم زمین کو آتے ہیں، اسے اس کے کناروں سے گھٹاتے آتے ہیں، تو کیا وہی غالب آنے والے ہیں؟" اور فرمایا: (قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰی كَافِرَةٌ یَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ وَاللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَاءُ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ)[آل عمران:١٣] "یقیناً تمہارے لیے ان دو جماعتوں میں ایک نشانی تھی جو ایک دوسرے کے مقابلے میں آئیں، ایک جماعت اللہ کے راستے میں لڑتی تھی اور دوسری کافر تھی، یہ ان کو آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی مدد کے ساتھ قوت بخشتا ہے، بلاشبہ اس میں آنکھوں والوں کے لیے یقیناً بڑی عبرت ہے۔"

رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کفار عذاب اور قیامت کا بار بار مطالبہ کرتے تھے۔ عذاب کی ہولناکیوں کا ذکر کر کے کفار کو ان کے مطالبہ سے یہ کہہ کر ڈرایا اور روکا جا رہا ہے کہ اگر ان کو معلوم ہو جائے کہ رب ذوالجلال کا عتاب اور عذاب کس قدر سخت اور شدید تر ہوتا ہے تو یہ بھول کر بھی ایسا مطالبہ نہ کریں۔ انھیں پتہ ہونا چاہیے کہ جب ان پر رب ذوالجلال کا عذاب نازل ہوگا تو وہ اپنے آپ کو بچانا چاہیں تو ہرگز بچا نہیں سکیں گے۔ اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ سے پہلے انبیاء کے ساتھ بھی مذاق ہوتا رہا لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ جب مذاق کرنے والوں کو عذاب نے آلیا تو اس وقت انھیں کوئی پناہ دینے والا نہ تھا۔ جہاں تک جہنم کے عذاب کا معاملہ ہے اس کی آگ اس قدر سخت اور تیز

ہوگی کہ وہ ان کے چہروں اور پیٹھوں کو جھلس دے گی۔ اس وقت کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہوگا۔ اس دن عذاب ان پر اچانک ٹوٹ پڑے گا۔ ظالم بدحواس ہوجائیں گے نہ اسے ٹالنے کی ان کے پاس طاقت ہوگی اور نہ انھیں مہلت ملے گی۔

وقوع قیامت کے بارے میں ہر شک وشبہ کا ازالہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قیامت آئے گی اور ایسی اچانک آئے گی کہ وہ پھر کسی کو توبہ وعمل کی مہلت نہیں دے گی۔

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک سورج مغرب سے طلوع نہ ہو، تو جب وہ طلوع ہوگا اور لوگ اسے دیکھیں گے تو سب کے سب ایمان لے آئیں گے، لیکن یہ وقت وہ ہوگا کہ جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو، یا اس نے اپنے ایمان (کے زمانہ) میں کوئی نیکی نہ کی ہو تو اس کا ایمان لانا اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ قیامت (اس طرح اچانک) واقع ہوجائے گی کہ دو آدمیوں نے اپنا کپڑا پھیلایا ہوگا، لیکن وہ اس کی خرید وفروخت سے فارغ نہ ہوسکیں گے اور نہ اس تہ کرسکیں گے (کہ قیامت آجائے گی)۔ ایک آدمی اپنی اونٹنی کا دودھ لے کر لوٹے گا، لیکن وہ اسے پی نہ سکے گا کہ قیامت قائم ہوجائے گی اور (کوئی آدمی) اپنے حوض کی مرمت کر رہا ہوگا، لیکن اس میں سے پانی پلا نہ سکے گا کہ قیامت قائم ہوجائے گی اور یہ کہ کسی آدمی نے نوالہ منہ میں رکھنے کے لیے اٹھایا ہوگا، وہ اسے کھا نہ سکے گا کہ قیامت قائم ہوجائے گی۔"[1]

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دی جارہی ہے کہ مشرکین کے استہزا اور تکذیب سے بددل نہ

---

[1]۔ [بخاری، کتاب الرقاق، باب: ٦٥٠٦۔ مسلم، کتاب الفتن، باب قرب الساعۃ: ٢٩٥٤]

ہوں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، تجھ سے پہلے آنے والے پیغمبروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا گیا، بالآخر وہی عذاب ان پر الٹ پڑا، یعنی اس نے انھیں گھیر لیا، جس کا وہ استہزا و مذاق اڑایا کرتے تھے اور جس کا وقوع ان کے نزدیک محال تھا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا)[الأنعام:٣٤] "اور بلاشبہ یقیناً تجھ سے پہلے کئی رسول جھٹلائے گئے تو انھوں نے اس پر صبر کیا کہ وہ جھٹلائے گئے اور ایذا دیے گئے، یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آ گئی۔" رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تسلی کے ساتھ ساتھ کفار و مشرکین کے لیے اس میں وعید و تہدید بھی ہے۔

﴿ قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٤٢﴾ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿٤٣﴾ بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٤٤﴾ ﴾

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان سے پوچھیے کہ کہ رات اور دن میں (اللہ کے غضب) سے

تمہیں کون بچاتا ہے؟ اصل میں وہ اپنے رب کے ذکر سے منہ پھیرنے والے ہیں۔(۴۲) کیا ان لوگوں کے ہمارے سوا اور معبود بھی ہیں جو انہیں عذاب سے بچا لیں وہ نہ تو اپنی آپ مدد کر سکیں گے اور نہ انہیں ہماری طرف سے کوئی نصرت و حمایت حاصل ہوگی۔(۴۳) بلکہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو ساز و سامان دیا یہاں تک کہ اسی حال میں ان کی بڑی بڑی عمریں گزر گئیں تو کیا نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے آرہے ہیں تو کیا یہ غالب ہوں گے (۴۴)۔

منکرین حق کو مختلف الفاظ اور انداز میں انتباہ کیا جارہا ہے۔اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! استہزاء کرنے والوں سے پوچھیں کہ کون ہے؟ جو رات اور دن میں تمہاری نگرانی کرتا ہے، کیا الرّحمن کے سوا کوئی اور ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ رب رحمن کے سوا کوئی نہیں ہے جو اس سے بڑھ کر تم پر نرمی اور مہربانی کرنے والا ہو۔الرّحمن کی مہربانی کا نتیجہ ہے کہ تمہاری گستاخیوں کے باوجود دن، رات تمہاری نگرانی اور ضرورتیں پوری کرتا ہے۔اس کے باوجود لوگ رب کی ذات اور اس کے فرمان سے اعراض کرنے والے ہیں۔کیا ان کے اور بھی نگران اور حاجت روا ہیں؟ جو ان کی رات اور دن میں حفاظت کرتے ہیں ؟ وہ نہ اپنے آپ کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہماری پکڑ سے بچ سکتے ہیں۔پچھلی آیات میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اہل مکہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مشفق نام "الرحمن" کے منکر تھے۔اب انھیں الرّحمن کا تعارف کرایا گیا ہے کہ یہ الرّحمن کی شفقت اور مہربانی کا نتیجہ ہے کہ تمہاری گستاخیوں کے باوجود تمہیں ڈھیل

دیے ہوئے ہے ورنہ تم سے پہلے کتنے لوگ گزرے ہیں کہ ان میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ نے رات کے وقت اپنی گرفت میں لیا جو قیامت تک اسی عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ کچھ ایسے تھے جن کو دن کے وقت عذاب نے آلیا اور وہ ہمیشہ کے لیے مغضوب ٹھہرے۔ نہ وہ اپنے آپ کو بچا سکے اور نہ ان کے دستگیر اور مشکل کشا کوئی مدد کر سکے۔

اللہ تعالیٰ جب کسی فرد یا قوم کو طویل مدت تک اسباب عطا کرنے کے ساتھ ڈھیل دیتا ہے تو وہ اس کے شکر گزار بندے بننے کی بجائے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر ناراض نہیں جس وجہ سے دنیا کے اسباب و وسائل، اقتدار اور وقار دیئے جا رہا ہے۔ خاص طور پر یہ سلسلہ نسل در نسل جاری رہے تو نافرمان لوگوں کا یہ اعتقاد بن جاتا ہے کہ واقعی ہی ہم میں ایسے اوصاف ہیں جس بناء پر ہم وسائل، اقتدار اور وقار کا حق رکھتے ہیں۔ بعض دفعہ ایسے لوگوں پر اچانک برے حالات وارد کر دیے جاتے ہیں جن کا یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہی صورتحال اہل مکہ کی تھی۔ وہ کئی نسلوں سے بیت اللہ کی وجہ سے دنیا میں بالعموم اور عرب میں بالخصوص نہایت وقار کی زندگی بسر کر رہے تھے اور وسائل کے اعتبار سے بھی عرب کے قبائل میں متمول سمجھے جاتے تھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت قبول کر کے اپنے رب کے شکر گزار بندے بن جاتے لیکن وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت پر دن رات کمر بستہ ہو گئے۔ جوں جوں وہ مخالفت میں تیز ہو رہے تھے اسی رفتار سے دن بدن اسلام کا غلبہ اور مسلمانوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بالآخر وہ وقت بھی آیا جب ان کے لیے مکہ کی زمین تنگ ہو گئی اور انھیں اسلام کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔ اسی صورتحال کو یہاں بیان کی گیا ہے کہ ہم نے انھیں اور ان کے باپ دادا کو فائدہ دیا اور پھر طویل مدت تک انھیں مہلت دی۔ یہ مدت ان کے لیے فائدہ مند ہونے

کی بجائے وبال ثابت ہوئی۔ کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان کے لیے تنگ ہوتی جارہی ہے حالانکہ یہ اپنے آپ کو غالب سمجھ رہے۔ ارضیات کے سائنسدانوں کی تحقیق یہ ہے کہ زمین رقبہ کے لحاظ سے بھی دن بدن تنگ ہورہی ہے۔ (اللہ اعلم)

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۡ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾ ﴾

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ فرما دیجیے بات یہی ہے کہ میں تمہیں وحی کے ذریعہ (عذاب الٰہی سے) ڈراتا ہوں اور بہرے پکار کو نہیں سنتے جب کہ وہ ڈرائے جاتے ہیں۔ (۴۵) اور اگر آپ کے رب کا معمولی سا عذاب انہیں آلے تو پکار اٹھیں کہ ہائے ہماری کمبختی، بیشک ہم ہی ظالم تھے۔ (۴۶) اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھیں گے، پھر کسی جان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا اگر کوئی (عمل)

رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو ہم اسے بھی سامنے لے آئیں گے اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔(۴۷)

سابقہ آیت کریمہ میں قریش کو جو وارننگ دی گئی ہے اور ایک نشانی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ اے پیغمبر ان پر یہ بات واضح کر دیجیے کہ اسلام کے عمومی غلبے اور تمہاری شکست اور نامرادی کی جو پیشگوئی کی گئی ہے اس کو محض مفروضہ نہ سمجھو بلکہ یہ بات مجھ پر اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعے نازل کی گئی ہے اور تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی وحی ہر خطا سے پاک ہیں۔اس لیے اس پیشگوئی کے بروئے کار آنے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں لیکن تم جس طرح اپنی عادت کے مطابق اسے مذاق میں اڑا رہے ہو یہ بھی ایسی بات نہیں جو سمجھ میں آنے والی نہ ہو کیونکہ مسلسل حق سے انکار کے باعث تمہاری عقلیں ماؤف ہوگئی ہیں۔تمہیں بالکل سامنے کی بات بھی مشکل سے سمجھ میں آتی ہے اور جب کسی کی عقل جواب دے جائے یا وہ عقل سے بے بہرہ ہوجائے تو پھر اس کی حیثیت کانوں سے بہرے جیسے شخص کی ہوتی ہے کہ اسے خطرے کے وقت ہزار پکارا جائے وہ کبھی اس پکار کو نہیں سنتا اور بالآخر خطرے کا شکار ہوکر رہتا ہے۔میں بھی اپنی پیغمبرانہ فطرت کے مطابق تمہیں شب و روز خبردار کررہا ہوں لیکن تم بہروں کی طرح میری بات سن کے نہیں دیتے تو میں اس پر سوائے تأسف کے اظہار کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔قرآن میں مذکور وعدوں اور وعیدوں سے فائدہ اٹھانے کی تمہارے اندر اہلیت ہی نہیں ہے۔شرک اور جھوٹے معبودوں سے محبت نے تمہارے دل کی آنکھوں کو اندھا کر رکھا ہے۔اس لیے تم لوگ میری اور قرآن کی تکذیب کرتے ہو اور کسی دھمکی کی پروا نہیں کرتے۔تمہاری بدعقیدگی کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی ہلکی سی تکلیف بھی تمہیں لاحق ہوتی ہے تو فوراً واویلا کرنے لگتے ہو اور

بتوں کو چھوڑ کر اللہ کے حضور اپنے گناہوں کا برملا اعتراف کرنے لگتے ہو۔

یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کے اعمال کا پورے عدل وانصاف کے ساتھ وزن کرے گا، کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا اور اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی کسی کا کوئی عمل ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے سامنے لائے گا اور اس کے دیگر اعمال کے ساتھ اس کا وزن کرے گا اور اللہ سے بڑھ کر کون حساب لینے والا ہے؟ اس لیے کہ اس سے زیادہ بندوں کے اچھے اور برے اعمال کو کون جانتا ہے؟ ارشاد فرمایا: (فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ) [الزلزال: ۷، ۸] "تو جو شخص ایک ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔ اور جو شخص ایک ذرہ برابر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔" اور فرمایا: (يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ) [لقمان: ۱۶] "اے میرے چھوٹے بیٹے! بیشک کوئی چیز اگر رائی کے دانے کے وزن کی ہو، پس کسی چٹان میں ہو، یا آسمانوں میں، یا زمین میں تو اسے اللہ لے آئے گا، بلاشبہ اللہ بڑا باریک بین، پوری خبر رکھنے والا ہے۔" اور فرمایا: (فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۰۲ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ) [المؤمنون: ۱۰۲، ۱۰۳] "پھر وہ شخص جس کے پلڑے بھاری ہو گئے تو وہی لوگ کامیاب ہیں۔ اور وہ شخص جس کے پلڑے ہلکے ہو گئے تو وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنی جانوں کا نقصان کیا، جہنم ہی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔"

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "دو کلمے ایسے ہیں جو رحمن کو بہت ہی محبوب ہیں، زبان پر بڑے ہلکے (یعنی انھیں پڑھنا بڑا آسان) اور (قیامت کے دن)

اعمال کے ترازو میں بڑے وزنی ہوں گے (اور وہ یہ ہیں): (سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ، سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ)۔ [1]

سیدنا عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "میری امت کے ایک شخص کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اہل محشر کے سامنے اپنے پاس بلائے گا اور (اس کے گناہوں کے) ایک کم ایک سو رجسٹر اس کے سامنے کھول دے گا، ہر رجسٹر اتنا بڑا ہوگا کہ انتہائے نگاہ تک پھیلا ہوا ہوگا، پھر اس سے اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ کیا تجھے اپنے کیے ہوئے ان گناہوں میں سے کسی سے انکار ہے؟ میری طرف سے جو محافظ فرشتے تیرے اعمال لکھنے پر مقرر تھے انھوں نے تجھ پر کوئی ظلم تو نہیں کیا؟ یہ جواب دے گا کہ اے اللہ! نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اچھا تیرے پاس کوئی عذر ہے یا کوئی نیکی؟ وہ گھبرایا ہوا کہے گا کہ اے اللہ! کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کیوں نہیں! بیشک تیری ایک نیکی ہمارے پاس ہے اور آج تجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اب ایک چھوٹا سا کاغذ نکالا جائے گا جس میں (اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ) لکھا ہوا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اسے پیش کرو۔ وہ کہے گا اے اللہ! اس کاغذ کی ان رجسٹروں کے مقابلے میں کیا حیثیت ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تجھ پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اب تمام کے تمام رجسٹر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اور وہ کاغذ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا، تو (بڑے بڑے) رجسٹروں والا پلڑا ہلکا ہو جائے گا اور ایک چھوٹے سے کاغذ والا پلڑا وزنی ہو جائے گا اور اللہ رحمن ورحیم کے نام سے کوئی چیز وزنی نہیں ہوگی۔" [2]

---

[1]۔ [بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: (ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ): ۷۵۶۳۔ مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل التھلیل والتسبیح والدعاء: ۲۶۹۴]

[2]۔ [مسند أحمد: ۲/ ۲۱۳، ح: ۷۰۱۰۔ ترمذی، کتاب الإیمان، باب ماجاء فیمن یموت وھو یشھد أن لا إلٰہ إلا اللہ: ۲۶۳۹]

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا
لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ
السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ
مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾ ﴾

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون (علیہ السلام) کو حق اور باطل میں فرق کر دینے والی روشنی اور نصیحت کی کتاب عطا کی پرہیزگاروں کیلئے۔(۴۸) ان کے لیے جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور وہ قیامت کا بھی خوف رکھتے ہیں۔(۴۹) اور یہ (قرآن) ایک برکت والا ذکر ہے جس کو ہم نے نازل فرمایا ہے، پھر کیا تم اس کا انکار کرتے ہو۔(۵۰)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرقان کا ذکر فرمایا ہے اور اس کی تفسیر میں مفسرین کے تین قول ہیں:
ایک قول یہ ہے کہ فقران سے مراد تورات ہے کیونکہ تورات حق اور باطل میں فرق کرتی تھی اور ضیاء اور روشنی بھی تھی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات اور احکام شرعیہ کی ہدایت کے رساتوں کو بہت وضاحت اور تفصیل سے بیان کرتی تھی اور ان کے پیش آمدہ مسائل اور دین اور دنیا کی ضرورتوں میں مکمل نصیحت کرتی تھی اور اس میں ان کے شرف اور فضیلت کا پورا بیان تھا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ فرقان سے مراد تورات نہیں ہے کیونکہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ فرقان سے مراد وہ مدد ہے جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو دی گئی تھی، جیسا کہ جنگ بدر میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جو مدد کی گئی تھی اس کو بھی یوم الفرقان فرمایا:

وما انزلنا علی عبدنا یوم الفرقان یوم التقی الجمعن (الانفعال: 41) اور ہم نے اپنے بندہ پر فرقان کے دن (حق اور باطل میں فرق کے دن) جو نازل کیا جس دن دو فوجوں میں مقابلہ ہوا تھا۔

یعنی جنگ بدر کے دن جب اسلام اور کفر و شرک کے درمیان پہلا معرکہ برپا ہوا تھا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ فرقان سے مراد وہ برہان ہے جس سے دین حق اور ادیان باطلہ میں فرق تھا۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ چوتھا قول یہ ہے اس سے مراد سمندر کا چیرنا ہے جب سمندر کو چیر کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے بارہ راستے بنائے گئے تھے۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔

پانچواں قول یہ ہے کہ اس سے مراد بنی اسرائیل کے شبہات کو زائل کرنا ہے۔ یہ محمد بن کعب کا قول ہے۔

قیامت کبری اور قیامت صغری دو نام ہیں لیکن حقیقت دونوں کی ایک ہی ہے قیامت کبری تو وہی ہے جو بہت سے ناموں سے قرآن کریم میں موسوم کی گئی ہے اور قیامت صغری موت کو کہا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس دنیوی زندگی کی موت آجانے کے بعد دوبارہ اس زندگی میں آنے کا کوئی تصور موجود نہیں اور نہ ہی ایسا ممکن ہے لہٰذا جو شخص اس دنیوی زندگی کے دن پورے کر کے یہاں سے رخصت ہو گیا گویا اس کو وہ قیامت ہی آ گئی جس کو قیامت کبری کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

آخری آیت میں مخاطب مشرکین مکہ ہیں جو تورات کو آسمانی کتاب سمجھتے تھے کہ جب تم اس کے کلام الٰہی ہونے کے معترف ہو تو اس مبارک کتاب کا کیوں انکار کرتے ہو، جسے ہم نے تورات کی طرح اپنے

رسول محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کیا ہے؟ تورات کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: (اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ) [المائدۃ: ٤٤] "بیشک ہم نے تورات اتاری، جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔" اور فرمایا: (قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَاۗؤُكُمْ قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ) [الانعام: ٩٢] "کہہ وہ کتاب کس نے اتاری جو موسیٰ لے کر آیا؟ جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی، تم اسے چند ورق بناتے ہو، جنھیں ظاہر کرتے ہو اور بہت سے چھپاتے ہو اور تمھیں وہ علم دیا گیا جو نہ تم نے جانا اور نہ تمہارے باپ دادا نے۔ کہہ اللہ نے، پھر انھیں چھوڑ دے، اپنی (فضول) بحث میں کھیلتے رہیں۔"

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝٥١ۚ
اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا
عٰكِفُوْنَ ۝٥٢ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَاۗءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝٥٣ قَالَ لَقَدْ
كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝٥٤ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا
بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ۝٥٥ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۠ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ

الشّٰهِدِيْنَ ﴿٥٦﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا
مُدْبِرِيْنَ ﴿٥٧﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ
يَرْجِعُوْنَ ﴿٥٨﴾ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥٩﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ
اِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٠﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ
يَشْهَدُوْنَ ﴿٦١﴾

اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو پہلے ہی سے ہدایت دی تھی اور ہم ان سے خوب باخبر تھے۔(۵۱) (وہ وقت یاد کرو) جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا یہ کیا مورتیاں ہیں جن کے سامنے تم جھکے ہوئے ہو۔ (۵۲) انہوں نے جواب دیا ہم نے اپنے باپ دادا کو انہی کی عبادت کرتے ہوئے پایا تھا۔(۵۳) ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ تم اور تمہارے باپ دادا کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔(۵۴) انہوں نے کہا کیا تم واقعی ہمارے پاس دین حق لے کر آئے ہو، یا یونہی مذاق کر رہے ہیں ہو۔(۵۵) ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا

بلکہ تمہارا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اور میں اس (توحید) پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔(۵۶) اور اللہ کی قسم البتہ میں ضرور تمہارے بتوں کے ساتھ ایک چال چلوں گا جب تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے۔(۵۷) پس حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا مگر ان کے ایک بڑے بت کے تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔(۵۸) وہ لوگ کہنے لگے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ معاملہ کس نے کیا؟ وہ تو بڑا ہی ظالم ہے۔(۵۹) کچھ لوگوں نے کہا ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے اسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔(۶۰) لوگوں نے کہا، اسے (یعنی ابراہیم کو) لوگوں کے سامنے پکڑ کر لاؤ تاکہ سب گواہ رہیں۔(۶۱)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اللہ کے خلیل اور عظیم پیغمبر ہیں۔ جن کا تذکرہ یوں شروع کیا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو پہلے سے ہی ہدایت سے سرفراز فرمایا اور ہم ابراہیم کو جاننے والے ہیں۔ یہ مسلّمہ حقیقت اور ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے ماضی، حال اور مستقبل کو جاننے والا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر مبعوث فرمائے ان کی ابتدا ہی سے خصوصی رہنمائی فرمائی تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا کہ ہم نے ابراہیم کو پہلے سے ہی ہدایت سے سرفراز فرمایا اور ہم انھیں اچھی طرح جاننے والے تھے۔ میری سمجھ میں اس تعارف کی وجہ یہ

معلوم ہوتی ہے کہ ابراہیم نے ستارہ پرستوں کو عقیدہ توحید سمجھانے کے لیے استعارہ اور تمثیل کی زبان استعمال کی تھی۔ جس وجہ سے یہ شبہہ ہوسکتا تھا کہ شاید ابراہیم (علیہ السلام) بھی کچھ عرصہ شرک میں مبتلا رہے ہوں۔ اس لیے ضروری سمجھا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کا اس طرح تعارف کروایا جائے تاکہ ابراہیم (علیہ السلام) کا مشرکین کے ساتھ جو مکالمہ ہوا اس سے کسی کو شبہ نہ ہو پائے۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے پہلے دن یہ کہہ کر ستارہ پرستوں کے عقیدہ پر ضرب لگائی کہ دیکھو یہ ستارہ میرا رب ہے لیکن جب وہ غائب ہوگیا تو فرمایا کہ غائب ہونے والوں کو میں پسند نہیں کرتا۔ دوسرے دن انھوں نے چمکتے ہوئے چاند کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا یہ میرا رب ہوسکتا ہے لیکن جب چاند چھپ گیا تو فرمایا کہ اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی ہوتی تو میں گمراہ ہونے والوں میں سے ہوجاتا۔ تیسرے دن جگمگاتا ہوا سورج دیکھا تو فرمایا کہ یہ میرا سب سے بڑا رب ہوسکتا ہے لیکن جب سورج غروب ہوگیا تو فرمایا کہ اے میری قوم جو تم شرک کرتے ہو میں اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔ میں نے اپنے چہرے کو مکمل طور پر اس ذات کے حوالے کیا ہوا ہے جو زمین و آسمان کو پیدا کرنے والا ہے۔ میں اپنے عقیدہ میں بالکل یکسو ہوں میرا مشرکوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ہے وہ رشد و ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو عطا فرمائی تھی۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے اس لیے بھی رشد کا لفظ استعمال کیا گیا کیونکہ جس ماحول بالخصوص جس گھر میں انھوں نے تربیت پائی تھی وہ شرک کا مرکز اور ان کا باپ شرکیہ عقیدے کا بہت بڑا ترجمان تھا۔ لیکن اس کے باوجود ابراہیم (علیہ السلام) شرک سے بچے رہے۔

ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ آزر، اس کی قوم، نمرود اور اس کے ماننے والوں سے پوچھا کہ

اینٹ، پتھر اور لکڑی کے بنے ان حقیر اور بے جان مجسّموں کی کیا حقیقت ہے کہ تم لوگ ان کی عبادت کرتے ہو؟ نہ یہ نفع پہنچاتے ہیں اور نہ نقصان، یہ خود تمہارے ہی ہاتھوں کے بنے ہوئے بے جان مجسّمے ہیں، کس عقل کا تقاضا ہے کہ ان کی عبادت کی جائے؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے آباواجداد ان کی عبادت کرتے آئے ہیں، اس لیے ہم بھی ان کی عبادت کرتے ہیں اور آئندہ بھی کریں گے۔ آباواجداد کی اندھی اور جاہلانہ تقلید کے علاوہ ان کے پاس اپنے مشرکانہ اعمال کی کوئی عقلی دلیل نہیں تھی۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا، تم اور تمہارے باپ دادا سبھی کھلی گمراہی میں بھٹکتے رہے ہیں؟ کیا اس سے بھی بڑھ کر بے عقلی ہوسکتی ہے کہ انسان ایسے بتوں کی پرستش کرے جو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان؟ جو نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ سن سکتے ہیں، کافروں نے ان کی یہ بات سن کر کہا کہ اے ابراہیم! جو کچھ تم ہم سے کہہ رہے ہو سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہے ہو، یا یونہی ہم سے مذاق کررہے ہو اور تمہاری گفتگو کا کیا مطلب ہے؟ تو ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنی داعیانہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں اپنی گفتگو میں بالکل سنجیدہ ہوں اور تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، جس نے انھیں پیدا کیا ہے اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اس کے سوا نہ کوئی معبود ہے اور نہ کوئی رب۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ جب قوم ابراہیم کی عید کا دن آیا تو انھوں نے ابراہیم (علیہ السلام) سے کہا کہ اگر تم ہمارے ساتھ عید کی خوشیوں میں شریک ہوگے تو ہمارا دین تمہیں پسند آئے گا۔ ابراہیم نے معذرت کرلی اور دل میں کہا کہ اگر تم دعوت توحید کو میری زبان سے سن کر قبول نہیں کرتے ہو، تو اب میں تمہیں عملی طور پر سمجھاؤں گا کہ ان بتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور جب تم ان کی پوجا کرکے اپنے گھروں کو چلے جاؤ گے تو میں اس "منکر" کو اپنے ہاتھ سے بدلنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ ابراہیم (علیہ السلام) نے کلہاڑے سے تمام

بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ صرف بڑے بت کو چھوڑ دیا اور اس کی گردن میں کلہاڑا لٹکا دیا، تا کہ جب لوگ واپس آئیں اور اپنے معبودوں کا یہ حال دیکھیں اور بڑے بت کی گردن میں کلہاڑا لٹکتا ہوا دیکھیں تو اس سے کچھ پوچھیں اور جب وہ اپنی زبان حال سے اپنی عاجزی اور درماندگی کا اعلان کرے تو مشرکوں کو کچھ تو سمجھ میں آئے کہ ان کے چھوٹے معبود تو کیا، بڑا معبود بھی کتنا عاجز و بے بس ہے کہ انھیں کچھ بتا بھی نہیں سکتا، تو پھر یہ معبود کیسے ہو سکتے ہیں؟ واپس آنے کے بعد جب انھوں نے بتوں کا یہ حال دیکھا تو کہنے لگے کہ جس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ ایسی اہانت آمیز حرکت کی ہے، اس نے بہت ہی برا کام کیا ہے کہ جن بتوں کی ہم پرستش کرتے تھے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں، تو انھی میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ ایک نوجوان جس کا نام ابراہیم ہے، ہمارے معبودوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کرتے ہوئے سنا گیا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ پھر اسے ہم سب کے سامنے لایا جائے اور ایسی عبرتناک سزا دی جائے کہ دوسروں کے لیے نشان عبرت بن جائے۔

اس کی تفصیل امام ابن جریرؒ نے اس طرح بیان کی ہے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کے والد نے کہا اے ابراہیم! ہماری ایک عید ہے اگر تم ہمارے ساتھ اس دن جاؤ تو تم کو ہمارا دین اچھا لگے گا۔ جب عید کا دن آیا تو وہ سب روانہ ہوئے جب کچھ راستہ طے ہو گیا تو حضرت ابراہیم علیہا السلام گھر گئے اور فرمایا میں بیمار ہوں اور میرے پیر میں تکلیف ہے۔ ان لوگوں نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو چھوڑ دیا۔ جب وہ چلے گئے تو انہوں نے زور سے کہا اور اللہ کی قسم! تمہارے پیٹھ پھیر کر جانے کے بعد میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک خفیہ تدبیر کروں گا۔ ان کی قوم کے کچھ لوگوں نے اس بات کو سن لیا تھا پھر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) ان کے بت کدہ کی طرف

گئے، اس بت کدہ میں ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس کے سامنے ایک بہت بڑا بت نصب تھا اور اس کے ساتھ بہت چھوٹے چھوٹے بت رکھے ہوئے تھے اور ان بتوں کے سامنے کھانا رکھا ہوا تھا۔ ان کا پروگرام تھا کہ وہ اپنی عید یا میلے سے واپس آ کر اس طعام کو کھائیں گے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ان بتوں کے سامنے کھانا رکھا ہوا دیکھا تو فرمایا:

(فراغ الی الھتھم فقال الا تاکلون مالکم لا تنطقون فراغ علیھم ضربا بالیمین (الصفت: 91-93) آپ نے ان بتوں کے پاس جا کر فرمایا تم کھاتے کیوں نہیں؟ تم کو کیا ہوا تم بات کیوں نہیں کرتے؟ پھر ان کی شرف مڑ کر ان کو دائیں ہاتھ سے مارنا شروع کر دیا۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کلہاڑے سے تمام بتوں کو توڑنا شروع کر دیا اور تمام بت ٹوٹ کر انکے قدموں میں گر گئے پھر انہوں نے کلہاڑا اٹھا کر سب سے بڑے بت کی گردن پر رکھ دیا پھر جب ان کی قوم میلے سے واپس آئی تو کھانا کھانے کے لیے اپنے بت کدہ میں گئی۔ وہاں جا کر انہوں نے دیکھا کہ بڑے بت کے سوا ان کے سارے خدا ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے، اس وقت انہوں نے کہا ہمارے معبودوں کے ساتھ جس نے بھی یہ کارروائی کی ہے، وہ بیشک ضرور ظالموں میں سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک نوجوان کو ان (بتوں) کا ذکر کرتے ہوئے سنا تھا، اس کو ابراہیم کہا جاتا ہے۔ [1]

﴿ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٢﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾

ا۔ (جامع البیان جز 17 ص 51، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۙ﴿۶۴﴾ ثُمَّ
نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾
قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا
يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا
تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

انھوں نے پوچھا کہ اے ابراہیم، کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے۔(۶۲) ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا نہیں بلکہ یہ حرکت ان کے اس بڑے بت نے کی ہے اگر یہ بت بول سکتے ہوں تو خود ان ہی سے تم دریافت کرلو۔(۶۳) یہ سن کر) وہ لوگ اپنے جی میں سوچنے لگے، پھر (آپس میں) کہنے لگے، بیشک تم خود ہی ظالم ہو۔(۶۴) پھر وہ (شرمندہ ہوکر) سر جھکا کر کہنے لگے (اے ابراہیم (علیہ السلام) بیشک تم خوب جانتے ہو کہ یہ (بت) بولتے نہیں۔(۶۵) ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا پھر کیا تم لوگ اللہ کے سوا ان چیزوں کی پوجا کرتے ہو جو نہ تو تمہیں کچھ نفع دے سکیں اور نہ کوئی نقصان پہنچا سکیں۔(۶۶) تُف ہے تم پر بھی اور

ان چیزوں پر بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے۔

(٦٧)

معاملہ کی تحقیقات

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اپنی خداداد عقل سے اچھی طرح پہچان گئے تھے کہ جتنی کائنات ہماری نظر کے سامنے ہے ان میں سے کوئی چیز قابل نہیں کہ انسان کی معبود بن سکے بت تو کسی گنتی ہی میں نہیں خود انسان میں البتہ ایسی جلیل القدر ہستیاں ہیں جو اپنے اندر بڑے بڑے اوصاف رکھتی ہیں لیکن وہ بھی انسان کے معبود ہونے کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتی انسان کا معبود تو ہر حالت سے بالاتر اور انسان کا کامل حاجت روا ہونا چاہیے اور وہ وہی ہے جس نے کائنات کو پیدا کیا اور ہر ایک کو پالتا اور ہر ایک کی خبر گیری کرتا ہے بتوں کی بے بسی زبان سے ظاہر کرنے کے بعد اب انھوں نے ان کو توڑ پھوڑ کر ہاتھ سے بھی ان کی بیچارگی ظاہر کر دی جب لوگوں نے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا تو انھوں نے کہا اصل معاملہ یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ اس سب سے بڑے بت نے جلال میں آ کر چھوٹوں کو نیست و نابود کر دیا ان زخمی بتوں سے پوچھ لو یہ صاف صاف حال بتا دیں گے۔

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا : سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ابراہیم (علیہ السلام) نے تین مواقع کے سوا کبھی جھوٹ نہیں کہا۔ ان میں سے دو اللہ کے لیے تھے (جن سے اللہ کے دین یعنی توحید کی حقانیت ثابت کرنا مقصود تھا)، ایک آپ کا یہ فرمانا: (اِنِّيْ سَقِيْمٌ) [الصافات: ٨٩] "میں بیمار ہوں" اور یہ فرمانا: (بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا) [

الأنبیاء: ٦٣] "یہ کام ان کے بڑے (سردار بت) نے کیا ہے۔" (تیسرا واقعہ یہ ہے کہ) ایک دن ابراہیم (علیہ السلام) اور سارہ سفر میں تھے کہ ایک ظالم بادشاہ کے شہر (مصر) سے گزر ہوا۔ اسے بتایا گیا، یہاں ایک مرد آیا ہے، جس کے ساتھ ایک حسین ترین خاتون ہے۔ اس نے آپ کو بلا بھیجا اور پوچھا، یہ عورت کون ہے؟ آپ نے فرمایا: "میری بہن ہے۔" پھر آپ نے سارہ کے پاس واپس جا کر فرمایا: "سارہ! روئے زمین پر میرے اور تیرے سوا کوئی مومن موجود نہیں، اس نے مجھ سے پوچھا تھا تو میں نے اسے بتایا ہے کہ تو میری بہن ہے، اب میری بات جھٹلا نہ دینا۔" بادشاہ نے سارہ کو طلب کر لیا۔ جب آپ اس کے سامنے پیش ہوئیں، تو اس نے ہاتھ بڑھا کر آپ کو چھونا چاہا تو اسے پکڑ لیا گیا (یعنی حرکت نہ کر سکا) اس نے کہا، میرے لیے اللہ سے دعا کر، میں تجھے تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ انھوں نے دعا کی تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ اس نے پھر آپ کو چھونا چاہا تو پہلے سے زیادہ سخت گرفت میں آ گیا۔ اس نے (پھر) کہا، میرے لیے اللہ سے دعا کیجیے، میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔ آپ نے دعا کی تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ تب اس نے اپنے ایک دربان کو بلا کر کہا، تم میرے پاس کوئی انسان نہیں لائے، تم تو کوئی جن پکڑ لائے ہو۔ اس نے ان کی خدمت کے لیے سیدہ ہاجرہ کو پیش کر دیا۔ جب سیدہ سارہ واپس آئیں تو سیدنا ابراہیم (علیہ السلام) کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے اشارے سے پوچھا: "کیا ہوا؟" سیدہ سارہ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے کافر کی سازش کو ناکام کر دیا اور خدمت کے لیے ہاجرہ دے دی۔"[1]

أُفٍّ لَّكُمْ ۔۔ اظہارِ بیزاری اور نہایت شدید نفرت و کراہت کا کلمہ ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے جب دیکھا کہ کوئی دلیل ان پر کارگر نہیں ہو رہی۔ اور اپنی جہالت اور گمراہی پر کوئی دلیل بھی ان کے

---

[1] [بخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ: (واتخذ اللہ إبراہیم خلیلاً): ٣٣٥٨۔ مسلم، کتاب الفضائل، باب من فضائل إبراہیم الخلیل (علیہ السلام): ٢٣٧١]

پاس نہیں تو آپ (علیہ السلام) نے شدید نفرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ تُف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر۔ ایسا لگتا ہے کہ تم عقل سے بالکل ہی پیدل ہو۔ اگر تم میں ذرا بھی عقل ہوتی تو تم اس بات کو ضرور سمجھ لیتے کہ پتھر کی مورتیاں بھی کیا پرستش کے قابل ہوتی ہیں۔ جن کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی حفاظت تو کیا کرتیں اپنی بپتا بھی کسی کو نہ سنا سکیں تو ایسی بیکار چیزیں کسی جگہ کا بوجھ تو ہو سکتی ہیں عزت و افتخار کے منصب کی اہل نہیں ہو سکتیں۔

﴿ قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ﴿٦٨﴾ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿٦٩﴾ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ﴿٧٠﴾ وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ ﴿٧١﴾ ﴾

انہوں نے کہا: ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو اگر تم (کچھ) کرنے والے ہو۔ (٦٨) ہم نے حکم دیا کہ اے آگ! تو ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی والی بن جا۔ (٦٩) انہوں نے ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا سو ہم نے ان کو ناکام کر دیا۔ (٧٠) اور ہم ابراہیم (علیہ السلام) کو اور لوط (علیہ السلام) کو بچا کر اس سرزمین کی طرف لے

آئے، جس میں ہم نے دنیا جہان والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں۔(۷۱)

ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے والے کا مصداق

جب وہ لوگ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دلائل سے لاجواب ہو گئے تو انہوں نے کہا، اس کو آگ میں جلا دو۔ امام فخر الدین محمد بن عمر رازیؒ متوفی 606ھ لکھتے ہیں:

قرآن مجید میں یہ ذکر نہیں ہے کہ حضرت حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں ڈالنے کا حکم کس نے دیا۔ مشہور یہ ہے کہ یہ حکم دینے والا نمرود بن کنعان بن سنجاریب بن مروذ بن کوش بن حام بن نوح تھا۔ حضرت ابن عمرؓ نے یہ کہا یہ شخص اعراب فارس کے قبیلہ کرد سے تھا، وہب بن منبہ نے شعیب الجبائی سے نقل کیا ہے اس کا نام ہیرین تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین میں دھنسا دیا سو وہ قیامت تک زمین میں دھنستا رہے گا۔ [1]

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں ڈالنے کا واقعہ

امام عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزیؒ متوفی 597ھ لکھتے ہیں:

اہل تفسیر نے ذکر کیا ہے کہ نمرود اور اس کے کارندوں نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو ایک گھر میں قید کر دیا پھر ایک بلند پہاڑ کے دامن میں ان کے لیے ایک قلعہ بنایا، جس کی دیواریں ۶۰ ذراع (نوے فٹ) اونچی تھیں اور بادشاہ نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ ابراہیم کو جلانے کے لیے لکڑیاں جمع کرو اور اس کام کو کرنے میں کوئی بچہ یا بوڑھا کوتاہی نہ کرے، جو اس کام میں شریک نہیں ہوگا، اس کو بھی آگ

۱۔ (تفسیر کبیر ج ۸ ص 157، جامع البیان رقم الحدیث: 18618)

میں جلا دیا جائے گا۔ تمام لکڑیاں اس دیوار کے برابر ہوگئیں، وہ چالیس دن تک اس مہم میں لگے رہے۔ حتیٰ کہ ان میں سے ایک عورت نذر مانتی تھی کہ اگر میری فلاں مراد پوری ہوگئی تو میں ابراہیم کی آگ کے لیے لکڑیاں چن کر لاؤں گی پھر جب اس مکان میں تمام لکڑیاں جمع ہوگئیں تو انہوں نے اس مکان سے نکلنے کے راستے بند کر دیئے اور اس میں آگ لگا دی۔ اس میں شعلے بھڑکنے لگے، اس کی تپش اس قدر زیادہ تھی کہ اس کے اوپر سے فضا میں بھی کوئی پرندہ گزرتا تو جل جاتا تھا پھر انہوں نے اس قلعہ کے لیے ایک بہت بلند جگہ منتخب کی اور اس پر منجنیق نصب کی اور اس منجنیق میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو رکھ دیا۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور عرض کیا: اے اللہ! تو آسمان پر واحد ہے اور میں زمین پر واحد ہوں اور اس زمین پر میرے سوا اور کوئی تیری عبادت کرنے والا نہیں ہے، اللہ مجھے کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے، پھر آسمانوں، زمینوں، پہاڑوں اور فرشتوں نے کہا اے ہمارے رب! ابراہیم (علیہ السلام) کو تیرے نام کی سربلندی کی وجہ سے جلایا جا رہا ہے تو ہمیں اس کی مدد کرنے کی اجازت دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اس کا خوب علم ہے اگر وہ تم کو مدد کے لیے پکارے تو تم اس کی مدد کرو، پھر ان کافروں نے آپ کو آگ میں ڈال دیا۔ اس وقت آپ کی عمر سولہ سال تھی اور ایک قول یہ ہے کہ آپ کی عمر اس وقت چھبیس سال تھی۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا حسبی اللہ و نعم الوکیل، حضرت جبرائیل، حضرت ابراہیم کے پاس آئے اور کہا اے ابراہیم! آپ کی کوئی حاجت ہے؟ آپ نے فرمایا: مجھے تم سے کوئی کام نہیں ہے، پھر اس نے کہا آپ اپنے رب سے سوال کیجیے۔ آپ نے فرمایا اس کو جو میرے حال کا علم ہے، وہی کافی ہے۔ [1]

ا۔ (زاد المسیر ج ۵ ص 366-367، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، 1407ھ)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر آگ کا ٹھنڈا ہونا

امام ابن جریرؒ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت علی بن ابی طالبؓ نے یا نار کونی بردا وسلاما علی ابراہیم کی تفسیر میں فرمایا، وہ آگ اس طرح حضرت ابراہیم پر ٹھنڈی ہوئی کہ ان کو اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچا۔ [1]

ابوالعالیہ بیان کرتے ہیں کہ سلاما کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ٹھنڈک نقصان نہیں دے گی اور اگر اللہ تعالیٰ وسلامانہ فرماتا تو اس کی ٹھنڈک آگ کی گرمی سے زیادہ نقصان دہ ہوتی۔ [2]

منہال بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے فرمایا مجھ پر اللہ کی سب سے زیادہ نعمتیں ان دنوں تھیں جب مجھے آگ میں ڈالا گیا تھا۔ [3]

امام فخر الدین رازیؒ متوفی 606ھ لکھتے ہیں:

مجاہدؒ نے کہا حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اگر وہ آگ سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی نہ ہوت تو حضرت حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اس کی ٹھنڈک سے فوت ہوجاتے اور دنیا میں جس جگہ بھی آگ تھی وہ بجھ جای۔ سدی نے کہ کافرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بغلوں سے پکڑ کر اٹھایا، وہاں میٹھے پانی کا چشمہ تھا اور انواع واقسام کے پھول تھے۔ اس آگ نے صرف حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی بیڑیوں اور زنجیروں کو جلایا تھا۔ منہال بن عمرو نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اس آگ میں

۱۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 18622)

۲۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 18629)

۳۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 18623)

چالیس یا پچاس دن رہے تھے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا میری زندگی کے سب سے اچھے ایام وہ تھے جو اس آگ میں گزرے تھے۔ امام ابن اسحاق نے کہا اللہ تعالیٰ نے سائے کے فرشتے کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس بھیجا، وہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور آپ کا دل بہلاتا رہا۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) آپ کے پاس جنت سے ریشم کی قمیض لے کر آئے اور کہا اے ابراہیم! آپ کا رب فرماتا ہے کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آگ میرے محبوب بندوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتی، پھر نمرود نے اپنے قلعہ سے جھانک کر دیکھا تو حضرت ابراہیم باغ میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ارد گرد لکڑیاں جل رہی تھیں، پھر نمرود نے چلا کر کہا اے ابراہیم! کیا تم اس آگ سے نکل سکتے ہو؟ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا: ہاں! اس نے کہا پھر نکل آئیں۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) چل پڑے حتیٰ کہ اس آگ سے نکل آئے۔ نمرود نے پوچھا: میں نے آپ کی صورت میں جو ایک شخص کو آپ کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا تھا، وہ کون تھا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا۔ وہ سائے کا فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے میرا دل بہلانے کے لیے بھیجا تھا۔ نمرود نے کہا میں نے آپ کے رب کے نزدیک آپ کی عزت اور جاہت دیکھی ہے تو میں اس کا تقرب حاصل کرنے کے لیے چار ہزار گایوں کو ذبح کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا جب تک تم اپنے دین پر قائم ہو، اللہ تعالیٰ تمہاری قربانی قبول نہیں فرمائے گا۔ نمرود نے کہا میں اپنے دین کو چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن میں عنقریب گایوں کو ذبح کروں گا پھر اس نے گایوں کو ذبح کیا اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے تعرض کرنا چھوڑ دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے بہت بڑا گڑھا کھودا پھر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اس میں ڈالا گیا پھر ان پر سات دن تک آگ جلتی رہی

پھر اس گڑھے کو پاٹ دیا پھر اگلے دن اس گڑھے کو کھولا تو اس میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بیٹھے ہوئے تھے اور آپ پر آگ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا، پھر ان سے حضرت لوط (علیہ السلام) کے باپ حار ان نے کہا ان پر آگ کا کوئی اثر نہیں ہوگا کیونکہ انہوں نے آگ پر جادو کر دیا ہے لیکن ان کو کسی چیز پر بٹھا کر اس کے نیچے آگ جلاؤ تو یہ اس کے دھوئیں سے مر جائیں گے، تو انہوں نے ایک کنوئیں کے اندر آگ لگا کر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کے اوپر بٹھا دیا اس آگ کی ایک چنگاری حضرت لوط کے باپ حاران کی ڈاڑھی میں جا کر گری اور وہ خود جل کر مر گیا۔

پھر فرمایا: انہوں ن ابراہیم کے ساتھ ایک چال چلی سو ہم نے ان کو ناکام کر دیا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے مباحثہ اور مناظرہ کیا اور اس میں وہ مبہوت اور لاجواب ہو گئے پھر انہوں نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں جلانا چاہا لیکن وہ اس میں بھی ناکام ہو گئے۔ [1]

نمرود اور اس کی قوم کا عذاب سے ہلاک ہونا

حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی 774ھ اور امام ابن جوزی متوفی 597ھ لکھتے ہیں:

زید بن اسلم نے کہا اللہ تعالیٰ نے اس ظالم بادشاہ (نمرود) کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جو اس کو اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیتا تھا۔ نمرود نے اس کی دعوت کا انکار کیا پھر دوسری بار بھیجا پھر انکار کیا پھر تیسری بار بھیجا پھر انکار کیا، پھر اس فرشتہ نے کہا تم اپنا لشکر جمع کرو، میں اپنا لشکر جمع کرتا ہوں۔ سو نمرود نے اپنے حواریوں اور سپاہیوں کا لشکر جمع کیا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف مچھر بھیجے جن کو دھوپ کی وجہ سے انہوں نے

---

[1] (تفسیر کبیر ج ۸ ص 158-160 ملخصاً، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1415ھ)

دیکھا پھر اللہ تعالیٰ نے وہ مچھر ان پر مسلط کر دیئے۔ مچھروں نے ان کا خون پی لیا اور ان کا گوشت کھا گئے اور جنگل میں صرف ان کی ہڈیاں پڑی رہ گئیں۔ ایک مچھر نمرود کے نتھنے کے راستہ سے اس کے دماغ میں داخل ہو گیا اور چار سو سال تک وہ اس عذاب میں مبتلا رہا۔ اس عرصہ میں اس کے سر پر ہتھوڑے مارے جاتے رہے حتیٰ کہ اللہ عزوجل نے اس کو ہلاک کر دیا۔ [1]

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے امتحان میں سرخ رو ہوئے اور نمرود اور اس کی قوم اللہ کے عذاب میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گئی۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا حضرت لوط (علیہ السلام) کے ساتھ عراق سے شام کی طرف ہجرت فرمانا

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور ہم ابراہیم کو اور لوط کو نجات دے کر اس سرزمین کی طرف لے گئے جس میں ہم نے تمام جہان والوں کے لیے برکت فرمائی تھی۔ (الانبیاء:71)

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے ہم نے ابراہیم کو اور لوط کو ان کے دشمنوں کے علاقہ سے نکال لیا اور ان کو برکتوں والے علاقہ میں بھیج دیا۔ یعنی عرقا سے شام کی طرف بھیج دیا۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اپنی قوم اور اس کے دین کو ترک کر کے شام کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس قصہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کی قوم کے واقعہ کی خبر دی ہے اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قوم قریش کو بتایا ہے کہ تمہاری طرح حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی قوم

---

[1] ۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱ ص 224، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1418، طبع جدید، المنتظم لابن الجوزی ج ۲ ص 169، دار الفکر بیروت، 1415ھ)

بھی بت پرستی کرت تھی اور جس طرح حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی قوم نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اذیت پہنچائی تھی، اسی طرح قریش بھی آپ کو اذیت پہنچاتے تھے۔ آپ ان کو پیغمبر حق سناتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دیتے تھے، وہ اس دعوت کی مخالفت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا قصہ سنا کر یہ بتایا کہ جس طرح حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنی قوم کی ایذاؤں پر صبر کیا تھا، آپ بھی اپنی قوم کی ایذا رسانیوں پر صبر کریں اور جس طرح انہوں نے عراق سے شام کی طرف ہجرت کی تھی، آپ کو بھی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنی ہوگی۔

شام کا برکت والی سرزمین ہونا

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

قتادہؒ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور لوط (علیہ السلام) دونوں سر زمین شام میں تھے، اسی سرزمین کو ارض محشر بھی کہا جاتا ہے۔ قیامت کے دن تمام لوگ یہیں پر جمع ہونگے۔ حضرت عیسیٰ بن مریم بھی یہیں پر آسمان سے اتریں گے اور دجال کذاب بھی یہیں پر ہلاک ہوگا۔ ہمیں ابوقلابہ نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے خواب میں دیکھا کہ فرشتے کتابوں کا ڈھیر اٹھا کر لائے اور اس کو شام میں لا کر رکھ دیا۔ میں نے اس کی یہ تعبیر لی کہ جب فتنے پھیل جائیں گے تو ایمان شام میں ہوگا، اور ہم سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے خطبہ میں فرمایا ایک جماعت شام میں ہوگی اور ایک جماعت عرقا میں ہوگی اور ایک جماعت یمن میں ہوگی۔ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! میرے لیے ان میں سے کسی جگہ کو منتخب کیجیے۔ آپ نے فرمایا تم شام میں رہنا کیونکہ اللہ تعالیٰ میرے لیے شام کا اور

وہاں کے رہنے والوں کا ضامن ہو گیا ہے، اور ہم کو بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے کعب سے کہا اے کعب! تم مدینہ سے کیوں منتقل ہو رہے ہو؟ یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہجرت کی جگہ ہے، یہیں آپ کی قبر (مبارک) ہے۔ کعب نے کہا اے امیر المومنین! میں نے اللہ کی نازل کردہ کتاب (تورات) میں پڑھا ہے کہ اللہ کی سرزمین میں شام اللہ کا خزانہ ہے اور اس کے پسندیدہ بندے بھی وہیں ہیں۔ [1]

امام ابن اسحاقؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے رب کی طرف ہجرت کی اور ان کے ساتھ حضرت لوط (علیہ السلام) بھی گئے اور آپ نے اپنی عم زاد حضرت سارہؑ سے نکاح کر لیا۔ وہ اپنے دین، اپنے رب کی عبادت اور اپنی جان اور عزت کی حفاظت کرتے ہوئے نکلے۔ حتیٰ کہ حران (ایک جگہ کا نام) میں ٹھہرے اور جب تک اللہ نے چاہا، وہاں رہے پھر آپ ہجرت کر کے مصر چلے گئے پھر مصر سے شام واپس چلے گئے اور فلسطین میں ٹھہرے اور حضرت لوط (علیہ السلام) المؤتفکۃ میں ٹھہرے جو وہاں سے ایک دن رات کی مسافت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو نبی بنا کر بھیجا۔ [2]

﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا

۱۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 18635)

۲۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 18638)

عٰبِدِیۡنَ ﴿۷۳﴾

اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اسحاق (علیہ السلام) (جیسا بیٹا) اور مزید یعقوب (علیہ السلام) (جیسا پوتا) عطا فرمایا، اور ہم نے ان سب کو صالحین بنا دیا ۔(۷۲) اور ہم نے انہیں پیشوا بنایا وہ ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے ان کی طرف نیک کام کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوۃ ادا کرنے کی وحی بھیجی اور وہ سب ہمارے عبادت گزار تھے۔(۷۳)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے جب اپنا ملک، گھر بار، باپ اور اپنی قوم کو چھوڑا تو اس وقت ان کو بڑی شدت کے ساتھ یہ کمی محسوس ہوئی۔ کہ اے اللہ اگر یہ قوم تیرے دین کو نہیں مانتی تو کم از کم نیک اولاد عنایت کر دے۔ جو میرا سہارا اور غمخوار بننے کے ساتھ ساتھ میرے بعد تیرے دین کا پرچار کرتی رہے۔

تمام مورخین نے تحریر فرمایا ہے کہ جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اسحاق (علیہ السلام) کی ولادت کی خوشخبری دی گئی تو آپ (علیہ السلام) کی عمر سو سال اور آپ (علیہ السلام) کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ (علیہ السلام) کی عمر نوے سال تھی۔ قرآن مجید نے ولادت اسحاق (علیہ السلام) کے سلسلے میں متعدد مقامات پر ذکر فرمایا ہے کہ فرشتے انسانوں کی شکل میں جناب خلیل (علیہ السلام) کے پاس حاضر ہوئے۔

"جب ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس ہمارے فرشتے خوشخبری لے کر پہنچے تو فرشتوں نے عرض کیا۔ اے

ابراہیم آپ پر سلام ہو۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے جواب میں کہا تم پر بھی سلام ہو۔ پھر کچھ دیر نہ لگائی کہ ایک بھنا ہوا بچھڑا ضیافت کے لیے لے آئے۔ مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھتے۔ تو وہ ان سے مشتبہ ہو گئے اور دل میں ان سے خوف محسوس کیا۔ فرشتوں نے کہا آپ ڈریں نہیں ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔" [ھود:٦٩، ٧٠]

"اور اس کی بیوی (اس کے) پاس کھڑی تھی۔ وہ یہ سن کر ہنس پڑی، پھر ہم نے اس کو اسحاق اور اسحاق کے بعد یعقوب (علیہ السلام) کی خوشخبری سنائی۔ اس نے کہا اف! کیا اب میرے ہاں بچہ ہوگا۔ جب کہ میں نہایت بوڑھی ہو چکی ہوں۔ اور یہ میرا خاوند بھی بوڑھا ہو چکا ہے۔ یہ تو عجیب بات ہے۔ فرشتوں نے کہا۔ کیا اللہ تعالیٰ کے حکم پر تعجب کرتی ہو۔ اے ابراہیم (علیہ السلام) کے گھر والو! تم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں۔ یقیناً اللہ نہایت تعریف والا اور بلند شان کا مالک ہے۔" [ھود:٧١، ٧٢، ٧٣]

حضرت اسحاق (علیہ السلام)

جناب اسحاق (علیہ السلام) حضرت اسماعیل (علیہ السلام) سے تیرہ یا چودہ سال چھوٹے ہیں۔ حضرت اسحاق (علیہ السلام) حضرت سارہ علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوئے۔ جیسا کہ آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں انہی کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا۔ اور ہم نے اس (ابراہیم (علیہ السلام) کو اسحاق (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) عطا کیے اور اس کی نسل کو کتاب اور نبوت سے نوازا۔

تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شام میں پیدا ہوئے اور ایک سو اسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ مقام جرون آپ (علیہ السلام) کی آخری آرامگاہ ہے، جو فلسطین میں ہے۔

عظیم خانوادہ نبوت:

"حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا گیا۔تمام لوگوں میں اللہ کے نزدیک کس کا مرتبہ زیادہ ہے۔آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو پرہیزگار ہے۔صحابہؓ نے عرض کیا ہمارا یہ مقصد نہیں پھر آپ نے ارشاد فرمایا۔خاندانی لحاظ سے سب سے بہتر اور افضل یوسف (علیہ السلام) جو نبی تھے۔ان کے باپ نبی (یعقوب (علیہ السلام) تھے۔پھر حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے باپ اسحاق (علیہ السلام) نبی تھے۔اوران کے باپ ابراہیم (علیہ السلام) نبی خلیل اللہ تھے۔"[1]

﴿ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۝ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ﴾

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو حکم اور علم عطا فرمایا اور ہم نے انہیں اس بستی سے نجات دی جس کے باشندے بے حیائی کے کام کرتے تھے، بیشک وہ بڑے برے (اور) نافرمان لوگ تھے۔(۷۴) اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو اپنی رحمت میں داخل کرلیا بیشک وہ صالح لوگوں میں سے تھا۔(۷۵)

اللہ تعالیٰ نے لوط (علیہ السلام) کو نبوت، علم شریعت اور حکمت ودانائی سے نوازا تھا اور لوگوں کے درمیان

---

[1]۔[رواہ البخاری: باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا]

صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت عطا کی تھی۔ وہ اہل سدوم، اہل عمورہ اور آس پاس کی بستیوں میں تبلیغ دین کا کام کرتے رہے، لیکن لوگوں کی حالت نہیں بدلی اور جن خبیث اعمال کا ارتکاب کرتے تھے، انھیں ترک نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کو لے کر وہاں سے نکل جائیں اور ان بستیوں والوں کو ان کے فسق و فجور اور فعل بد کی وجہ سے ہلاک کر دیا۔ ان شہروں کی تعداد سات تھی، جبرائیل (علیہ السلام) نے ان میں سے چھ کو الٹ دیا اور صرف "زغر" نام کی ایک بستی کو لوط (علیہ السلام) اور ان کے اہل وعیال کے لیے چھوڑ دیا۔ آگے فرمایا کہ ہم نے لوط (علیہ السلام) کو ان کے صلاح وتقویٰ کی وجہ سے اپنی رحمت میں داخل کر دیا۔

﴿ وَنُوحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۚ﴿۷۶﴾ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴿۷۷﴾ ﴾

اور نوح (علیہ السلام) (کو یاد کیجیے) اس سے پہلے جب انہوں نے ہمیں پکارا تو ہم نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ہم نے ان کو اور ان کے گھر والوں کو بہت بڑی گھبراہٹ سے نجات دی۔ (۷۶) اور ہم نے ان کی ان لوگوں کے مقابلہ میں مدد کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا، بیشک وہ بڑے ہی برے لوگ تھے سو ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔ (۷۷)

نوح (علیہ السلام) کی دعا

حضرت نوح نبی (علیہ السلام) کو ان کی قوم نے ستایا تکلیفیں دیں تو آپ نے اللہ کو پکارا کہ باری تعالیٰ میں عاجز آ گیا ہوں تو میری مدد فرما۔ زمین پر ان کافروں میں سے کسی ایک کو بھی باقی نہ رکھ ورنہ یہ تیرے بندوں کو بہکائیں گے۔ اور ان کی اولادیں بھی ایسی ہی فاجر کافر ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی دعا قبول فرمائی اور آپ کو اور مومنوں کو نجات دی اور آپ کے اہل کو بھی سوائے ان کے جن کے نام برباد ہونے والوں میں آ گئے تھے۔ آپ پر ایمان لانے والوں کی بہت ہی کم مقدار تھی۔ قوم کی سختی، ایذاء دہی، اور تکلیف سے اللہ عالم نے اپنے نبی کو بچا لیا۔ ساڑھے نوسو سال تک آپ ان میں رہے اور انہیں دین اسلام کی طرف بلاتے رہے مگر سوائے چند لوگوں کے اور سب اپنے شرک و کفر سے باز نہ آئے بلکہ آپ کو سخت ایذائیں دیں اور ایک دوسرے کو اذیت دینے کے لیے بھڑکاتے رہے۔ ہم نے ان کی مدد فرمائی اور عزت آبرو کے ساتھ کفار کی ایذاء رسانیوں سے چھٹکارا دیا اور ان برے لوگوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اور نوح (علیہ السلام) کی دعا کے مطابق روئے زمین پر ایک بھی کافر نہ بچا سب ڈبو دئے گئے۔

﴿ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ

لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ
شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى
الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَمِنَ
الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ
وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾

اور داؤد (علیہ السلام) اور سلیمان (علیہ السلام) (کا حال بھی سن لو کہ) جب وہ دونوں ایک کھیت (کے بارے) میں فیصلہ کر رہے تھے جب کچھ لوگوں کی بکریوں نے رات کے وقت اس کھیت کو روند ڈالا تھا اور ہم ان کے فیصلے کے وقت وہاں موجود تھے۔ (۷۸) پس ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کو فیصلہ سمجھا دیا۔ اور ہم نے دونوں کو حکمت اور علم عطا کیا تھا۔ اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کے ساتھ پہاڑوں کو تابع کر دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو بھی اور یہ سب کچھ ہم ہی کرنے والے تھے۔ (۷۹) اور ہم نے اس کو تمہارے لیے ایک خاص جنگی لباس کی صنعت سکھائی تاکہ وہ تم کو جنگوں میں محفوظ رکھے، تو کیا تم شکر ادا

کرنے والے بنتے ہو۔(۸۰)اور ہم نے تند و تیز ہوا کو سلیمان (علیہ السلام) کے تابع کر دیا جو ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی تھی اور ہم ہر چیز کو (خوب) جاننے والے ہیں۔(۸۱)اور سلیمان (علیہ السلام) کے لیے کچھ تو ایسے جن تھے جو (سمندر میں) ان کے لیے غوطے لگاتے تھے اور اس کے سوا اور بھی کام کیا کرتے تھے اور ان سب کے نگران ہم ہی تھے۔

(۸۲)

حضرت داؤد (علیہ السلام) کا نام ونسب

حافظ ابن کثیرؒ متوفی 774ھ نے حضرت داؤد (علیہ السلام) کا نام اور نسب اس طرح بیان کیا ہے:

داؤد بن ایشا بن عوید بن عابر بن سلمون بن نحشون بن عوینا ذب بن ارم بن حضرون بن فارس بن یہوذ ابن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم الخلیل النبی (علیہ السلام)

وہب بن منبہؒ نے کہا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا قد چھوٹا تھا، آنکھیں نلی تھیں، بال کم تھے اور وہ بہت پاکیزہ شخص تھے۔ جب انہوں نے جالوت کو قتل کر دیا تو بنو اسرائیل ان سے محبت کرنے لگے اور ان کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ حضرت داؤد (علیہ السلام) میں اللہ تعالیٰ نے نبوت اور بادشاہت کو جمع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض (البقرہ:251) یعنی اگر بادشاہوں کو لوگوں پر حاکم مقرر

نہ کیا جاتا تو طاقتور لوگ کمزور لوگوں کو کھا جاتے۔

اور بعض آثار میں ہے کہ سلطان زمین پر اللہ کا سایہ ہے۔ امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) رات کو قیام کرتے تھے۔ [1]

حضرت داؤد (علیہ السلام) کی فضیلت میں احادیث

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ پسندیدہ روزے حضرت داؤد (علیہ السلام) کے ہیں۔ وہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ پسندیدہ نماز حضرت داؤد (علیہ السلام) کی نماز ہے وہ نصف شب نیند کرتے تھے اور ایک تہائی رات قیام کرتے تھے اور رات کے چھٹے حصے میں پھر نیند کرتے تھے۔ [2]

حضرت داؤد (علیہ السلام) کو بہت دلکش آواز عطا کی گئی تھی جب وہ زبور کی تلاوت کرتے تھے تو پرندے ہوا میں ٹھہر جاتے تھے اور ان کے سر کے ساتھ سر ملاتے تھے اور ان کی تسبیح کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔

عبداللہ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کو ایسی آواز عطا کی گی تھی جو کسی کو عطا نہیں کی گی حتیٰ کہ ان کا ترنم سن کر پرندے ان کے پاس آ کر بیٹھ جاتے اور یونہی بیٹھے بیٹھے بھوکے پیاسے

۱۔ (البدایہ والنہایہ ج۱ ص455)

۲۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث:3420، صحیح مسلم رقم الحدیث:1159)

مرجاتے حتیٰ کہ دریا چلتے چلتے رک جاتا تھا۔ [1]

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا ابوموسیٰ کو آل داؤد کے مزامیر (بانسریاں) عطا کئے گئے ہیں۔ [2]

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) پر قرأت آسان کردی گئی تھی۔ وہ گھوڑے پر زین ڈالنے کا حکم دیتے اور زین ڈالے جانے سے پہلے زبور ختم کر لیتے تھے اور حضرت داؤد (علیہ السلام) صرف اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔ [3]

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کاش تم مجھے گزشتہ رات اس وقت دیکھتے جب میں تمہاری قرأت سن رہا تھا۔ بیشک تمہیں آل دؤد کی بانسریوں میں سے ایک بانسری دی گئی ہے۔ حضرت ابوموسیٰ نے کہا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ سن رہے ہیں تو میں اور مزید پڑھتا۔ [4]

حضرت داؤد (علیہ السلام) کی وفات

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا حضرت داؤد (علیہ السلام) میں بہت شدید غیرت تھی، وہ جب گھر سے باہر جاتے تھے تو دروازے بند کر دیتے تھے اور جب تک وہ واپس نہ آتے، ان کے گھر میں کوئی نہیں آتا تھا۔ ایک دن وہ دروازہ بند کر کے گئے ان کی

۱۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۸ ص 114 مطبوعہ دار الفکر بیروت)

۲۔ (مسند احمد رقم الحدیث: 25398، دار الفکر بیروت) ہیں۔ (مسند حمد ج ۳ رقم الحدیث: 8654 مطبوعہ دار الفکر بیروت)

۳۔ (مسند احمد ج ۳ رقم الحدیث: 8166، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

۴۔ (سنن کبریٰ للبیہقی ج ۱۰ ص 230 تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص 207، معارف القرآن ج ۶ ص 211)

بیوی گھر کو دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا ایک شخص گھر کے وسط میں کھڑا ہو جائیں گے۔ جب حضرت داؤد (علیہ السلام) آئے تب بھی وہ شخص گھر کے وسط میں کھڑا ہوا تھا۔ حضرت داؤد (علیہ السلام) نے فرمایا تم کون ہو؟ اس نے کہا میں وہ ہوں جو نہ بادشاہ سے ڈرتا ہوں اور نہ کوئی چیز اس کے لیے راستہ کی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ حضرت داؤد (علیہ السلام) نے کہا پھر تم بیشک ملک الموت ہو۔ میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو خوش آمدید کہتا ہوں پھر وہ تھوڑی دیر ٹھہرے تھے کہ ان کی روح قبض کر لی گئی پھر جب ان کو غسل دیا گیا اور کفن پہنایا گیا اور ان کے امور سے فراغت حاصل کی گئی تو سورج طلوع ہو گیا۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے پرندوں سے کہا حضرت داؤد (علیہ السلام) پر سایہ کرو پھر پرندوں نے آپ پر سایہ کیا حتیٰ کہ تمام زمین پر اندھیرا چھا گیا پھر حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے پرندوں سے فرمایا تم اپنے پر سمیٹ لو۔ [1]

قتادہ حسن سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) سو سال کی عمر گزار کر فوت ہوئے۔ [2]

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا نام ونسب

حافظ ابن کثیرؒ متوفی 774ھ لکھتے ہیں: سلیمان بن داؤد بن ایشا بن عوید بن عابر بن سلمون بن نحشون بن عوینا ذب بن ارم بن حصرون بن فارص بن یہودا بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم خلیل النبی۔

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے احوال اور فضائل

زہریؒ بیان کرتے ہیں کہ سلیمان بن داؤد (علیہما السلام) اور ان کے اصحاب بارش کے لیے دعا کرنے

۱۔ (مسند احمد ج ۳ رقم الحدیث: 9432 البدایہ والنہایہ ج ۱ ص 464، دار الفکر 1418ھ)

۲۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۸ ص 140 مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے ساتھ ایک چیونٹی بھی ایک ٹانگ پر کھڑی ہوئی دعا کر رہی ہے۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے اپنے اصحاب سے کہا واپس چلو، تم پر بارش ہوگی، اس چیونٹی نے بارش کی دعا کی ہے سو اس کی دعا قبول کر لی گئی۔ [1]

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے انبیاء سابقین میں سے ایک نبی لوگوں کو لے کر بارش کی دعا کرنے گئے، اس وقت ایک چیونٹی بھی اپنی ٹانگوں کو آسمان کی طرف کئے ہوئے کھڑی تھی۔ اس نبی نے کہا واپس چلو، تمہاری دعا اس چیونٹی کی وجہ سے قبول ہوگئی ہے۔ [2]

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے زیادہ احوال سورہ سبا، سورہ نمل اور سورہ ص میں ہیں۔ وہیں ہم انشاء اللہ ان کا ذکر کریں گے۔

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے مزید فضائل ہم انشاء اللہ اس سورت (الانبیاء: 81-82) میں بیان کریں گے۔

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی وفات

اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے:

(سبا: ١٤) پھر جب ہم نے ان کی موت کا حکم بھیج دیا تو جنات کو کسی نے اس کی خبر نہ دی سوائے دیمک کے جو ان کے عصا کو کھا رہی تھی، سو جب سلیمان گر پڑے تو جنات پر یہ منکشف ہوگیا کہ اگر وہ غیب

۱۔ (مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: 4921، البدایہ والنہایہ ج۱ ص468)

۲۔ مشکاۃ المصابیح رقم ۱۵۱۰، اسنادہ حسن

جانتے ہوتے تو (تعمیر کی) مشقت کی ذلت میں مبتلا نہ رہتے۔

حضرت ابن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اللہ کے نبی حضرت سلیمان (علیہ السلام) جب نماز پڑھتے تو اپنے آگے ایک درخت اگا ہوا دیکھتے۔ حضرت سلیمان درخت سے پوچھتے تیرا نام کیا ہے؟ وہ بتاتا میرا فلاں نام ہے۔ پوچھتے تم کس لیے ہو؟ اگر تم بہ طور درخت ہو تو تم کو اگا دوں اور اگر تم دوا کے لیے ہو تو بھی میں گاؤں سو اسی طرح ہوتا رہتا۔ ایک دن انہوں نے نماز پڑھی تو اپنے سامنے ایک درخت دیکھا۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے پوچھا تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا ویرانی۔ آپ نے پوچھا تم کس لیے ہو؟ اس نے کہا اس گھر کو ویران کرنے کے لئے، پھر حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے دعا کی اے اللہ! جنات کو میری موت سے اندھا (غافل) کر دے حتیٰ کہ تمام انسانوں کو معلوم ہو جائے کہ جنات غیب نہیں جانتے۔ انہوں نے ایک عصا تراشا اور اس پر ٹیک لگا کر ایک سال تک کھڑے رہے اور جنات ان کے سامنے تعمیر کا کام کرتے رہے (وہ پہاڑوں سے پتھر توڑ کر لاتے تھے اور محل بناتے تھے) پھر اس لاٹھی کو دیمک نے کھانا شروع کر دیا (وہ لاٹھی ٹوٹ گئی اور حضرت سلیمان گر گئے) تب انسانوں کو پتا چلا کہ اگر جنات کو غیب کا علم ہوتا اور وہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی وفات کو جان چکے ہوتے تو اس مشقت والے کام کو کب کا چھوڑ چکے ہوتے (وہ یہی سمجھتے رہے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) زندہ ہیں اور ان کے کام کی نگرانی کر رہے ہیں، وہ ان کے خوف سے بہ دستور کام کرتے رہے) پھر جنات نے اس دیمک کا شکر ادا کیا۔ [1]

امام ابن اسحاق ؒ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) باون سال زندہ رہے اور ان کی

۱۔ (المعجم الکبیر رقم الحدیث: 12281، مسند البیز ار 2355، مختصر تاریخ دمشق ج۔ ۱ ص 155 البدایہ، والنہایہ ج ۱ ص 481)

حکومت چالیس سال رہی۔ [1]

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ دو آدمی حضرت داؤد (علیہ السلام) کے پاس آئے، ان میں سے ایک کھیت کا مالک تھا اور دوسرا بکریوں کا مالک تھا۔ کھیت کے مالک نے کہا اس آدمی نے اپنی بکریاں میرے کھیت میں ہانک دیں اور میرے کھیت میں سے کوئی چیز باقی نہیں بچی۔ حضرت داؤد (علیہ السلام) نے فرمایا جاؤ یہ ساری بکریاں تمہاری ہیں۔ یہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کا فیصلہ تھا، پھر بکریوں والا حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے پاس گیا اور ان کو حضرت داؤد (علیہ السلام) کا کیا ہوا فیصلہ بتایا پھر حضرت سلیمان، حضرت داؤد (علیہ السلام) کے پاس گئے اور کہا اے اللہ کے نبی! آپ نے جو فیصلہ کیا ہے، اس کے سوا ایک اور فیصلہ ہے۔ حضرت داؤد (علیہ السلام) نے فرمایا وہ کیا ہے؟ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا کھیت والے کو معلوم ہے کہ ہر سال اس کی کتنی فصل ہوتی ہے، وہ اس فصل کی قیمت بکریوں والے سے لے لے اور بکریوں والا بکریوں کے بال، ان کا اون اور ان کے بچوں کو بیچ کر وہ قیمت ادا کر دے اور بکریوں کی نسل تو ہر سال چلتی رہتی ہے۔ حضرت داؤد (علیہ السلام) نے کہ کا تم نے صحیح فیصلہ کیا ہے اور فیصلہ یہی ہے، یہ محمد بن سعد کی روایت ہے اور خلیفہ نے حضرت ابن عباسؓ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا بکریاں کھیت والے کو دے دیں، وہ ان کے دودھ، ان کے بچوں اور ان کے دیگر منافع سے استفادہ کرے اور اس عرصہ میں بریوں والا کھیت میں دوبارہ فصل اگائے حتیٰ کہ جب پہلے جتنی فصل ہو جائے تو کھیت کھیت والے کے حوالے کر کے

---

[1] ۔ (مختصر تاریخ دمشق ج، ۱ ص ۱۵۵ البدایہ والنہایہ جتہ ص 483)

اپنی بکریاں لے لے۔ [1]

حضرت داؤد (علیہ السلام) کے ساتھ پہاڑوں کی تسبیح کرنے کے محامل

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور ہم نے پہاڑوں کو داؤد کے تابع کر دیا تھا جو داؤد کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور پرندے بھی اور ہم (ہی ہر) کام کرنے والے ہیں۔ (الانبیاء:79)

پہاڑ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ اس کے مفسرین نے متعدد محامل بیان فرمائے ہیں۔

(۱) جب حضرت داؤد (علیہ السلام) اپنے رب کا ذکر کرتے تو آپ کے ساتھ پہاڑ اور پرندے بھی اپنے رب کا ذکر کرتے تھے۔

(۲) حضرت داؤد (علیہ السلام) جب تسبیح پڑھتے تھے تو پہاڑ اور پرندے بھی ان کی اتباع میں تسبیح پڑھتے تھے۔

(۳) حضرت داؤد (علیہ السلام) جب اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی تسبیح کرتے کرتے تھک جاتے تو اللہ تعالیٰ پہاڑوں کو تسبیح کرنے کا حکم دیتا۔ ان کی تسبیح سن کر حضرت داؤد (علیہ السلام) کی تھکن دور ہو جاتی اور وہ پھر تازگی اور ذوق وشوق کے ساتھ تسبیح کرنے لگتے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وان من شیء الا یسبح بحمدہ (الاسراء:٤٤) اور ہر چند اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتی ہے۔

حضرت داؤد (علیہ السلام) کے ساتھ خصوصیت سے پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کا ذکر فرمایا کیونکہ اللہ

---

[1] (جامع البیان رقم الحدیث:18656 مصنف ابن ابی شیبہ ج ٥ رقم الحدیث:27969، ج ٧ رقم الحدیث:36291، زاد المسیر ج ٥ ص 371-372

تعالیٰ آپ کا ذوق وشوق تازہ کرنے کے لیے آپ کو پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح سنا دیتا تھا۔
اس آیت میں اس پر غور کرنا چاہیے کہ پتھر اور جانور بھی اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اگر انسان اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح نہ کرے تو وہ پتھروں اور جانوروں سے بھی گیا گزرا ہے۔

انبیاء (علیہم السلام) کا مختلف پیشوں کو اپنانا

اس کے بعد فرمایا: اور ہم نے داؤد کو تمہارے لیے خاص لباس (زرہ) بنانا سکھایا تا کہ وہ تم کو جنگوں میں محفوظ رکھے پس کیا تم شکر ادا کرو گے!۔ (الانبیاء:80)
قتادہ نے کہا سب سے پہلے جس نے زرہ کی صنعت ایجاد کی وہ حضرت داؤد (علیہ السلام) ہیں۔ اس سے پہلے فولاد کے پتروں کو لوگ بہ طور ڈھال استعمال کرتے تھے۔ حضرت داؤد (علیہ السلام) نے لوہے کے حلقے (چھلے) بنائے اور ان کو جوڑ کر قمیض تیار کر لی۔ حسن نے ذکر کیا ہے کہ لقمان حکیم حضرت داؤد (علیہ السلام) سے ملنے گئے اس وقت وہ زرہ بنا رہے تھے، انہوں نے ارادہ کیا کہ پوچھیں آپ کیا بنا رہے ہیں لیکن وہ خاموش رہے حتیٰ کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) قمیض بنا کر فارغ ہو گئے۔ تب انہوں نے کہا خاموش رہنا بھی حکمت ہے اور کم لوگ اس حکمت کو اختیار کرتے ہیں۔ مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد (علیہ السلام) کے لیے لوہے کو نرم کر دیا تھا اور وہ اس کو آگ سے پگھلائے بغیر دھاگے کی طرح اس سے زرہ بن لیتے تھے۔ [1]
یہ آیت حصول معاش کے لیے صنعت، کاری گری اور پیشے کی اصل ہے۔ بعض جاہل غبی اور متکبر لوگ بعض پیشوں کو حقیر حسیس اور گھٹیا کام سمجھتے ہیں حالانکہ اسباب، صنعتوں اور پیشوں کو اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کا

۱۔ (تفسیر کبیر ج ۸ ص 168)

سکھایا ہوا طریقہ ہے سو جو شخص پیشوں پر طعن کرتا ہے وہ درحقیقت کتاب اور سنت پر طعن کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) لوہے سے زرہ بناتے تھے اور اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔ علامہ قرطبی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کاشت کاری کرتے تھے حضرت نوح (علیہ السلام) بڑھئی تھے لکڑی سے چیزیں بناتے تھے۔ حضرت لقمان (علیہ السلام) درزی تھے کپڑے سیتے تھے۔ حضرت طالوت (علیہ السلام) رگن ریز تھے، کپڑے رنگتے تھے۔ [1]

اور ہمارے رسول سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہر چند کہ خصوصیت کے ساتھ کوئی پیشہ نہیں اپنایا کہ آپ نے بکریاں چرائی ہیں، بکریوں کا دودھ دوہا ہے، پھٹے ہوئے کپڑے سی لیے ہیں، کپڑے دھوئے ہیں، جوتیوں کی مرمت کی ہے، زمین کھودی ہے، اس لیے کسی کام اور پیشہ کو برا اور حقیر نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ ہمارے آقا اور مولی نے بہت سے ان کاموں کو کیا ہے، جن کو آج کل گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔ رزق حلال حاصل کرنے کے لیے جو بھی جائز کام اور حلال پیشہ اپنایا جائے، وہ قابل تعریف اور لائق تحسین ہے۔

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے لیے تیز ہواؤں اور نرم ہواؤں کو مسخر کرنا

الانبیاء: 81 میں فرمایا: اور ہم نے تیز ہوا کو سلیمان کے تابع کر دیا جو ان کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی تھی اور ہم ہر چیز کو خوب جاننے والے ہیں۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے ہوا کو حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے مطیع اور تابع کر دیا اگر وہ چاہتے کہ وہ ہوا تیز چلے تو وہ تیز چلتی اور اگر وہ چاہتے کہ وہ ہوا آہستہ چلے تو وہ آہستہ چلتی اور وہ ہوا ہر دو حال

---

[1] (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۱ ص ۲۲۷)

میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے تابع تھی اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس آیت میں تیز ہوا کے مسخر کرنے کا ذکر ہے اور ایک اور آیت میں نرم ہوا کو مسخر کرنے کا ذکر ہے،:

فسخر نا لہ الریح تجری بامرہ رخآء حیث اصاب (ص:36)

پس ہم نے ہوا کو ان کے تابع کر دیا، وہ آپ کے حکم سے جہاں آپ چاہتے نرمی سے پہنچا دیتی تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فی نفسہ ہوا نرم اور خوشگوار تھی جیسے صبح کے وقت ہوا آہستہ آہستہ چلتی ہے اور جب ہوا ان کے تخت کو لے کر چلتی تو ان کو تیزی کے ساتھ ان کی منزل مقصود پر پہنچا دیتی تھی۔ جیسا کہ فرمایا:

ولسلیمن الریح عذوھا شھر ورواحھا شھر (سبا:12 اور ہم نے ہوا کو سلمیان کے تابع کر دیا، صبح کی سیر ایک ماہ کی مسافت ہوتی تھی اور شام کی سیر (بھی) ایک ماہ کی مسافت ہوتی تھی۔

حضرت سلیمان (علیہ السلام) اپنے ارکان سلطنت اور لشکر کے ساتھ تخت پر بیٹھ جاتے اور آپ جہاں حکم دیتے، ہوائیں وہاں اس تخت کو لے جاتیں۔ ایک ماہ کی مسافت کو صبح کی سیر میں طے کر لیتیں اور ایک ماہ کی مسافت کو شام کی سیر میں طے کر لیتیں اور اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ جس وقت حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا حکم ہوتا ہوا آہستہ چلتی اور جب آپ کا حکم ہوتا ہوا تیز چلتی۔ ایک آیت میں ہوا کے تیز چلنے کا بیان فرمایا اور دوسری آیت میں ہوا کے آہستہ چلنے کا بیان فرمایا۔

اور فرمایا اس زمین کی طرف ہوا چلتی تھی جس میں ہم نے برکت دے رکھی تھی، اب سے مراد شام کی زمین ہے۔

نیز فرمایا اور ہم ہر چیز کو خوب جاننے والے ہیں کیونکہ ہم کو علم ہے کہ رسولوں کو کب کونسا معجزہ عطا فرماتا ہے۔

جنات کو حضرت سلیمان علیہ اسلام کے تابع کرنا

الانبیا: 82 میں فرمایا اور کچھ جنات بھی ان کے تابع کر دیئے تھے جو ان کے حکم سے غوطے لگاتے اور اس کے سوا بھی کام کرتے تھے اور ہم (ہی) ان کی نگرانی کرنے والے تھے۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ بعض جنات حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے لیے سمندروں میں غوطے لگاتے تھے اور اس میں سے جواہر اور قیمتی چیزیں نکال کر لاتے تھے اور اس کے علاوہ اور بھی اعمال شاقہ کرتے تھے شہر اور محلات بناتے تھے مجسمے اور دیگیں اور چکیاں، بوتلیں اور شیشے کی مصنوعات بناتے تھے۔

جنات میں مومن بھی تھے اور کافر بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان جنات کو حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے احکام کے تابع کر دیا تھا جو کافر تھے اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات کے لیے شیاطین کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نیز فرمایا ہے کہ ہم ان کی حفاظت کرنے والے تھے تاکہ وہ کام سے بھاگ نہ جائیں یا حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے احکام کو ماننے سے انکار نہ کر دیں اور یہ حفاظت کفار کے مناسب ہے نہ کہ مومنین کے۔

ان کی حفاظت کرنے کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ان کے اوپر فرشتوں کو مقرر کر دیا تھا یا جنات میں سے مومنین کو ان کی حفاظت پر مقرر کر دیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح مقرر کر دیا تھا کہ ان کی طبیعت میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی اطاعت کو پسندیدہ بنا دیا تھا اور ان کی مخالفت کرنے کا ان کے دلوں میں خوف پیدا کر دیا تھا رہا یہ کہ کس چیز سے ان کی حفاظت کی گئی تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی حفاظت اس سے کی گئی تھی کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں اور کام چھوڑ نہ دیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی اس سے حفاظت کی جاتی تھی کہ وہ اس زمانہ کے کسی شخص کو نقصان نہ پہنچائیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جو کام

انہوں نے دن میں بنایا تھا، کہیں اس کو وہ رات میں خراب نہ کر دیں۔

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ایک سرکش جن گزشتہ شب میرے سامنے آیا (یا آپ نے اس کی مثل کوئی کلمہ فرمایا)، وہ میری نماز میں خلل ڈالنا چاہتا تھا، مگر اللہ نے مجھے اس پر قابو دے دیا اور میں نے چاہا کہ اسے مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون کے ساتھ باندھ دوں، تاکہ صبح کو اسے تم لوگ دیکھو، پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان (علیہ السلام) کی دعا یاد آئی: (رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ) [صٓ: ۳۵] "اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو۔"[1]

﴿ وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۚ﴿۸۳﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ ۡ وَاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾

اور ایوب (علیہ السلام) کو بھی یاد کرو کہ جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے تکلیف پہنچی ہے اور تو رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم والا ہے۔ (۸۳)

۱۔ [بخاری، کتاب الصلوۃ، باب الأسیر أو الغریم یربط فی المسجد: ٤٦١]

پس ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کو جو تکلیف تھی اس کو دور کر دیا اور ہم نے ان کو بال بچے عطا فرمائے اور اپنی مہربانی سے ان کے ساتھ اتنے ہی اور (بخشے) اور عبادت کرنے والوں کے لیے یہ نصیحت ہے۔(۸۴)

حضرت ایوب (علیہ السلام) کا نام ونسب

حضرت ایوب (علیہ السلام) کے قصہ میں جو دلائل ہیں اور نصیحت آموز باتیں ہیں، وہ کسی اور قصہ میں نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا عظیم فضل کرنے کے باوجود ان کو بیماری میں مبتلا کیا اور ان پر بہت سخت بیماری نازل کی۔انہوں نے اس بیماری پر صبر کیا اور کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے اور اس میں انسانوں کے لیے یہ نصیحت ہے کہ غم ہو یا خوشی وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرے، مصائب پر صبر کرے اور نعمتوں پر شکر کرے۔

حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی متوفی 774ھ لکھتے ہیں:

امام ابن حساق نے حضرت ایوب (علیہ السلام) کا نسب اس طرح بیان کیا ہے:

ایوب بن موص بن زراح بن العیص بن اسحاق بن ابراہیم الخلیل النبی۔حضرت ایوب (علیہ السلام) حرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ذریت میں سے ہیں۔قرآن مجید میں ہے:

من ذریتہٖ داؤد سلیمان وایوب ویوسف وموسیٰ وہارون (الانعام:84) داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف اور موسیٰ اور ہارون سب ابراہیم کی اولاد میں سے ہیں۔

ان انبیاء میں ایوب (علیہ السلام) بھی تھے، ان کا زمانہ ابراہیم (علیہ السلام) کے بعد کا تھا اور ان کا

علاقہ بحیرہ مردار کے جنوب مشرق میں تھا، وہ اللہ کے بڑے ہی صابر وشاکر بندے تھے۔ اللہ نے انھیں خوب مال ودولت اور اولاد وجاہ سے نوازا تھا، اس لیے اپنے رب کا خوب شکر ادا کرتے تھے۔ اس کے بعد اللہ نے انھیں بیماری میں مبتلا کر دیا اور اولاد و دولت سب جاتی رہی، تو اپنے رب کی رضا کے لیے بہت ہی صبر سے کام لیتے رہے اور دل میں شکوہ کو جگہ نہیں دی۔ جب ان کی تکلیف حد سے بڑھنے لگی اور اس حال میں اٹھارہ سال کا زمانہ گزر گیا تو انھوں نے اپنے رب سے دعا کی، اللہ نے ان کی دعا قبول کر لی۔ ان کی بیماری جاتی رہی اور اللہ نے اپنے فضل وکرم سے انھیں پہلے سے بھی زیادہ مال ودولت اور اولاد و جاہ سے نوازا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ۝41 اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ۝42 وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا﴾ [آ: ٤١ تا ٤٣] "اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کر، جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بیشک شیطان نے مجھے بڑا دکھ اور تکلیف پہنچائی ہے۔ اپنا پاؤں مار، یہ نہانے کا اور پینے کا ٹھنڈا پانی ہے۔ اور ہم نے اسے اس کے گھر والے عطا کر دیے اور ان کے ساتھ اتنے اور بھی، ہماری طرف سے رحمت کے لیے۔" ان آیات سے نصیحت ملتی ہے کہ صبر کا انجام ہمیشہ اچھا ہوتا ہے اور اسمائے حسنیٰ وصفات علیا کے واسطے سے اللہ کے حضور دعا اور گریہ وزاری سے مصیبت دور ہوتی ہے۔ دنیا کی مصیبت وتکلیف اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ بندہ اپنے رب کی نگاہ میں ذلیل وبد بخت ہے۔ صبر کرنے سے اللہ تعالیٰ پہلے سے کئی گنا زیادہ دیتا ہے۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص ؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! سب سے سخت امتحان کن لوگوں کا ہوتا ہے؟ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "(سب سے زیادہ سخت امتحان) نبیوں کا ہوتا ہے؟ پھر جو

ان کے بعد سب سے افضل ہیں، پھر جو ان کے بعد افضل ہیں۔ بندے پر اس کے دین کے مطابق آزمائش آتی ہے، اگر وہ اپنے دین (اور ایمان) میں مضبوط ہے تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے اور اگر اس کا دین (و ایمان) نرم و کمزور ہے تو اس پر اس کے دین کے مطابق آزمائش آتی ہے۔ بندے پر آزمائش (و مصیبت) آتی رہتی ہے، حتیٰ کہ اسے ایسا کر کے چھوڑتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر رہا ہوتا ہے اور اس پر کوئی گناہ (باقی) نہیں ہوتا۔"[1]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ایوب (علیہ السلام) کپڑے اتار کر غسل فرما رہے تھے کہ سونے کی ٹڈیاں ان پر گرنے لگیں، ایوب (علیہ السلام) مٹھیاں بھر بھر کر کپڑے میں ڈالنے لگے، تو اللہ عزوجل نے آواز دی، ایوب! کیا میں نے تجھے اس سے بے پروا نہیں کر دیا جو تو دیکھ رہا ہے؟ انھوں نے عرض کی، جی ہاں! یا رب! لیکن میں تیری رحمت و برکت سے بے پروا نہیں ہو سکتا۔"[2]

عطاء بن ابی رباح جو سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد تھے، بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابن عباسؓ نے ان سے کہا، کیا میں تمھیں ایک جنتی خاتون نہ دکھلاؤں؟ میں نے کہا، کیوں نہیں! تو انھوں نے فرمایا، یہ جو کالے رنگ کی عورت ہے، یہ ایک مرتبہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی، مجھے مرگی کا دورہ پڑتا ہے جس کی وجہ سے میں بے پردہ ہو جاتی ہوں، لہٰذا آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دعا کیجیے۔ تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اگر تم چاہو تو صبر کرو (اور اگر صبر و کرو گی تو) تمہارے لیے جنت ہے اور اگر چاہو تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمھیں

---

[1] ۔[ترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی الصبر علی البلاء: ۲۳۹۸۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء: ۴۰۲۳]

[2] ۔[بخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ: (وأیوب اذ نادیٰ ربہ۔۔الخ): ۳۳۹۱]

عافیت دے۔" (اب اس خاتون نے سوچا کہ ایک طرف صبر کرنے پر آخرت میں جنت کی ضمانت ہے اور دوسری طرف آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عافیت کے لیے دعا کرنے کی پیش کش فرما رہے ہیں اور اس میں جنت کی ضمانت نہیں ہے) تو اس نے کہا، میں صبر ہی کرتی ہوں، تاہم میں مرگی کے دورہ میں بے پردہ ہو جاتی ہوں تو آپ بس یہ دعا کر دیجیے کہ میں کم از کم بے پردہ نہ ہوں۔ تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے حق میں دعا فرمائی۔ [1]

سیدنا انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، جب میں اپنے بندے کو اس کی دو پسندیدہ چیزوں (یعنی آنکھوں) کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالتا ہوں (یعنی اس کی بینائی چھین لیتا ہوں) پھر وہ اس پر صبر کرتا ہے تو میں اس کی آنکھوں کے بدلے میں اسے جنت عطا کرتا ہوں۔" [2]

حضرت ایوب (علیہ السلام) کو آزمائش میں مبتلا کیا جانا

دکتور محمد بن محمد ابوشہبہؒ اپنی کتاب "اَلْاِسْرَاءِیْلِیَاتُ وَالْمَوْضُوْعَاتُ فِیْ کُتُبِ التَّفْسِیْر" میں لکھتے ہیں کہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت فرمایا: "وہب بن منبہؒ سے ایوب (علیہ السلام) کے واقعہ میں ایک لمبا قصہ روایت کیا گیا ہے، جسے ابن جریر نے اور ابن ابی حاتمؒ نے سند کے ساتھ اس (وہب بن منبہ) سے نقل کیا ہے۔ بعد میں آنے والے کئی ایک مفسرین نے بھی اسے ذکر کیا

۱۔ [بخاری، کتاب المرض، باب فضل من یصرع من الریح: ۵۶۵۲۔ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب ثواب المؤمن فیما یصیبہ من مرض أو حزن: ۲۵۷۶]

۲۔ [بخاری، کتاب المرض، باب فضل من ذہب بصرہ: ۵۶۵۳]

ہے۔اس واقعہ میں غرابت ہے، ہم نے لمبا ہونے کی وجہ سے اسے ترک کر دیا ہے۔" ابوشہبہ فرماتے ہیں: "عجیب بات یہ ہے کہ روایات پر نقد کرنے والے حافظ ابن کثیر بھی ایوب (علیہ السلام) کے واقعہ میں انھی باتوں میں پڑ گئے ہیں جن میں دوسرے حضرات پڑے ہوئے تھے۔انھوں نے یہاں بہت سی اسرائیلیات ذکر فرمائی ہیں، جن پر کوئی تعاقب نہیں فرمایا، حالانکہ ان کے متعلق ہمارا مشاہدہ ہے کہ وہ ایسی جو بات بھی ذکر فرماتے ہیں اس کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ کہاں سے آئی اور اسلامی روایات میں کیسے داخل ہوئی ؟ میں نہیں سمجھتا کہ وہ ان روایات کو (بلا نقد) بیان کرنا جائز سمجھتے ہوں۔ چنانچہ انھوں نے ذکر کیا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ "ان کے سارے بدن میں جذام (کوڑھ) ہو گیا اور ان کے دل اور زبان کے سوا کوئی چیز سلامت نہ رہی، جن کے ساتھ وہ اللہ عزوجل کا ذکر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ پاس بیٹھنے والوں کو ان سے نفرت ہو گئی اور انھیں شہر کے ایک کونے میں الگ رہائش رکھنا پڑی۔ان کی بیوی کے سوا ان پر شفقت کرنے والا کوئی نہ رہا، جس نے ان کی آزمائش کے دوران ناقابل بیان مصیبتیں اٹھائیں، حتیٰ کہ وہ محنت مزدوری کرنے لگیں، بلکہ انھوں نے اسی وجہ سے اپنے بال بھی فروخت کر دیے۔" پھر ذکر فرماتے ہیں: "بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس آزمائش میں بہت لمبی مدت تک مبتلا رہے۔ پھر اختلاف ہے کہ انھیں اس دعا کے لیے بے قرار کرنے کا باعث کیا تھا؟ چنانچہ حسن بصری اور قتادہؒ نے کہا، ایوب (علیہ السلام) سات سال اور کچھ مہینے آزمائش میں مبتلا رہے، اس عرصے میں انھیں کوڑا پھینکنے کی جگہ میں ڈال دیا گیا اور ان کے بدن میں کیڑے پڑ گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی تکلیف دور فرمائی اور انھیں اجر عظیم عطا فرمایا اور ان کی بہت اچھی تعریف فرمائی۔اور وہب بن منبہ نے کہا کہ آپ تین سال تکلیف میں مبتلا رہے، نہ زیادہ نہ کم۔ سدی نے کہا، ایوب (علیہ السلام) کا گوشت جھڑ

گیا، صرف ہڈیاں اور پٹھے باقی رہ گئے۔" پھر ایک لمبا قصہ ذکر کیا، پھر ابن کثیر نے وہ واقعہ ذکر فرمایا جو ابن ابی حاتم نے اپنی سند سے عن الزہری عن انس بن مالک روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اللہ کے نبی ایوب (علیہ السلام) پر ان کی آزمائش اٹھارہ برس رہی۔ دور و نزدیک کے سب لوگوں نے انھیں چھوڑ دیا۔ ان کے دوستوں بھائیوں میں سے صرف دو آدمی صبح اور شام ان کے پاس آتے تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا، جانتے ہو! اللہ کی قسم! ایوب نے کوئی ایسا گناہ کیا ہے جو دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔ ساتھی نے کہا، وہ کیا ہے؟ اس نے کہا، اٹھارہ سال ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم نہیں کیا کہ اس کی تکلیف دور کر دیتا۔ جب شام کو دونوں ان کے پاس گئے تو اس آدمی نے اس بات کا ذکر کر دیا۔ ایوب (علیہ السلام) نے کہا، مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہاں یہ بات اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں دو آدمیوں کے پاس سے گزرتا جو جھگڑ رہے ہوتے، جس میں وہ اللہ کا ذکر کرتے تو میں گھر آ کر ان کی طرف سے کفارہ دے دیتا کہ کہیں وہ ناحق اللہ کا ذکر نہ کر رہے ہوں۔ اور وہ حاجت کے لیے باہر جایا کرتے تھے، جب فارغ ہو جاتے تو ان کی بیوی ہاتھ پکڑ کر لے آتی۔ ایک دن اس نے آنے میں دیر کی تو اسی جگہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی: (اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ) [ص:٤٢] "اپنا پاؤں مار، یہ نہانے کا اور پینے کا ٹھنڈا پانی ہے۔"

حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ ایوب (علیہ السلام) کے قصے میں سب سے صحیح روایت وہ ہے جو ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے بیان کی ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے، پھر یہ روایت بیان کی۔ شیخ ناصر الدین البانی نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ [1]

۱۔ (سلسلہ الاحادیث الصحیحہ: ۱۷۰)

مگر صحیح بات یہی ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ حافظ ابن حجر کے قول سے اس کا صحیح ہونا ثابت نہیں ہوتا، صرف دوسری روایتوں سے اس کا بہتر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اگر ان کی مراد اس حدیث کا صحیح ہونا ہو تب بھی ان کی بات محل نظر ہے۔ ابن کثیر نے "اَلْبِدَايَةُ وَالنِّهَايَةُ" میں ایوب (علیہ السلام) کے تذکرہ میں فرمایا: "هٰذَا غَرِيْبٌ رَفْعُهُ جِدًّا وَالْأَشْبَهُ أَنْ يَّكُوْنَ مَوْقُوْفًا" "اس روایت کا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مروی ہونا بہت ہی غریب ہے، زیادہ قریب یہی ہے کہ یہ صحابی کا قول ہے۔" اس روایت کی تمام سندوں میں زہری کی روایت "عن" کے لفظ کے ساتھ آئی ہے اور زہری کا اپنی تمام تر عظمت وجلالت کے باوجود مدلس ہونا معروف ومشہور ہے۔ اس لیے صحیحین کے سوا ان کی تدلیس والی روایت کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

ایوب (علیہ السلام) کے متعلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے صرف ایک صحیح حدیث آئی ہے۔ ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ایوب (علیہ السلام) کپڑے اتار کر غسل کر رہے تھے، غسل کے دوران ہی ان پر سونے کی ٹڈیوں کا ایک دَل (لشکر) آ گرا۔ ایوب (علیہ السلام) لپوں کے ساتھ اسے اپنے کپڑے میں بھرنے لگے تو انھیں ان کے رب نے آواز دی: "اے ایوب! کیا میں نے تمھیں اس سے غنی نہیں کر دیا جو تم دیکھ رہے ہو؟" انھوں نے عرض کی: "کیوں نہیں، تیری عزت کی قسم! لیکن میرے لیے تیری برکت سے کسی طرح بے پروائی ممکن نہیں۔" [1]

اس کے علاوہ ایوب (علیہ السلام) کے متعلق تمام اقوال تابعین یا صحابہ سے مروی ہیں اور سب وہب بن

---

[1] [بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالىٰ: (وأيوب إذ نادى ربه۔۔) :٣٣٩١]

منبہ کے بیان ہی کا خلاصہ یا تفصیل ہیں، جو صاف ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل سے لیے گئے ہیں۔ حقیقت صرف وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بیان پر اپنے پاس سے یا ان اہل کتاب سے لے کر اضافہ کرے جنھوں نے انبیاء پر تہمتیں باندھیں، بلکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو بھی نہیں بخشا اور کہہ دیا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ دیکھیے سورہ آل عمران (۱۸۱) اور یہ کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا) [المائدۃ:٦٤] "انھی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور ان کی باتوں کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی ہے۔"

3 ابوشہبہ فرماتے ہیں، ہمیں جو عقیدہ رکھنا واجب ہے وہ یہ ہے کہ ایوب (علیہ السلام) کی آزمائش یقیناً ہوئی، ان پر جسم اور اہل مال کی شدید تکلیف آئی، جس پر انھوں نے ایسا صبر کیا کہ صبر میں ضرب المثل بن گئے اور اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر ان کی تعریف فرمائی، مگر ان کی آزمائش اس حد تک نہیں پہنچی جو ان جھوٹی داستانوں میں بیان ہوئی ہے کہ انھیں جذام (کوڑھ) ہو گیا، ان کے سارے جسم پر پھوڑے بن گئے، انھیں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا۔ ان کے جسم میں کیڑے رینگتے پھرتے تھے اور ہڈیوں اور پٹھوں کے سوا سارا گوشت جھڑ گیا تھا اور ان سے دور ہی سے بدبو آتی تھی وغیرہ۔ ایوب (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے ہاں اس سے کہیں معزز و مکرم تھے کہ انھیں کوڑے پر پھینک دیا جائے، یا وہ ایسے مرض میں مبتلا ہوں جس سے لوگ ان کی دعوت سے متنفر ہوں۔ اللہ کا پیغام پہنچانے والا ہی اس قدر معیوب حالت میں ہو تو ایسی دعوت کا کیا فائدہ اور اس سے حاصل کیا ہوگا؟ پھر انبیاء ہمیشہ اپنی قوم کے اونچے نسب میں سے مبعوث کیے جاتے رہے ہیں (جیسا کہ حدیث ہرقل میں ہے)۔ ایوب (علیہ السلام) کی ایسی حالت

میں ان کا قبیلہ کہاں تھا کہ ان کی حفاظت کرتا، ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرتا، بجائے اس کے کہ ان کی بیوی لوگوں کے گھروں میں کام کرے، بلکہ اپنے سر کے بال فروخت کرتی پھرے اور ان پر ایمان لانے والے کہاں گئے، کیا سب انھیں چھوڑ گئے، کیا ایمان کا تقاضا یہی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی ساری داستانیں بے بنیاد ہیں، نہ عقل سلیم انھیں تسلیم کرتی ہے اور نہ صحیح نقل۔

ایوب (علیہ السلام) پر آنے والی بیماری ایسی ہرگز نہ تھی جس سے نفرت پیدا ہو، کیونکہ یہ ان کے منصب ہی کے خلاف تھا، بلکہ وہ اس قسم کی کوئی بیماری تھی جس کا جسم پر کوئی نشان ظاہر نہیں ہوتا، مثلاً کوئی جسمانی درد، ریوماٹزم، جوڑوں یا ہڈیوں وغیرہ کی تکلیف۔ جب اللہ کا فضل ہوا تو زمین پر پاؤں مارنے کے نتیجے میں نمودار ہونے والے چشمے کا ٹھنڈا پانی پینے اور اس کے ساتھ غسل کرنے سے مکمل شفایاب ہو گئے۔

قاضی ابوبکر ابن العربیؒ کی بات دل کو بہت لگتی ہے، وہ فرماتے ہیں: "ایوب (علیہ السلام) کے معاملے میں کوئی بات ثابت نہیں سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی کتاب میں دو مقامات پر بتائی ہے، ایک: (وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ) [الانبیاء: ۸۳] اور دوسری: (رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ) [ص: ۴۱] رہے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! تو آپ سے اس حدیث کے سوا ایوب (علیہ السلام) کے متعلق ایک حرف بھی ثابت نہیں جس میں ان پر غسل کے دوران سونے کی ٹڈیاں گرنے کا ذکر ہے۔ پھر جب اس کے سوا قرآن اور حدیث میں کوئی بات ثابت ہی نہیں تو وہ کون صاحب ہیں جنھوں نے ایوب (علیہ السلام) کا حال آنکھوں سے دیکھا یا کانوں سے سنا؟ رہی اسرائیلی روایات! تو وہ علماء کے نزدیک قطعی طور پر متروک ہیں، اس لیے ان کے پڑھنے سے اپنی نگاہیں بچا کر رکھو اور ان کے سننے سے اپنے کان بند رکھو۔ کیونکہ وہ تمہاری سوچ میں محض خیال کا اور دل

میں صرف خرابی کا اضافہ کریں گی۔ابن عباس ؓ نے فرمایا: "اے مسلمانو کی جماعت! تم اہل کتاب سے کس طرح سوال کرتے ہو، جب کہ تمہاری کتاب، جو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کی گئی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی خبروں میں سے سب سے تازہ ہے۔تم اسے اس حال میں پڑھتے ہو کہ اس میں کوئی ملاوٹ نہیں کی گئی اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو لکھا تھا اہل کتاب نے اسے بدل دیا اور انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اللہ کی کتاب میں تبدیلی کر دی اور کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، تا کہ اس کے ساتھ بہت تھوڑی قیمت حاصل کریں۔تو کیا تمہارے پاس جو علم آیا ہے وہ تمہیں ان سے سوال کرنے سے منع نہیں کرتا؟ نہیں! قسم ہے اللہ کی! ہم نے ان میں سے کسی آدمی کو کبھی تم سے اس کے متعلق سوال کرتے ہوئے نہیں دیکھا جو تم پر نازل کیا گیا ہے۔"[1]

آخر میں ابو شہبہ نے آلوسی، طبری اور دوسرے علماء سے اس مفہوم کی عبارتیں نقل کی ہیں۔

﴿ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ ۖ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِينَ ﴿٨٥﴾ وَأَدْخَلْنٰهُمْ فِي رَحْمَتِنَا ۖ إِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِينَ ﴿٨٦﴾ ﴾

اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل (علیہم السلام) کو (بھی یاد کرو) یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے۔(۸۵) اور ہم نے انہیں اپنی خاص رحمت میں داخل کر لیا بلاشبہ وہ صالحین میں سے تھے۔(۸۶)

انبیاء کا ذکر جاری ہے۔حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کا تفصیلی ذکر سورہ مریم میں ہو چکا ہے۔

---

[1] [بخاري، الشهادات، باب لا يسأل أهل الشرك عن الشهادة وغيرها: ٢٦٨٥]

حضرت اسماعیل اور حضرت ادریس (علیہما السلام) کا تذکرہ

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب (علیہ السلام) کے صبر کا ذکر فرمایا تھا اور ان آیتوں میں حضرت اسماعیل، حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل علیہم السلام کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ یہ حضرات بھی سختیوں، مصائب اور عبادت کی مشکلات پر صبر کرنے والے تھے۔ رہے حضرت اسماعیل (علیہ السلام) تو انہوں نے اپنے والد کے حکم پر ذبح کئے جانے کو صبر کے ساتھ تسلیم کرلیا، اور ان کے والد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) ان کو غیر آباد بیابان میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اس پر انہوں نے صبر کیا، جہاں پر نہ ایسے مویشی تھے جن کا دودھ دوہا جاسکے اور نہ کھیت اور باغات تھے جن سے زمین کی پیداوار حاصل ہو سکے۔ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) صبر وسکون کے ساتھ اس جگہ رہتے رہے اور صبر کے ساتھ ہی اپنے والد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ مل کر بیت اللہ کی تعمیر کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس صبر کا یہ پھل عطا فرمایا کہ قائد المرسلین اور ختام النبیین حضرت سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آپ کی صلب سے پیدا فرمایا۔ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی مکمل سوانح ہم ابراہیم :39 میں بیان کر چکے ہیں۔

حضرت ادریس (علیہ السلام) کی مفصل سوانح ہم مریم :56 میں ذکر کر چکے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تا کہ وہ ان کو توحید کا پیغام سنائیں ان کو قوم نے اس پیغام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر دیا اور حضرت ادریس (علیہ السلام) کو چوتھے آسمان پر اٹھالیا۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی معراج کے موقعہ پر ادریس (علیہ السلام) سے ملاقات:

آپ فرماتے ہیں پھر جبرائیل مجھے چوتھے آسمان پر لے کر چڑھے دروازہ کھولنے کو کہا۔ سوال ہوا کہ کون ہے؟ کہا: میں جبرائیل ہوں۔ پوچھا: تمہارے ساتھ کون ہے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں پوچھا گیا کیا انہیں بلوایا گیا ہے؟ جبرائیل نے کہا: ہاں کہا گیا: خوش آمدید جو آیا ہے کتنا ہی اچھا ہے؟ دروازہ کھول دیا گیا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو وہاں ادریس (علیہ السلام) تھے جبرائیل نے کہا: یہ ادریس (علیہ السلام) ہیں انہیں سلام کریں۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا: صالح بھائی اور پیغمبر کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ [1]

کیا حضرت ذوالکفل نبی تھے؟

تفسیر درمنثور میں حضرت ابن عباس و حضرت مجاہدؒ وغیرھما سے کچھ باتیں نقل کی ہیں۔ بظاہر یہ سب اسرائیلی روایات ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ انبیاء سابقین میں سے ایک نبی تھے۔ انہوں نے اپنی امت کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم میں سے کون شخص ایسا ہے جو میری امت کے درمیان فیصلہ کرنے (یعنی قاضی بننے) کی ذمہ داری لیتا ہے اور میری شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ عہدہ قبول کرے وہ غصہ نہ ہو۔ ان میں سے ایک جوان کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ میں اس کا ذمہ دار بنتا ہوں۔ تین مرتبہ یہی سوال و جواب ہوا۔ جب تین مرتبہ اس جوان نے ذمہ داری لے لی تو اس سے قسم کھلوائی۔ اس نوجوان نے قسم کھالی اور اس کو قضا کا عہدہ سپرد کر دیا گیا۔ ایک دن دوپہر کے وقت شیطان آیا جبکہ یہ نوجوان قاضی نیند میں تھے۔ اس نے انہیں آواز دے کر جگایا اور ان سے کہا کہ فلاں شخص نے مجھ پر زیادتی کی ہے۔ میری مدد کیجیے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر چل دیئے۔ تھوڑی دور چلے کہ شیطان اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگ گیا۔

---

[1]۔ [رواہ البخاری: باب المعراج]

چونکہ شیطان بے وقت مدعی بن آیا، اوران کوسوتے سے جگایا پھر بھی غصہ نہ ہوئے اور جو ذمہ داری لی تھی اس پر قائم رہے۔اس لیے ان کا نام ذوالکفل رکھ دیا گیا۔یعنی ذمہ داری والا شخص۔

اس کونقل کرنے کے بعد صاحب درمنثور نے بحوالہ عبدالرزاق وعبد بن حمید وغیرھما نقل کیا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ ذوالکفل نبی نہیں تھے لیکن بنی اسرائیل میں ایک صالح آدمی تھے جو روزانہ دن بھر نماز پڑھتے تھے۔جب ان کی وفات ہوگئی تو ان کے بعد ایک اور شخص نے اسی طرح دن بھر نماز پڑھنے کا عہد کیا۔چنانچہ وہ اس پر عمل کرتے تھے۔اس وجہ سے ان کا نام ذوالکفل (ذمہ داری والا شخص) رکھ دیا گیا۔اس سلسلہ میں مفسرین نے سنن ترمذی سے بھی ایک حدیث نقل کی ہے اور وہ یہ ہے کہ ذوالکفل بنی اسرائیل میں سے ایک شخص تھا جو کسی بھی گناہ سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔اس کے پاس ایک عورت آئی اس نے اس عورت کو اس شرط پر ساٹھ دینار دیئے کہ اس کے ساتھ برا کام کرے۔جب وہ اس کے اوپر بیٹھ گیا تو وہ عورت کانپ گئی اور رونے لگی۔وہ کہنے لگا تو کیوں روتی ہے میں نے تجھ سے کوئی زبردستی تو نہیں کی۔وہ کہنے لگی کہ بات تو ٹھیک ہے۔لیکن یہ ایسا کام ہے جو میں نے کبھی نہیں کیا۔ضرورت نے مجبور کیا اس لیے میں اس پر آمادہ ہوگئی۔اس پر اس نے کہا کہ اچھا یہ بات ہے؟ یہ کہہ کر وہ ہٹ گیا اور وہ ساٹھ دینار بھی دے دیئے اور کہنے لگا کہ اللہ کی قسم اس کے بعد میں کوئی گناہ نہیں کروں گا۔پھر اسی آنے والی رات میں مر گیا۔صبح کو اس کے دروازہ پر یوں لکھا ہوا تھا کہ بلاشبہ اللہ نے کفل کو بخش دیا۔امام ترمذی نے یہ واقعہ ابواب صفۃ القیامۃ میں نقل فرمایا ہے اور اس کو حدیث حسن بتایا ہے۔لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ اسی شخص کا واقعہ ہو جس کو قرآن مجید نے ذوالکفل بتایا ہے اور اگر اسی شخص کا واقعہ ہو تو پھر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ ذوالکفل نبی نہیں تھے۔چونکہ انبیاء کرام نبوت سے پہلے بھی کبائر سے

محفوظ ہوتے ہیں۔ پھر مزید بات یہ ہے کہ حدیث شریف میں ذوالکفل نہیں ہے۔ لفظی مشابہت کی وجہ سے مفسرین نے اس قصہ کو یہاں نقل کر دیا۔

حضرت ذوالکفل کو نبی بنانے کا واقعہ

اللہ تعالیٰ نے الانبیاء:85 میں حضرت ذوالکفل کا حضرت اسماعیل اور حضرت ادریس کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ص 48 میں حضرت اسماعیل اور السیع (علیہما السلام) کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح تعریف اور تحسین کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے اور ان کا ذکر انبیاء (علیہم السلام) کے ذکر کے ساتھ ملا کر رکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی تھے اور یہی قول مشہور ہے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ نبی نہ تھے لیکن نیک اور عادل حکمران تھے۔ امام ابن جریرؒ نے اس مسئلہ میں توقف کیا ہے۔

مجاہدؒ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت الیسع (علیہ السلام) بوڑھے ہو گئے تو انہوں نے کہا کاش میں کسی شخص کو اپنی زندگی میں خلیفہ مقرر کر دوں اور دیکھوں کہ وہ کس طرح عمل کرتا ہے پھر انہوں نے لوگوں کو جمع کر کے کہا جو شخص میری تین شرطیں پوری کرے گا، میں اس کو خلیفہ بنا دوں گا۔ فرمایا وہ دن کو روزہ رکھے، رات کو نماز میں قیام کرے اور کسی پر غصہ نہ کرے۔ ایک شخص کھڑا ہو گیا جس کو لوگ غیر اہم سمجھتے تھے، اس نے کہا میں ایسا کروں گا۔ حضرت الیسع (علیہ السلام) نے اس دن اس کو لوٹا دیا۔ دوسرے دن پھر اسی طرح فرمایا، لوگ خاموش رہے اور وہ شخص پھر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا میں اس طرح کروں گا تو حضرت الیسع (علیہ السلام) نے اس کو خلیفہ بنا دیا۔ پھر شیطان ان کو لغزش دینے کے لیے پہنچا اور وہ ان کے پاس اس وقت گیا جب وہ قیلولہ (دوپہر کے وقت آرام کرنے) کے لیے لیٹ گئے تھے، وہ رات کو بالکل نہیں سوتے تھے اور دن کو اسی وقت سوتے تھے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا، انہوں نے پوچھا تم کون

ہو اس نے کہا۔ میں بوڑھا مظلوم شخص ہوں۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو اس نے کہا میرا کچھ لوگوں سے جھگڑا ہے۔ انہوں نے مجھ پر ظلم کیا اور اب تک مارتے پیٹتے رہے حتیٰ کہ صبح ہوگئی اور دوپہر آ گئی۔ انہوں نے کہا کہ تم شام کو میرے پاس آنا میں تمہارا حق ان سے لے کر دوں گا۔ حضرت الیسع (علیہ السلام) مجلس میں گئے اور وہ دیکھنے لگے کہ وہ بوڑھا شخص نظر آ رہا ہے یا نہیں، انہوں نے اس بوڑھے شخص کو نہیں دیکھا۔ دور سے وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر رہے تھے، وہ اس بوڑھے کا انتظار کرتے رہے، وہ نہیں آیا پھر وہ دوپہر کو اپنے گھر گئے اور سونے کے لیے بستر پر لیٹ گئے تو اس نے دروازہ کھٹکھٹایا، پوچھا کون ہے؟ اس نے کہا ایک بوڑھا مظلوم آدمی ہے۔ انہوں نے کہا کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ جب میں فیصلہ کے لیے بیٹھوں تم اس وقت میرے پاس آنا؟ اس نے کہا وہ بہت خبیث لوگ ہیں، جب انہوں نے دیکھا کہ آپ بیٹھے ہوئے ہیں تو انہوں نے کہا ہم تمہیں تمہارا حق ادا کر دیتے ہیں اور جب آپ اٹھ کر چلے گئے تو پھر انہوں نے مجھے حق دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا اب تم جاؤ، جب میں فیصلہ کے لیے جاؤں تو تم میرے پاس آ جانا۔ ان کا قیلولہ (دوپہر کا سونا) اس دن بھی رہ گیا۔ دوسرے دن وہ پھر اس کا انتظار کرتے رہے، وہ نہیں آیا۔ ان کو اونگھ بہت ستا رہی تھی، انہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا تم اس دروزاہ کے قریب کسی کو مت آنے دینا حتیٰ کہ میں سو جاؤں کیونکہ مجھے بہت سخت نیند آ رہی ہے، وہ اسی وقت آ گیا گھر والوں نے کہا پیچھے جاؤ پیچھے جاؤ۔ اس نے کہا میں ان کے پاس کل آیا تھا اور میں نے ان سے اپنے معاملہ کا ذکر کیا تھا۔ گھر والوں نے کہا۔ نہیں خدا کی قسم! انہوں نے ہمیں منع کیا ہے کہ کسی کو میرے قریب نہ آنے دینا کیونکہ میں کئی دن سے سو نہیں سکا۔ جب وہ تھک گیا تو اسے گھر میں ایک روشن دان نظر آیا، وہ اس میں سے گھر میں داخل ہو گیا اور کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے گا۔ وہ بیدار ہو گئے اور کہا

اے فلاں شخص! میں نے تم کو حکم نہیں دیا تھا، میں دیکھتا ہوں کہ تم آئے کہاں سے ہو۔ انہوں نے دیکھا گھر کا دروازہ اسی طرح بند تھا جس طرح انہوں نے بند کیا تھا اور وہ شخص ان کے ساتھ تھا پھر وہ اس کو پہچان گئے کہ یہ شیطان ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے؟ اس نے کہا ہاں! تم نے مجھے ہر داؤ میں ناکام کر دیا۔ میں نے جو کچھ کیا وہ تم کو غضب میں لانے کے لیے کیا تھا، تب اللہ تعالیٰ نے ان کا نام کفل ضامن) رکھا کیونکہ انہوں نے جس چیز کا ذمہ لیا تھا اس کو پورا کر دیا۔ [1]

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ اور مجاہد ؒ نے یہ کہا کہ حضرت ذوالکفل نبی نہیں تھے اور جمہور کا قول یہ ہے کہ وہ نبی تھے اور یہ قول حسب ذیل وجوہ سے راجح ہے:

(۱) ذوالکفل آپ کا نام ہے یا لقب، ظاہر ہے یہ آپ کا نام ہے اور آپ کا یہ نام اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے اور کفل کا معنی ہے غیر نبی کے ثواب کا حصہ نبی سے زیادہ نہیں ہوسکتا، اس لیے لازماً ماننا پڑے گا کہ آپ نبی تھے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے آپ کا ذکر حضرت اسماعیل اور حضرت ادریس (علیہما السلام) کے ساتھ کیا ہے اور مقصد اپنے فضیلت والے بندوں کا ذکر کرنا تھا تا کہ ان کی اقتداء کی جائے اس سے معلوم ہوا کہ آپ نبی تھے۔

(۳) اس سورت کا نام سورہ الانبیاء ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں جن کا تعظیماً ذکر کیا جائے، وہ نبی ہوں۔ [2]

۱۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: 13702 تفسیر کبیر ج ۸ ص 177، البدایہ والنہایہ ج ۱ ص 313)

۲۔ (تفسیر کبیر ج ۸ ص 177 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1415ھ)

﴿ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۖ﴿۸۷﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴿۸۸﴾ ﴾

اور مچھلی والے یعنی حضرت یونس (علیہ السلام) کو بھی (یاد کرو) جب کہ وہ اپنی قوم سے خفا ہو کر چلے گئے تھے اور انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم اس پر کوئی گرفت نہیں کریں گے، پھر انہوں نے اندھیروں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے، بیشک میں ہی قصوروار ہوں۔ (۸۷) پھر ہم نے اس کی پکار سن لی اور اس کو غم سے نجات دی۔ اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح نجات دیا کرتے ہیں۔ (۸۸)

ذولنون سے مراد حضرت یونس ہیں۔ قدیم صحیفوں میں ان کا نام یوناہ آیا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر ذوالنون (مچھلی والا) کے لقب سے کیا ہے۔ نون مچھلی کو کہتے ہیں چونکہ ان کو مچھلی نے نگل لیا تھا اس وجہ سے ان کو یہ لقب عطا ہوا جس میں مچھلی کے واقعہ کی تلمیح بھی ہے اور ایک قسم کا پیار بھی۔

ذوالنون سے مراد یونس (علیہ السلام) ہیں۔ "نون" مچھلی کو کہتے ہیں، چونکہ مچھلی نے انھیں اللہ کے حکم سے نگل لیا تھا، اسی لیے اللہ نے اس لقب کے ساتھ ان کا ذکر فرمایا ہے۔ انھیں "موصل" کے علاقے میں

نینویٰ والوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ آپ نے لوگوں کو توحید باری تعالیٰ، عدل و انصاف اور اخلاق حسنہ کی دعوت دی، لیکن انھوں نے ان کی دعوت کو قبول نہیں کیا، بلکہ دن بدن ان کی شر انگیزی بڑھتی ہی گئی۔ آخر کار ان کے کفر سے تنگ آ کر انھیں دھمکی دی کہ اگر وہ ایمان نہیں لائیں گے تو ان پر اللہ کا عذاب آ کر رہے گا اور خود وہاں سے نکل کر بیت المقدس آ گئے اور وہاں سے یافا کی طرف روانہ ہونے کے لیے ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ تیز آندھی چلنے لگی اور کشتی کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ پھر لوگوں نے کشتی کا بوجھ کم کرنے کے لیے اپنا سامان سمندر میں پھینک دیا، اس کے بعد بھی خطرہ نہ ٹلا، تو انھوں نے سوچا کہ کشتی میں ضرور کوئی ایسا آدمی ہے جس کی وجہ سے خطرہ لاحق ہے، چنانچہ قرعہ اندازی کی تو یونس (علیہ السلام) کے نام کا قرعہ نکل آیا، اس لیے لوگوں نے انھیں سمندر میں پھینک دیا تو طوفان رک گیا۔ اللہ نے ایک مچھلی کو بھیجا جس نے انھیں نگل لیا، پھر انھوں نے مچھلی کے پیٹ ہی میں دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قبول کر لی اور مچھلی نے ساحل پر آ کر اپنے پیٹ سے انھیں باہر نکال دیا، جیسا کہ ارشاد فرمایا ﴿وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۳۹ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝۱۴۰ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ۝۱۴۱ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ۝۱۴۲ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝۱۴۳ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۴۴ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ۝۱۴۵ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ۝۱۴۶ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝۱۴۷ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ﴾ [الصافات: ۱۳۹ تا ۱۴۸] ”اور بلاشبہ یونس یقیناً رسولوں میں سے تھا۔ جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگ کر گیا۔ پھر وہ قرعہ میں شریک ہوا تو ہارنے والوں میں سے ہو گیا۔ پھر مچھلی نے اسے نگل لیا، اس حال میں کہ وہ مستحق ملامت تھا۔ پھر اگر یہ

بات نہ ہوتی کہ بیشک وہ تسبیح کرنے والوں سے تھا۔تو یقیناً اس کے پیٹ میں اس دن تک رہتا جس میں لوگ اٹھائے جائیں گے۔ پھر ہم نے اسے چٹیل میدان میں پھینک دیا، اس حال میں کہ وہ بیمار تھا۔اور ہم نے اس پر ایک بیل دار پودا اگا دیا۔اور اسے ایک لاکھ کی طرف بھیجا، بلکہ وہ زیادہ ہونگے۔ پس وہ ایمان لے آئے تو ہم نے انھیں ایک وقت تک فائدہ دیا۔"

فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ: سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ذوالنون کی دعا جو انھوں نے مچھلی کے پیٹ میں کی ایسی ہے کہ جو مسلمان بھی اس کے ذریعے سے دعا کرے، اللہ اس کی دعا قبول کرتا ہے (وہ دعا یہ ہے): (لَا إِلٰهَ إِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ) "تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، یقیناً میں ظلم کرنے والوں سے ہو گیا ہوں۔"[1]

﴿ وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۝۸۹ۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝۹۰ ﴾

اور زکریا (علیہ السلام) کو بھی یاد کرو جب انھوں نے اپنے رب کو پکارا کہ اے

---

[1] [ترمذی، کتاب الدعوات، باب [فی دعوۃ ذی النون۔۔]:۳۵۰۵۔مسند أحمد:۱/۱۷۰، ح:۱۴۶۶]

میرے رب تو مجھے تنہا نہ چھوڑ اور تو سب سے بہتر وارث ہے۔(۸۹) پھر ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحییٰ (علیہ السلام) عطا کیا اور اس کی بیوی کو (جو کہ بانجھ تھیں) اولاد کے قابل کر دیا۔ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں سبقت کرنے والے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔(۹۰)

ربط کلام: حضرت یونس (علیہ السلام) مچھلی کے پیٹ میں اکیلے تھے اور حضرت زکریا (علیہ السلام) بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو اکیلا خیال کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ دونوں کی دعا کو قبول فرمایا اس لیے یونس (علیہ السلام) کے بعد حضرت زکریا (علیہ السلام) اور ان کے لخت جگر حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کا تذکرہ کیا ہے۔

حضرت مریم جب بڑی ہوئیں تو انہیں حضرت زکریا (علیہ السلام) کی کفالت میں دیا گیا۔ اس زمانے کے مذہبی رواج کے مطابق اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف لوگ تارک الدّنیا ہو کر مسجد اقصیٰ میں تعلیم و تربیت اور ذکر و اذکار میں مصروف رہتے تھے۔ ان میں وہ عورتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ جنہوں نے اپنے آپ کو دنیا کے معاملات سے الگ کر لیا ہوتا تھا۔ حضرت مریم (علیہ السلام) انہی ذاکرات میں شامل ہو کر اپنے حجرے میں محو عبادت رہا کرتی تھیں۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام ان کے خالو حضرت زکریا (علیہ السلام) کے سپرد تھا۔ ایک دن زکریا (علیہ السلام) ان کے ہاں حجرے میں تشریف لائے تو ان کے پاس غیر موسمی عمدہ پھل دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ حیران ہو کر پوچھتے ہیں کہ بیٹی مریم یہ پھل کہاں سے آئے

ہیں؟ مریم (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے بلا حساب رزق سے نوازتا ہے۔ یہ سنتے اور اللہ کی قدرت دیکھتے ہی حضرت زکریا (علیہ السلام) کے رونگٹے کھڑے ہوئے اور وجود تھر تھرّانے لگا اور بے ساختہ ہاتھ "اللہ" کے حضور اٹھے اور فریاد کرنے لگے کہ اے میرے رب! مجھے بھی اپنی جناب سے نیکوکار اولاد نصیب فرما یقیناً تو دعا سننے والا ہے زکریا (علیہ السلام) ابھی اسی حجرے میں نماز کی حالت میں کھڑے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملائکہ کا نزول ہوا اور انہوں نے آپ کو یہ نوید سنائی کہ اے زکریا! خوش ہو جایئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بیٹا عطا فرمائیں گے جس کا نام یحییٰ ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے کلمے کی تصدیق کرے گا اور سردار ہوگا۔ نہایت ہی پاک باز، اپنے آپ کی حفاظت کرنے والا اور انبیاء میں سے ہوگا۔

بیٹے کی خوشخبری سناتے ہوئے ملائکہ نے یہ بھی کہا اس کا نام یحییٰ ہوگا اور اس سے پہلے اس نام کا کوئی شخص نہیں ہوا۔ تو زکریا (علیہ السلام) حیرت زدہ ہو کر اللہ کے حضور عرض کرتے ہیں کہ بارگاہ الٰہی! مجھے کس طرح بیٹا نصیب ہوگا جب کہ میں بوڑھا اور میری بیوی جسمانی طور پر بچہ جننے کے قابل نہیں؟ ملائکہ نے خوشخبری سنائی تو تعجب کا اظہار فرمانے لگے مگر تعجب کا اظہار ملائکہ سے کرنے کے بجائے براہ راست اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں۔ کیونکہ اولاد دینے والا تو وہی ہے اور یہ خوشخبری بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی۔ فرشتہ تو محض پیغام رساں ہے۔ زکریا (علیہ السلام) کے تعجب کے جواب میں ارشاد ہوا کہ میرے بندے! اللہ اپنے کام کو خود ہی جانتا ہے اور وہ اسی طرح ہی کرتا ہے جس طرح اس کی منشا ہوا کرتی ہے۔ پھر عرض کرنے لگے: اے رب! میرے لیے بیٹے کی کوئی واضح نشانی ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارے کے علاوہ کلام نہیں کر سکو گے۔ ان ایام میں خاص طور پر صبح و شام

اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کا شکریہ ادا کرتے رہو۔

سیدنا یحییٰ (علیہ السلام) کا ذکر گرامی

حضرت یحییٰ (علیہ السلام) حضرت زکریا (علیہ السلام) کے صاحبزادے اور ان کی پیغمبرانہ دعاؤں کا ثمرہ ہیں۔ جس عمر میں اولاد کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے اس عمر میں حضرت زکریا کو حضرت یحییٰ (علیہ السلام) عطا کئے گئے اور نام بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجویز ہوا۔ جو اس سے پہلے کسی شخص کا نام نہ تھا۔

خصوصی صفات:

۱۔ "حَکَم یعنی قوت فیصلہ، معاملات میں ٹھیک، ٹھیک فیصلہ سنانے والا۔

۲۔ حَنَّانَ دل کی نرمی اور شفقت یعنی انتہائی درجے کی شفقت جو ماں کو اپنے بچے کے ساتھ ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ بچے کی تکلیف پر تڑپ اٹھتی ہے اس سے کہیں زیادہ حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کے دل میں بندگان خدا کے لیے شفقت پیدا کی گئی تھی۔

۳۔ "حُصُوْرً" لذات وشہوات پر قابو پانے والا انتہا درجہ محتاط و متقی۔

حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کے حالات زندگی

تاریخی روایات کے مطابق حضرت یحییٰ (علیہ السلام) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے چھ ماہ بڑے تھے، ان کی اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ آپس میں حقیقی بہنیں تھیں۔ تقریباً تیس سال کی عمر میں منصب نبوت پر فائز کئے گئے۔ شرق اردن کے علاقے میں دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ لوگو! توبہ کرو اور نماز، روزے کی پابندی اختیار کرو۔

حضرت یحییٰ (علیہ السلام) اپنے والد حضرت زکریا (علیہ السلام) کی طرح اولوالعزم نبی تھے تورات کی شریعت کے پابند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یحییٰ (علیہ السلام) کو تین اوقات میں سلامتی سے نوازا۔

﴿ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩١﴾ ﴾

اور اس خاتون (مریم (علیہا السلام)) کو بھی یاد کرو جس نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا ۔ پھر ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی ان کو اور انکے بیٹے کو اہل عالم (دنیا والوں) کے لیے نشانی بنا دیا۔

حضرت مریم علیہا السلام کا تذکرہ

ان عظیم شخصیتوں کا ذکر ہو رہا ہے جنھوں نے ہر طرح کے ناموافق حالات میں اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کیا اور پھر اسی کو پکارا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے صبر اور استقامت کی لاج رکھی اور ان کی دُعاؤں کو قبول فرماتے ہوئے ان کو کامیابیوں سے نوازا۔ انھیں میں سے حضرت مریم (علیہا السلام) بھی ہیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے اظہار اور اپنی ایک نشانی دکھانے کے لیے بہت بڑے امتحان میں ڈالا۔ نہایت نیک نام خاندان کی دختر نیک اختر ہوتے ہوئے کنوار پن میں انھیں بچے کی ماں بننے کی آزمائش میں مبتلا کیا۔ انھوں نے ہر طرح کے حالات میں جس طرح اپنی عزت وعصمت کی حفاظت کی اور جس طرح اس عظیم ابتلا سے نہایت استقامت اور صبر کے ساتھ گزریں، اس پر اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے احسانات

سے نوازا۔

توالد وتناسل کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ نر اور مادہ کے اتصال سے سے توالد کا سلسلہ چلتا ہے اور انسانوں میں بھی اسی طرح نوع انسانی کا قافلہ چلتا رہا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ دنیا کو یہ دکھایا جائے کو نوع انسانی کا یہ قافلہ اپنے آپ محو سفر نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا قانون ہے جس کے نتیجے میں یہ قافلہ چل رہا ہے۔ وہ اگر چاہے تو اس قانون کو توڑ کر بغیر مرد اور عورت کے اتصال کے بچہ پیدا کرسکتا ہے۔ چنانچہ اپنی اس قدرت کے اظہار کے لیے حضرت مریم (علیہا السلام) کا انتخاب ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اظہار میں تو کوئی دشواری نہ تھی لیکن حضرت مریم (علیہا السلام) کے لیے اس ابتلا سے گزرنا ہزاروں مشکلات سے گزرنا تھا۔ خاندان کی نیک نامی کو بٹہ لگانا تھا، اپنی ذات اور اپنی شرم و حیاء کو لمبی زبانوں کی سولی پر لٹکانا تھا لیکن حضرت مریم (علیہا السلام) نے یہ سب کچھ برداشت کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس نشانی کے اظہار اور استقرارِ حمل کے لیے جو طریقہ اختیار کیا وہ نفخ روح تھا۔ اس سے سینٹ پال اور دوسرے گمراہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ چونکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی پیدائش نفخ خداوندی سے ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات چونکہ ازلی اور ابدی ہیں، اس لیے آپ (علیہ السلام) بھی ازلی اور ابدی ہیں۔ اور مزید براں یہ کہ صفات چونکہ موصوف کا حصہ ہوتی ہیں اور اس سے منفک نہیں ہوسکتیں۔ بنابریں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بھی خداوندِ ذوالجلال سے الگ نہیں بلکہ اس کی ذات کا حصہ ہیں۔ چنانچہ اسی گمراہی کے ازالے کے لیے پروردگار نے فرمایا۔ اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ”بیشک عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال اللہ تعالیٰ کے یہاں حضرت آدم کی مثال کی طرح

ہے۔" اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو ماں اور باپ دونوں کے بغیر صرف کلمہ کن سے پیدا کیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھی بغیر باپ کے کلمہ کن سے پیدا کیا گیا ہے اور مزید یہ بات کہ پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں مٹی سے ایک بشر بنا رہا ہوں۔ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ "پس جب میں اسے پورا بنالوں اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔" جس طرح حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی روح کے نفخ سے پیدا کیا۔ اس طرح حضرت آدم (علیہ السلام) کو بھی اپنی روح کے نفخ سے پیدا کیا۔ لیکن آج تک کبھی کسی شخص نے یہ نہیں کہا کہ آدم خدا ہیں، خدا کے بیٹے ہیں یا خدائی میں شریک ہیں۔

﴿ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٩٢﴾
وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۭ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿٩٣﴾ ﴾

بلاشبہ یہ تمہاری امت، جو ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، پس تم میری ہی عبادت کیا کرو۔ (۹۲) اور لوگوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، (بالآخر) وہ سب ہماری ہی طرف لوٹ کر آنے والے ہیں۔ (۹۳)

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔: بہت سے مفسرین نے یہاں امت سے مراد دین لیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کا قول نقل فرمایا: (اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَاۗءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ) [الزخرف: ۲۲] "بیشک ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک امت (یعنی ایک دین) پر چلتے پایا۔" یعنی تمہارا دین اور ملت ایک ہی ہے اور وہ ہے دین توحید، اور "هٰذِهٖ" سے مراد اس سے پہلے مذکور انبیاء، نوح، ابراہیم، اسحاق، یعقوب، لوط،

داؤد، سلیمان، ایوب، اسماعیل، ادریس، ذوالکفل، یونس، زکریا، مسیح ابن مریم ہیں کہ سب کا ایک ہی دین تھا اور سب توحید پر قائم تھے۔ کسی اور کو معبود، مشکل کشا، شفا دینے والا، بگڑی بنانے والا یا اولاد عطا کرنے والا نہیں سمجھتے تھے، یہ سب لوگ ایک ہی دین پر تھے کہ میں تمہارا رب ہوں، سو میری ہی عبادت کرو۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ہم انبیاء کی جماعت علاتی بھائی ہیں، جن کی مائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔

(1)۔

ہر نبی نے اپنے عہد کے لوگوں کو توحید باری تعالیٰ کی دعوت دی، شرک سے ڈرایا اور انھیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام مخلوقات کا رب ہے، اس لیے صرف اسی کی عبادت کرنی چاہیے، لیکن انبیاء کے دنیا سے گزر جانے کے بعد، ان کی امتیں مرور زمانہ کے ساتھ اصل توحید سے برگشتہ ہوتی چلی گئیں اور مختلف جماعتوں اور فرقوں میں بٹتی گئیں۔ کسی نے اپنا نام یہودی رکھ لیا، کسی نے نصرانی اور کوئی بت پرست بن گیا، جبکہ اصل دین، دین اسلام کا نام ان کے ذہنوں سے محو ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان تمام گروہوں کو ہمارے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے۔ تو ان میں سے جو لوگ موحد ہوں گے اور انھوں نے حالت ایمان میں اعمال صالحہ سرانجام دیے ہوں گے تو اللہ ان کی محنت کو رائگاں نہیں کرے گا، وہ اپنے فرشتوں کے ذریعے سے بندوں کے تمام اعمال لکھ رہا ہے۔ آخری آیت میں فرمایا کہ صالحین و موحدین کے مقابلے میں جو لوگ کافر و مشرک ہوں گے اور ان کے کفر و شرک کی وجہ سے اللہ انھیں دنیا میں ہلاک

۱۔ [بخاري، أحاديث الانبياء، باب (واذكر في الكتاب مريم۔۔): ۳۴۴۳۔ مسلم: ۲۳۶۵/۱۴۵]

کر دے گا تو قیامت کے دن وہ ضرور اپنے رب کے حضور جزا و سزا کے لیے لائے جائیں گے۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے قطعی طور پر حرام کر دیا ہے کہ وہ قیامت کے دن اس کے پاس لوٹ کر نہ آئیں۔

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً : ارشاد فرمایا : (يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ 51 ○ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ)[المؤمنون:۵۱، ۵۲] ”اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو، یقیناً میں اسے جو تم کرتے ہو، خوب جاننے والا ہوں۔ اور بیشک یہ تمہاری امت ہے، جو ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، سو مجھ سے ڈرو۔“

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”اللہ تمہارے لیے تین باتیں پسند کرتا ہے اور تین باتیں ناپسند کرتا ہے، وہ پسند فرماتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو، اس کے ساتھ ذرا سا بھی شرک نہ کرو، سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور فرقے فرقے نہ بنو اور اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ناپسند کرتا ہے بے فائدہ باتیں کرنے کو، سوال کی کثرت کو اور مال کے ضائع کرنے کو۔“ ---[1]

بہتر اور تہتر فرقے

۱۔ حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: یہود اکہتر یا بہتر فرقے تھے اور نصاریٰ کے بھی اتنے ہی فرقے تھے اور میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے۔ یہ حدیث حسن (صحیح) ہے۔[2]

۱۔ [مسلم، کتاب الأقضیۃ، باب النھی عن کثرۃ المسائل۔۔الخ: ۱۷۱۵]

۲۔ (ترمذی: ۲۶۴۰۔ ابواب الایمان۔ باب ۱۸)

۲۔حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: بنی اسرائیل کے بہتر فرقے تھے اور میری امت کے تہتر (۷۳) فرقے ہوں گے اور ایک ملت کے سوا باقی تمام فرقے جہنم میں ہوں گے۔ مسلمانوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! وہ کون سی ملت ہوگی؟ آپ نے فرمایا: جس پر میں اور میرے اصحاب رضوان اللہ علیہم ہیں۔ [۱]

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "آپس میں اختلاف نہ کرو، تم سے پہلے لوگوں نے اختلاف کیا تو وہ اسی باعث ہلاک و برباد ہو گئے۔" [۲]

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۹۷﴾ ﴾

پس جو کوئی نیک عمل کرے گا اس حال میں کہ وہ مومن ہو تو اس کے کام کی ناقدری

۱۔(ترمذی: ۲۶۴۱۔ابواب الایمان۔باب ۱۸)

۲۔[بخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب: ۳۴۷۶]

نہیں ہوگی اور یقیناً ہم اس کے لیے (اس کے اعمال کو) لکھنے والے ہیں۔(۹۴) اور جس بستی والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا ان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ (دنیا میں) پھر لوٹ کر آئیں۔(۹۵) یہاں تک کہ جب یاجوج ماجوج کھول دیئے جائیں گے اور وہ ہر اونچی جگہ سے دوڑتے ہوئے آئیں گے۔(۹۶) اور قیامت کا سچا وعدہ قریب آجائے گا تو پھر کفار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی اور کہنے لگیں گے کہ ہائے ہماری کم بختی ہم اس سے غافل رہے بلکہ ہم ہی ظلم کرنے والے تھے۔(۹۷)

ان آیات میں ایمان کے ساتھ نیک اعمال کی قید لگائی ہے کیونکہ جو شخص ایمان کے ساتھ کفر کرتا ہے، اس کے اعمال ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔

ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ (المائدہ: ۵) اور جو ایمان کا انکار کرتے ہیں، ان کے اعمال ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ابن جدعان زمانہ جاہلیت میں صلہ رحم کرتا تھا اور مسکینوں کو کھانا کھلاتا تھا، کیا یہ عمل اس کو نفع دے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ عمل اس کو نفع نہیں دے گا! اس نے ایک دن بھی یہ نہیں کہا اے میرے رب! قیامت کے دن میرے گناہوں کو بخش دینا۔۔۔[1]

امام احمدؒ کی ایک روایت میں ہے حضرت عائشہ نے کہا وہ مہمان نوازی کرتا تھا، قیدیوں کو قید سے چھڑاتا

۱۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: 214، مسند احمد ج ۶ ص 93، مسند احمد رقم الحدیث: 25128)

تھا، صہل رحم کرتا تھا پڑوسیوں سے حسن سلوک کرتا تھا اور میں نے اس کی تعریف کی کیا یہ اعمال اس کو نفع دیں گے؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: یہ اعمال اس کو نفع نہیں دیں گے، اس نے ایک دن بھی یہ نہیں کہا اے اللہ! مجھے قیامت کے دن بخش دینا۔ (۱)

علامہ قرطبی پر مواخذہ

علامہ قرطبی مالکی ؒ متوفی 668ھ نے لکھا ہے کہ اس آیت میں من تبعیضیہ ہے جنس کے لیے نہیں ہے، کیونکہ کسی مکلف میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ فرض اور نفل تمام عبادت کرے سو اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جس نے فرائض اور نوافل میں سے ایمان کی حالت میں کچھ بھی ادا کر لئے تو اس کی سعی مشکور ہوگی۔ (۲)

اگر سعی مشکور ہونے کا یہ معنی ہو کہ وہ جتنا عمل کرے گا اس کو ان کا ثواب مل جائے گا تو یہ تفسیر صحیح ہے اور اگر سعی مشکور ہونے کا یہ مطلب ہے کہ مغفرت ہو جائے گی تو یہ تفسیر صحیح نہیں ہے کیونکہ مغفرت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تمام فرائض اور واجبات کو بجالائے اور تمام محرمات اور مکروہات تحریمہ سے بچے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے۔ نیز علامہ قرطبی کا یہ لکھنا بھی صحیح نہیں ہے کہ تمام فرائض اور نوافل کو ادا کرنا مکلف کی قدرت میں نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کو اس کا مکلف کیا ہے کہ وہ تمام فرائض اور واجبات کو ادا کرے اور تمام محرمات اور مکروہات تحریمہ سے اجتناب کرے اور یہ اس کی قدرت میں ہے۔ البتہ نوافل کا اللہ تعالیٰ نے بندہ کو مکلف نہیں کیا، وہ ان کو اپنی طرف سے بجالاتا ہے۔

حرام کا بہ معنی واجب ہونا اور "لا" کا زادہ ہونا

الانبیاء: 95 کا لفظی ترجمہ اس طرح ہے جس بستی کے لوگوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں ان کا نہ لوٹنا حرام ہے،

۱۔ (مسند احمد رقم الحدیث: 25404، عالم الکتب، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: 330)

۲۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۱ ص 245 مطبوعہ بیروت)

حالانکہ ان کا دنیا میں لوٹ کر آنا حرام ہے اور نہ لوٹ کر آنا واجب ہے۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ بعض اوقات حرام واجب کے معنی میں ہوتا ہے یعنی کسی کام کا نہ کرنا واجب ہے، اس آیت میں اسی طرح ہے۔ اس کی نظیر یہ ہے: درج ذیل آیت کا بھی لفظی ترجمہ اس طرح ہے:

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم ان لاتشرکوا بہ شیئاً (الانعام-151) آپ کہیے آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام کر دیا ہے۔ وہ یہ ہیں کہ تم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ (اور اس کے علاوہ دوسری چیزیں ہیں)

حالانکہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا حرام ہے، شرک نہ کرنا حرام نہیں ہے۔ اسلئے اس آیت میں بھی حرام بہ معنی واجب ہے کیونکہ شرک نہ کرنا واجب ہے اور آیت کا معنی یہ ہے آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کا کرنا واجب ہے، وہ یہ ہیں کہ تم اللہ کے ساتھ شریک نہ کرو، الآیۃ اس اسلوب پر زیر تفسیر آیت کا معنی ہے جس بستی کے لوگوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں، ان کا (دنیا میں) نہ لوٹنا واجب ہے۔ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں "لا" زائد ہے اور اس کی نظیر یہ ہے:

مامنعک ان لاتسجد (الاعراف:12) تجھ کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے منع کیا۔

حالانکہ ابلیس کو سجدہ کرنے کا حکم تھا سجدہ نہ کرنے کا حکم نہیں تھا اس لیے یہاں بھی "لا" زائد ماننا پڑے گا اور اب معنی ہوگا تجھ کو سجدہ کرنے سے کس نے منع کیا؟ اسی اسلوب پر اس آیت کا معنی ہے: جن بستی والوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں ان کا (دنیا میں) لوٹنا حرام ہے۔

اس آیت کا ظاہر معنی تو یہی ہے کہ جس قوم کو ہم اس کے کفر پر اصرار کی وجہ سے عذاب سے ہلاک کر چکے ہیں، اس کا پھر دنیا میں امتحان کے لیے آنا شرعاً ممکن نہیں ہے، یہ معنی عکرمہ، قتادہ اور مقاتلؒ سے منقول

ہے، اور مجاہد اور حسنؒ نے یہ کہا ہے کہ جن لوگوں کو کفر پر اصرار کی وجہ سے ہلاک کیا جا چکا ہے، ان کا توبہ کرنا اور شرک اور کفر سے رجوع کرنا محال تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر دیا۔ امام ابن جریرؒ متوفی 310ھ نے بھی اول الذکر معنی کو ترجیح دی ہے۔ [1]

یاجوج ماجوج کا تذکرہ

الانبیاء: 96 میں فرمایا حتیٰ کہ جب یاجوج اور ماجوج (کی رکاوٹ) کو کھول دیا جائے گا اور وہ ہر بلندی سے دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ قیامت کے قریب وہ سد (دیوار) ٹوٹ جائے گی جس کو ذوالقرنین نے یاجوج ماجوج کے حملوں کو روکنے کے لیے بنایا تھا، اس رکاوٹ کے ٹوٹتے ہی یاجوج ماجوج اس طرح امڈ آئیں گے جس طرح دریا کا بند ٹوٹ جائے تو سیلاب امڈ آتا ہے۔ یاجوج ماجوج کا یہ حملہ، ان کی پیش قدمی اور یورش آخری زمانہ میں ہوگی اور اس کے بعد قیامت بہت جلد واقع ہوگی۔ درج ذیل حدیث سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

حضرت حذیفہ بن اسید الغفاریؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے پاس آئے، اس وقت ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ آپ نے پوچھا تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو؟ ہم نے عرض کیا ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: قیامت اس دن تک قائم نہیں ہوگی جب تک اس سے پہلے دس علامتیں نمودار نہ ہو جائیں پھر آپ نے (۱) دھوئیں (۲) دجال (۳) دابۃ الارض (۴) سورج کے مغرب سے طلوع ہونے (۵) حضرت عیسیٰ بن مریم کے نازل ہونے (۶) یاجوج اور ماجوج کے نکلنے اور تین بار زمین کے دھنسنے (۷) ایک بار مشرق میں دھنسنے (۸) ایک بار مغرب میں دھنسنے (۹) اور

---

[1] (جامع البیان جز 17 ص 113-114 مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

ایک بار جزیرۃ العرب میں دھنسنے کا ذکر فرمایا (۱۰) اور فرمایا ان کے آخر میں یمن کی طرف سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو ہانک کر میدان محشر کی طرف لے جائے گی۔ [1]

امام رازی نے لکھا ہے کہ یاجوج اور ماجوج انسانوں کی جنس سے دو قبیلے ہیں۔ [2]

اس جگہ اور اس جیسی دوسری ساری جگہوں پر قرآن کریم نے ہمیں یہ بتایا کہ یقیناوہ وقت اچانک آدھمکے گا اور اس کا منظر ایسا ہولناک ہوگا کہ آج جو لوگ بڑے زور وشور سے اس کا انکار کرتے ہیں اور طرح طرح کی ڈینگیں مارتے ہیں اور اس کا مطالبہ کرتے ہیں' اس کا مذاق اڑاتے ہیں ان کی آنکھیں دیکھتی کی دیکھتی رہ جائیں گے اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہوجائے گا اور وہ اس کی دہشت میں زبان سے کوئی بات بھی نہ نکال سکیں گے اور اس وقت ان کی زبانیں تو گنگ ہوں گی البتہ وہ زبان حال سے جو کچھ کہیں گے وہ یہی ہوگا کہ "افسوس ہم پر ہم تو اس کی طرف سے غفلت میں رہے بلکہ ہم ظلم وشرارت میں سرشار تھے۔

﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾ لَوْ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ﴾

بیشک تم اور جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے سب جہنم کا ایندھن ہو۔ تم سب

۱۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: 2901 سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 4311، سنن الترمذی رقم الحدیث: 2183 السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث: 113 ذ ڈسنن ابن ماجہ رقم الحدیث 4055)

۲۔ (تفسیر کبیر ج ۸ ص 186، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1415ھ)

دوزخ میں جانے والے ہو۔(۹۸)وہ کہیں گے)اگر یہ سب (واقعی) معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے اور سب اس میں ہمیشہ (جلتے) رہیں گے۔(۹۹)وہاں ان کو چیخنا چلانا ہوگا اور وہ اس میں کچھ نہ سن سکیں گے۔(۱۰۰)

شان نزول: (آیت) "انکم وما تعبدون"۔(الخ)

امام حاکم ؒ نے حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کیا ہے کہ جس وقت یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو ابن زبعری نے کہا کہ چاند سورج، ستارے، فرشتے، اور حضرت عزیر (علیہ السلام) ان کی پرستش ہوتی ہے، یہ سب ہمارے معبودوں کے ساتھ دوزخ میں جائیں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، (آیت) "ان الذین سبقت"۔(الخ) یعنی جن حضرات کے لیے جنت مقدر ہو چکی، وہ دوزخ سے اس قدر دور رہیں گے کہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے اور دوسری یہ آیت نازل ہوئی (آیت) "ولما ضرب مریم مثلا"۔تا "خصمون"۔(الخ)

یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو لات ومنات اور عزیٰ وہبل کی پوجا کرتے تھے۔ یہ سب پتھر کی مورتیاں تھیں، جو جمادات یعنی غیر عاقل تھیں، اسی لیے آیت میں (مَا تَعْبُدُوْنَ) کے الفاظ ہیں اور عربی میں "مَا" غیر عاقل کے لیے آتا ہے، یعنی کہا جا رہا ہے کہ تم بھی اور تمہارے یہ معبود بھی جن کی مورتیاں بنا کر تم نے عبادت کے لیے رکھی ہوئی ہیں سب جہنم کا ایندھن ہیں۔ پتھر کی مورتیوں کا اگرچہ کوئی قصور نہیں ہے، کیونکہ وہ تو غیر عاقل اور بے شعور ہیں، لیکن انھیں پجاریوں کے ساتھ جہنم میں صرف مشرکوں کو مزید ذلیل ورسوا کرنے کے لیے ڈالا جائے گا کہ جن معبودوں کو تم اپنا

سہارا سمجھتے تھے، وہ بھی تمہارے ساتھ ہی جہنم میں جہنم کا ایندھن ہیں اور اس وقت تمہیں یقین ہو جائے گا کہ اگر یہ اصنام تمہارے حقیقی معبود ہوتے تو تمہارے ساتھ جہنم کا ایندھن نہ بنتے، لیکن وہ تو خود بھی جہنم میں بطور عبرت جا رہے ہیں، تمہیں جانے سے کیسے روک سکتے ہیں۔ نتیجتاً عابد اور یہ جھوٹے معبود دونوں ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور سارے کے سارے شدت غم والم سے چیخ اور چلا رہے ہونگے، جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی آواز بھی نہیں سن سکیں گے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ ۙ أُولَٰئِكَ عَنْهَا
مُبْعَدُونَ ﴿١٠١﴾ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا ۚ وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ
أَنْفُسُهُمْ خَالِدُونَ ﴿١٠٢﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ
الْمَلَائِكَةُ هَٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿١٠٣﴾﴾

یقیناً وہ لوگ جن کے لیے پہلے سے ہماری طرف سے بھلائی کا فیصلہ ہو چکا ہے وہ اس سے دور رکھیں جائیں گے۔ (۱۰۱) وہ اس کی بھنک تک نہ سنیں گے اور وہ اپنی دل پسند نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۱۰۲) ان کو اس بڑی گھبراہٹ میں غم نہ ہوگا اور فرشتے ان کو لینے آئیں گے اور کہیں گے کہ "یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ (۱۰۳)

جن لوگوں کی فطرت اور کوشش کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان کے نصیب میں خیر اور نیکی رکھ دی ہے۔ وہ لوگ جہنم سے کوسوں دور رکھے جائیں گے۔ اس قدر جہنم سے دور اور محفوظ ہوں گے کہ نہ وہ جہنم کی آہٹ سنیں گے اور نہ جہنم کی بدبو ان تک پہنچ پائے گی۔ انھیں جنت میں وہ سب کچھ دیا جائے گا جس کی دل میں چاہت کریں گے۔ انھیں قیامت کی ہولناکیوں اور گھبراہٹ کے بڑے بڑے مواقع پر کوئی غم اور پریشانی نہیں ہوگی۔ ہر موقعہ اور مقام پر ملائکہ انھیں سلام کریں گے اور کہیں گے یہ ہے وہ اجر وانعام کا دن جس کا رب کریم نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ قیامت کے دن زندہ ہونے کے بعد ہر انسان کو قیامت کے مختلف مراحل سے واسطہ پڑے گا ان میں کچھ مراحل ایسے ہونگے۔ جب انبیائے کرام (علیہ السلام) بھی نفسی، نفسی پکار رہے ہونگے۔ ہر کوئی اپنے گناہوں کے مطابق اپنے پسینے میں شرابور ہوگا۔ تاہم ہولناک مراحل میں اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو اس بڑی گھبراہٹ سے محفوظ رکھے گا۔

اَلْفَزَعُ الْاَكْبَرُ : ابن عطیہؒ نے فرمایا: "یہ نعمت جنت میں داخلے کے بعد حاصل ہوگی۔" کیونکہ صحیح احادیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت کے ساتھ بہت سے اہل ایمان کا جہنم سے نکلنا اور جنت میں جانا ثابت ہے، اس لیے "اَلْفَزَعُ الْاَكْبَرُ" سے مراد وہ وقت معلوم ہوتا ہے جس کا ذکر ابوسعید خدریؓ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کیا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "موت کو ایک سیاہ وسفید مینڈھے کی صورت میں لایا جائے گا، پھر ایک آواز دینے والا آواز دے گا: "اے جنت والو!" وہ گردن اٹھائیں گے اور دیکھیں گے تو وہ کہے گا: "کیا تم اسے پہچانتے ہو؟" وہ کہیں گے: "ہاں! یہ موت ہے" اور ان سب نے اسے دیکھا ہوگا، پھر وہ آواز دے گا: "اے آگ والو!" تو وہ گردن اٹھائیں گے اور دیکھیں گے تو وہ کہے گا: "کیا تم اسے پہچانتے ہو؟" وہ کہیں گے: "ہاں! یہ

موت ہے" اوران سب نے اسے دیکھا ہوگا، پھراسے ذبح کر دیا جائے گا، پھر وہ کہے گا: "اے جنت والو! (اب) ہمیشگی ہے اور موت نہیں ہے اور اے آگ والو! (اب) ہمیشگی ہے اور موت نہیں ہے۔" پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: (وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ) [مریم: ۳۹] (اور انھیں پچھتاوے کے دن سے ڈرا جب (ہر) کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ سراسر غفلت میں ہیں) یعنی وہ سراسر دنیا کی غفلت میں ہیں: (وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ) "اور وہ ایمان نہیں لاتے۔"[1]

ابن کثیر نے "عبدالرزاق عن یحییٰ بن ربیعہ عن عطاء" یہ قول ذکر فرمایا ہے: "گویا "يَوْمَ الْحَسْرَةِ" اور "الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ" ایک ہی چیز ہے۔" اکثر حضرات نے اس سے مراد صور میں آخری پھونک کا وقت مراد لیا ہے۔ بعض نے میدان حشر میں پیش آنے والے ہولناک واقعات مراد لیے ہیں، مگر جو غم یا گھبراہٹ ختم ہو جائے اسے "الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ" نہیں کہا جا سکتا۔ ابن کثیر میں ہے کہ سعید بن جبیرؒ نے فرمایا: (حِيْنَ تُطْبَقُ النَّارُ عَلٰى أَهْلِهَا) "اس سے مراد وہ وقت ہے جب جہنم والوں کے اوپر جہنم کو بند کر دیا جائے گا۔" دکتور حکمت بن بشیر نے فرمایا: "اسے طبری نے حسن سند سے ذکر کیا ہے۔" یہ قول اور موت کو ذبح کرنے کا قول ایک ہی ہے، کیونکہ جہنم کو اسی وقت اوپر سے بند کیا جائے گا جب اس میں وہی لوگ رہ جائیں گے جنھیں ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جنت میں جانے کے بعد جنتی ہر قسم کی گھبراہٹ اور خوف سے محفوظ رہیں گے، حتیٰ کہ سب سے بڑی گھبراہٹ بھی انھیں غم زدہ نہیں کرے گی، بلکہ وہ صرف اور صرف جہنمیوں کے لیے مخصوص ہوگی۔

﴿ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ

---

[1] [بخاري، التفسير، باب قوله عزوجل: (وأنذرهم يوم الحسرة): ۴۷۳۰]

اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَقَدْ
كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ
الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ ؕ

جس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ لیں گے جس طرح کاغذوں کے طومار میں تحریریں لپیٹ دی جاتی ہیں۔ جس طرح ہم نے کائنات کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اسی طرح دوبارہ پیدا کر دیں گے' یہ وعدہ ہے جس کا پورا کرنا ضروری ہے اور ہم ایسا ضرور کرنے والے ہیں۔ (۱۰۴) اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ میرے نیک بندے ملک کے وارث ہوں گے۔ (۱۰۵) یقیناً اس (قرآن) میں عبادت گزاروں کے لیے ایک عظیم پیغام ہے۔ (۱۰۶)

نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ: "طَوٰى يَطْوِيْ طَيًّا" لپیٹنا۔ "السِّجِلّ" کا معنی ہے صحیفہ، کتاب بھی ہے اور کاتب بھی۔ (قاموس) یہاں کاتب معنی زیادہ موزوں ہے، کیونکہ کاتب کاغذات لکھنے کے بعد آخر میں لپیٹ کر اکٹھے کر لیتا ہے۔ (ابن عاشور) بعض لوگوں نے ایک فرشتے کا نام "سجل" بتایا ہے اور بعض نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ایک کاتب کا نام "سجل" بتایا ہے، مگر یہ دونوں درست نہیں، نہ کسی فرشتے کا نام "سجل" ثابت ہے اور نہ کسی صحابی کا۔

"یَوْمَ" یعنی جن چیزوں کا ذکر اوپر گزرا یہ سب اس دن ہوں گی جس دن۔۔ (أَيْ تَكُوْنُ هٰذِهِ الْأَشْيَاءُ يَوْمَ)۔(بقاعی)

نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ: یعنی جس طرح کاتب اپنے اوراق لپیٹ لیتا ہے اسی طرح ہم آسمانوں کو لپیٹ دیں گے۔قرآن مجید میں دوسری جگہ یہ بات کچھ تفصیل سے آئی ہے، چنانچہ فرمایا: (وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ)[الزمر:٦٧] "اورانھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جو اس کی قدر کا حق ہے، حالانکہ ساری زمین قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہونگے۔" اور ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "بیشک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام زمینوں کو مٹھی میں لے لے گا اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں ہونگے۔"[1]

سلف صالحین کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات جس طرح قرآن وحدیث میں آئی ہیں ان کا اسی طرح عقیدہ رکھنا چاہیے اور انھیں اسی طرح بیان کرنا چاہیے، نہ ان کا انکار کیا جائے اور نہ تاویل، نہ یہ کہا جائے کہ ان الفاظ کا معنی ہی ہمیں معلوم نہیں۔ہاں یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ نہ سمجھا جائے۔جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ یہودیوں کا ایک عالم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور کہنے لگا، اے ابوالقاسم! قیامت کے دن اللہ (ساتوں) آسمانوں کو ایک انگلی پر، (ساتوں) زمینوں کو ایک انگلی پر، پہاڑوں اور درختوں کو ایک انگلی پر، پانی اور گیلی مٹی کو ایک انگلی پر اور (دیگر) تمام

---

[1]۔[بخاري، التوحيد، باب قول اللہ تعالیٰ: (لما خلقت بيدي): ٧٤١٢]

مخلوقات کو ایک انگلی پر رکھ لے گا، پھر انگلیوں کو ہلا کر فرمائے گا، میں بادشاہ ہوں، میں بادشاہ ہوں۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (اس کی تصدیق فرماتے ہوئے) ہنسے، یہاں تک کہ آپ کے دانت مبارک دکھائی دیے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: (وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ)[الزمر:٦٧] "اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جو اس کی قدر کا حق ہے، حالانکہ زمین ساری قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہونگے۔ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بنا رہے ہیں۔"[1]

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ : سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اے لوگو! تم (قیامت کے دن) ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بغیر ختنہ کیے ہوئے پیش کیے جاؤ گے۔" پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: (كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ) "جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کی ابتدا کی (اسی طرح) ہم اسے لوٹائیں گے۔ یہ ہمارے ذمے وعدہ ہے، یقیناً ہم ہمیشہ (پورا) کرنے والے ہیں۔"[2]

آیت میں زبور کا حوالہ دیا گیا ہے جو حضرت داؤد پر نازل ہوئی تھی۔ اس سیہ واضح کرنا مقصود ہے کہ

---

[1] ۔[بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: (لما خلقت بیدی): ٧٤١٥۔ مسلم، کتاب صفات المنافقین، باب صفة القیامة والجنة والنار: ٢٧٨٦]

[2] ۔[بخاری، کتاب التفسیر، باب (کما بدأنا أول خلق نعیدہ وعدا علینا): ٤٧٤٠۔ مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها، باب فناء الدنیا وبیان الحشر یوم القیامة: ٢٨٦٠/٥٨]

جہاں تک موجودہ زمین کے اقتدار کا تعلق ہے وہ ایک آزمائشی چیز ہے اور یہ خدا سے غافل لوگوں کو بھی حاصل ہوتا ہے اور اس کے نیک بندوں کو بھی چنانچہ حضرت داؤد کو جو پیغمبر تھے خلیفہ بنایا گیا تھا رہی ابدی کامیابی تو جو کتاب انہیں عطا ہوئی تھی اس میں خدا اور آخرت کے بارے میں یاددہانی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ بالآخر زمین کے وارث میرے نیک بندے ہونگے۔ موجودہ زبور میں جو بائبل کے مجموعہ میں شامل ہے اس مضمون کی ایک جھلک ہی دیکھی جاسکتی ہے۔ جہاں تک ذکر یعنی یاددہانی کا تعلق ہے زبور کے درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں: "خداوند پر توکل کر۔ ملک میں آبادرہ اور اس کی وفاداری سے پرورش پا، خداوند میں مسرور رہ اور وہ تیرے دل کی مرادیں پورے کرے گا۔ [1] بدی کو چھوڑ دے اور نیکی کر اور ہمیشہ تک آبادرہ کیونکہ خداوند انصاف کو پسند کرتا ہے اور اپنے مقدسوں کو ترک نہیں کرتا وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں۔ [2]

رہا زمین کی وراثت کا فرمان تو زبور کے اسی بات میں ہے: "صادق زمین کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔ [3]

خداوند کی آس رکھ اور اسی کی راہ پر چلتا رہ۔ اور وہ تجھے سرفراز کر کے زمین کا وارث بنائے گا۔ [4]

ہمیشہ سے رہیں گے" کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ زمین سے مراد جنت ہی کی زمین ہے اور آیت زیر تفسیر سے پہلے (آیت ۱۰۴ میں) جو مضمون بیان ہوا ہے وہ آخرت ہی سے متعلق ہے اس لیے محل کلام

۱۔ (زبور ۳۷: ۳، ۴)

۲۔ (زبور ۳۷۔ ۲۷، ۲۶)

۳۔ (زبور ۳۷۔ ۲۹)

۴۔ (زبور ۳۷۔ ۳۴)

دلیل ہے کہ یہاں مراد جنت کی زمین ہے۔

﴿ وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۰۷﴾ ﴾

اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ الخ" آپ تمام جہانوں کے لیے باعث رحمت اس طرح ہیں کہ آپ نے اللہ کے حکم سے سب کے لیے توحید کا اعلان کیا اور صراط مستقیم جو جنت کی سیدھی راہ ہے وہ سب کے لیے واضح کر دی اور اللہ کی طرف جو پیغام آپ لے کر آئے وہ تمام بنی آدم کے لیے سعادت دارین کا باعث ہے البتہ کافروں نے سوء استعداد اور ضد وعناد کی وجہ سے فائدہ نہ اٹھایا۔ حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا۔ آپ مومن وکافر دونوں کے لیے باعث رحمت ہیں۔ مومن آپ پر ایمان لانے سے خوش نصیب ہو گیا اور کافر غرق وخسف اور دیگر دنیوی عذابوں سے بچ گئے جن سے اقوام سابقہ کو ہلاک کیا گیا۔

سیدنا ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے گزارش کی، اے اللہ کے رسول! مشرکین کے لیے بددعا کیجیے! آپ نے فرمایا: "میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا، میں تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔"[1]

سیدہ عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ میں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا کہ کیا آپ پر احد کے دن سے بھی زیادہ سخت کوئی دن گزرا ہے؟ آپ نے فرمایا: "میں نے تمہاری قوم کی طرف سے جو جو

۱۔ [مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب النھی عن لعن الدواب وغیرھا: ۲۵۹۹]

تکلیفیں اٹھائی ہیں وہ تو خیر جھیلیں ہی ہیں، تاہم مجھ پر سب سے زیادہ سخت دن عقبہ کا دن گزرا ہے۔ جس دن میں عبد یالیل بن عبد کلال کے پاس گیا (اور اسے اسلام کی دعوت پیش کی)۔ اس نے میرا کہنا نہ مانا (اور اسلام قبول نہیں کیا) میں رنجیدہ ہو کر وہاں سے روانہ ہوا اور جب میں قرن ثعالب پہنچا تو مجھے ذرا ہوش آیا۔ میں نے سر اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ ابر کا ایک ٹکڑا مجھ پر سایہ کیے ہوئے ہے اور اس میں میں نے جبرائیل (علیہ السلام) کو دیکھا، انھوں نے مجھے آواز دی اور کہنے لگے، اللہ نے وہ بات سن لی جو آپ کی قوم نے آپ سے کہی اور ان کا جواب بھی سن لیا۔ اب اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے فرشتے کو آپ کے پاس بھیجا ہے، آپ ان کے سلسلہ میں جو چاہیں اس کو حکم دیں۔ اتنے میں اس پہاڑوں کے فرشتے نے مجھے آواز دی اور سلام کیا، اس نے کہا، اے محمد! میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں، آپ کے رب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے، تاکہ آپ مجھے اپنے معاملہ میں جو چاہیں حکم دیں، تو آپ کیا چاہتے ہیں؟ اگر آپ کہیں تو میں ان پر اخشبین نامی پہاڑوں کو ملا دوں۔ آپ نے فرمایا: "(نہیں ایسا نہ کرو) بلکہ مجھے امید ہے (اگر یہ لوگ راہ راست پر نہ آئے تو کہا) ان کی اولاد میں سے اللہ ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اللہ اکیلے کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ ذرا سا بھی شرک نہیں کریں گے۔"[1]

عمرو بن ابی قرہؓ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا حذیفہؓ مدائن میں تھے، جہاں بعض اوقات وہ احادیث رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیان کیا کرتے تھے۔ ایک دن سیدنا حذیفہؓ سیدنا سلمانؓ کے پاس آئے تو سیدنا سلمانؓ نے فرمایا، اے حذیفہ! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بعض اوقات غصہ کی حالت میں کوئی بات کہتے تھے اور بعض اوقات خوشی کی حالت میں کوئی بات کہتے تھے (اس لیے تو ہر بات کو

۱۔ [بخاری، کتاب بدء الخلق، باب إذا قال أحدکم آمین والملائکۃ فی السماء۔۔الخ: ۳۲۳۱۔ مسلم، کتاب الجهاد، باب ما لقی النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) من أذی المشرکین والمنافقین: ۱۷۹۵]

بیان نہ کیا کر) یقیناً میں جانتا ہوں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا: "اپنی امت میں سے جسے میں نے غصے میں برا بھلا کہہ دیا ہو، یا اس پر لعنت کر دی ہو تو سمجھ لو کہ میں بھی اولاد آدم سے ہوں۔ تو جس طرح وہ غصہ کرتے ہیں اسی طرح مجھے بھی غصہ آجاتا ہے، ہاں البتہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، تو اے اللہ! میری ان باتوں کو ان کے لیے قیامت کے دن رحمت بنا دے۔"[1]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "میری اور لوگوں کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے آگ روشن کی اور جب اس کی روشنی اردگرد پھیل گئی تو پروانے اور یہ کیڑے مکوڑے جو آگ پر گرتے ہیں، اس میں گرنے لگے، اب وہ شخص انھیں آگ سے دور ہٹانے لگا، (تاکہ وہ جلنے سے بچ جائیں) مگر وہ اس کے قابو میں نہیں آئے اور آگ میں گرتے ہی رہے۔ اسی طرح میں تمہیں تمہاری کمروں سے پکڑ کر آگ سے دور کھینچتا ہوں (اور کہتا ہوں کہ دوزخ سے بچ جاؤ) لیکن تم ہو کہ سنتے ہی نہیں اور اسی میں گرتے جاتے ہو۔"[2]

﴿ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٠٨﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿١٠٩﴾ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ

---

[1] ۔[مسند أحمد: ۵/ ۴۳۷، ح: ۲۳۷۶۸ ۔ أبوداؤد، کتاب السنة، باب فی النهی عن سب أصحاب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): ۴۶۵۹]

[2] ۔[بخاری، کتاب الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصی: ۶۴۸۳]

وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ
اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ
الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

آپ فرما دیجیے کہ مجھ پر اللہ کی طرف سے یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے تو کیا تم فرماں برداری کرنیوالے ہو۔(۱۰۸) پھر اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دو میں نے تمہیں یکساں طور پر خبردار کر دیا ہے اور میں نہیں جانتا کہ جس بات کا وعدہ تم سے کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا دور ہے۔(۱۰۹) بیشک وہ (اللہ) کھلی بات کو بھی جانتا ہے اور جسے تم چھپاتے ہو اسے بھی جانتا ہے۔(۱۱۰) اور میں نہیں جانتا کہ شاید اس (مہلت) میں تمہارے لیے امتحان ہو اور ایک وقت تک فائدہ پہنچانا ہو۔(۱۱۱) پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا کہ اے میرے رب! حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور ہمارا پروردگار بڑا مہربان ہے اسی سے ان باتوں پر مدد مانگی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو۔(۱۱۲)

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ کے واحد معبود ہونے پر کئی دلائل پیش کئے گئے اور فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے، اب

یہاں یہ فرمایا جارہا ہے کہ اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ کافروں سے فرمادیں کہ معبود کے معاملے میں میری طرف یہی وحی کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لاکر مسلمان ہوجاؤ۔

پھر فرمایا: میں (ازخود) نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا دور۔ مفسرین نے کہا اس سے مراد قیامت ہے اور بعض نے کہا اس سے ان پر دنیا میں عذاب کا نزول مراد ہے۔ وہ کہتے تھے کہ بتائیں قیامت کب آئے گی؟ یا آپ کا انکار کرنے کی وجہ سے ہم پر آسمانی عذاب کب نازل ہوگا یا اس سے مراد یہ ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جوان کو اعلان جنگ سنایا تھا، وہ جنگ کب ہوگی؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ کہیے کہ میں ازخود بغیر وحی کے نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، وہ قریب ہے یا دور۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ عذاب اور قیامت کب آئے گی۔ جو کچھ تم کہتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو اسے بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

یہاں تک قیامت یا عذاب کا معاملہ ہے اس کے بارے میں میں نہیں جانتا کہ قیامت یا عذاب کب آئے گا تاہم یہ حقیقت ہے کہ حق کی مخالفت میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو مہلت دے رکھی ہے وہ تمہارے لیے ایک آزمائش کی حیثیت رکھتی ہے۔ تم اس وقت تک ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو جب تک اس کا حکم صادر نہیں ہوتا۔ یہاں ایک سوال ہے کہ چھپی ہوئی بات جاننا تو واقعی کمال ہے اور یہ اللہ ہی کی شان ہے، مگر جہر اور بلند آواز سے کی ہوئی بات تو ہر شخص سن سکتا ہے اور جان سکتا ہے، اس صفت کو خاص طور پر کیوں ذکر فرمایا گیا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ بلند آواز سے ایک آدمی بات کرے تو واقعی وہ سمجھ میں آجاتی

ہے مگر جب ایک ہی وقت میں دو چار یا دس پندرہ آدمی اپنی پوری بلند آواز کے ساتھ بات کرنا شروع کر دیں تو آدمی کو کسی کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی، یہ اللہ مالک الملک، سمیع وبصیر کی شان ہے کہ دس پندرہ نہیں کروڑوں، اربوں انسان، جن، فرشتے اور حیوانات اپنی پوری آواز کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں، تو وہ ان سب کی پکار سنتا ہے، جو کچھ وہ کہہ رہے ہوتے ہیں اسے جانتا ہے اور ان کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ مخلوق میں یہ وصف کہاں؟ (بقاعی)۔

پیغمبر (علیہ السلام) نے یوں دعا کی اے میرے پروردگار میرے اور میری قوم کے مابین انصاف کے ساتھ فیصلہ فرمادے اور ہمارا پروردگار بے حد مہربان ہے اور ان باتوں کے مقابلے میں جو تم بناتے رہتے ہو اسی سے مدد چاہی اور طلب کی جاتی ہے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب ان کی قوم نے ان کو تنگ کیا اور لغو باتوں سے ان کو پریشان کیا تو جناب باری عزاسمہ کی بارگاہ عالی میں دعا کرتے تھے۔

اسی طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ دعا فرمائی کہ پروردگار یہ لوگ تو کسی طرح میری دعوت وتبلیغ کو قبول نہیں کرتے۔ بلکہ ہر بات کا مذاق اڑاتے اور استہزا کرتے ہیں اب تو ہی میرے اور ان کے درمیان فیصلہ فرمادے۔ اور چونکہ تیرا ہر فیصلہ مبنی بر انصاف ہوتا ہے۔

اس لیے فرمایا رب احکم رحکمک الحق یعنی آپ فیصلہ فرما دیجئے اور آپ کا فیصلہ ہمیشہ حق اور انصاف ہی ہوتا ہے۔ ہمارا پروردگار رحمان ہے اور اسی سے ہر معاملہ میں مدد طلب کی جاتی ہے جس قسم کی تم باتیں بناتے رہتے ہو ان کے مقابلہ میں اسی سے مدد مانگتا ہوں۔

سورہ الحج

سورہ حج مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اس میں اٹھہتر آیات اور دس رکوع ہیں

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام الحج اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کس طرح لوگوں کو بیت الحرام کا حج کرنے کی دعوت دی اور لوگوں کو حج کی عبادات کی تعلیم دی اور حج کے فضائل اور منافع بتائے، اور ان مشرکین کی زجر و توبیخ اور مذمت کی جو مسلمانوں کو المسجد الحرام میں جانے سے منع کرتے تھے ہر چند کہ اس سورت کا نزول بالاتفاق مسلمانوں پر حج کی فرضیت سے پہلے ہوا ہے کیونکہ حج ان آیات سے فرض ہوا ہے جو سورہ البقرہ اور سورہ آل عمران میں ہیں۔

اس سورت کا نام الحج رکھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس سورت میں الحج کا ذکر ہے:

واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالاً وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق (الحج:27) اور آپ لوگوں میں حج کرنے کا اعلان کر دیجیے لوگ آپ کے پاس پیدل اور ہر قسم کے دبلے پتلے اونٹوں پر (بھی) دور دراز کے ہر راستہ سے آئیں گے۔

مقام نزول

سورہ حج کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ "ھذن خصمن" سے لے کر "وھدوا الی صراط الحمید" تک، آیتیں مدنی ہیں اور باقی آیتیں مکی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور امام مجاہدؒ کا ایک

قول یہ ہے کہ سورہ حج مکی ہے البتہ "ھذن خصمن" سے لے کر تین آیتیں مدنی ہیں۔ جمہور کے نزدیک سورہ حج کی بعض آیتیں مکی ہیں اور بعض مدنی ہیں اور یہ متعین نہیں ہے کون سی آیتیں مکی ہیں اور کون سی آیتیں مدنی ہیں۔ ابن عطیہؒ نے کہا یہی قول صحیح ہے۔ [1]

تعبیر

جس نے اس سورہ حج کو خواب میں پڑھا اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے متعلق لوگوں میں نیک گمانی رہے گی۔ (علامہ ابن سیرینؒ)

صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے یہی منقول ہے کہ اس سورت میں دو سجدے ہیں اور عبداللہ بن مبارکؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ اور اسحاق بن راہویہؒ کا بھی یہی مذہب ہے اور بعض صحابہ اس طرف گئے ہیں کہ اس سورت میں صرف ایک ہی سجدہ ہے یعنی صرف پہلا سجدہ اور امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور سفیان ثوریؒ اور علماء کوفہ کا مذہب بھی یہی ہے کہ اس سورت میں ایک سجدہ ہے صرف پہلا سجدہ۔

سیدنا عقبہ بن عامرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! کیا سورہ حج کو دو سجدوں کی وجہ سے باقی تمام سورتوں پر فضیلت حاصل ہے؟ آپ نے فرمایا: "ہاں! اور جو یہ نہ کرنا چاہے وہ ان کی تلاوت ہی نہ کرے۔" [2]

مضامین کا خلاصہ

رکوع ۱: قیامت کے زلزلے اور اس کی ہولناکی کا بیان ہے جس سے دنیا کی ہر چیز تہس نہس ہو جائے گی۔

۱۔ (التحریر والتنویر جز 17 ص 180 الانقان ج ۱ ص 64-65 مطبوعہ بیروت)

۲۔ [ترمذی، کتاب الجمعۃ، باب ماجاء فی السجدۃ فی الحج: ۵۷۸۔ أبوداؤد، کتاب سجود القرآن، باب تفریع أبواب السجود۔۔۔ الخ: ۱۴۰۲]

پھر اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں مشرکین کی کج بحثی اور تخلیق انسانی کے مختلف مراحل کا ذکر ہے۔آخر میں کج فہموں کی دنیا میں رسوائی اور آخرت کے عذاب کا ذکر ہے۔

رکوع ۲ : اہل شک ونفاق کی حالت کا بیان ہے پھر مومنوں کے حال اور فیصلے کے دن یعنی قیامت کا احوال مذکور ہے۔آخر میں اہل دوزخ اور ان کی سزاؤں کا بیان ہے۔

رکوع ۳:اہل جنت اور اس کی نعمتوں کا بیان اور اللہ کی راہ سے روکنے والے گمراہوں کا حال مذکور ہے۔

رکوع ۴: حج کی فرضیت کا اعلان عام اور بیت اللہ کی عظمت وفضائل کا بیان ہے۔پھر اللہ کی حرمتوں اور شعائر اللہ کی تعظیم کا حال مذکور ہے۔

رکوع ۵:قربانی کی اہمیت،نحر کا طریقہ اور قربانی کی روح کا مفصل ذکر ہے۔

رکوع ۶:مشرکین سے جہاد وقتال کی اجازت اور کفار کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو فوراً سزا نہیں دیتا بلکہ ان کو مہلت دیتا ہے۔پھر جب حجت پوری ہوجاتی ہے تو ان کو عذاب سے دوچار کردیا جاتا ہے اور اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں نکل سکتا۔منکرین پر اللہ کا عذاب ضرور آئے گا کیونکہ اللہ کا وعدہ اٹل ہے۔

رکوع ۷:رسولوں کا فرض منصبی،شیطان کا فتنہ اور منکرین کا قیامت تک دھوکے میں رہنا مذکور ہے۔

رکوع ۸:اللہ کی راہ میں ہجرت کا انعام اور ذاتی ومعاشرتی معاملات میں معاف کردینے کی ترغیب ہے۔آخر میں اللہ کی قدرت کاملہ کا بیان ہے۔

رکوع ۹:اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان قدرت اور زبردست غلبے کا بیان۔مجادلین کو تہدید اور مشرکین ومنکرین کی اندھی تقلید مذکور ہے۔

رکوع ۱۰: شرک کی ایک مثال کا بیان ہے پھر اللہ کا پیغام پہچانے والوں کا ذکر ہے۔ آخر میں مومنوں کو اللہ تعالیٰ کے آگے جھکنے کا حکم دیا گیا ہے۔

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ
عَظِيْمٌ ۝۱ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ
وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ
بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝۲ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ
يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝۳ۙ كُتِبَ
عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ
السَّعِيْرِ ۝۴ ﴾

اے لوگوں! اپنے رب (کے عذاب) سے ڈرو کہ قیامت کا زلزلہ ایک بہت بڑی بھاری چیز ہے۔(۱) جس دن تم اس کو دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو پھینک دے گی ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور لوگ تمہیں مدہوش نظر آئیں

گے حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہوگا۔(۲) اور لوگوں میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بغیر کسی علم کے اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔(۳) جس کے حق میں لکھ دیا گیا ہے کہ جو کوئی اس کو دوست بنائے گا تو وہ اس کو گمراہ کر دے گا اور اسے دوزخ کے عذاب کی طرف لے جائے گا۔(۴)

اے لوگو تم اپنے پروردگار سے ڈرو (اور اس کی مخالفت نہ کرو۔ دیکھو قیامت آنے والی ہے جس میں تم کو خدا کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ تم قیامت کو ایک افسانہ یا معمولی چیز نہ سمجھو) یقیناً قیامت کا زلزلہ ایک بڑی چیز ہے۔ جس روز تم اسے دیکھو گے۔ اس روز ہر دودھ پلانے والی اپنے اس بچہ سے غافل ہو جائے گی۔ جس کو دودھ پلاتی ہے (اور اس کے ایسے حواس باختہ ہوں گے کہ اسے اپنے بچہ کا بھی خیال نہ رہے گا) اور حمل والی اپنا حمل گرا دے گی۔ اور تم لوگوں کو نشہ میں سرشار دیکھو گے اور (حقیقت میں) وہ نشہ میں سرشار نہ ہوں گے ہاں (وہ عذاب الٰہی کے سبب بدحواس ہوں گے۔ کیونکہ) خدا کا عذاب بہت سخت ہے (اور ان میں اتنی تاب کہاں ہے کہ وہ اسے جھیل سکیں۔ اس لیے خود رفتہ اور حواس باختہ ہوں گے۔ پس تمہیں خدا کے عذاب سے ڈرنا چاہیے اور اس کی مخالفت نہ کرنی چاہیے۔

زمین پر ایسا زلزلہ برپا ہوگا کہ کوئی چیز اپنی جگہ باقی نہیں رہے گی۔ مائیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی، حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے اور بچے بوڑھے ہو جائیں گے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب ہوگا جس میں وہ اپنی بدترین مخلوق کو مبتلا کرے گا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس سے مراد وہ خوف و ہراس

اور اضطراب و پریشانی ہے جو قیامت کے دن لوگوں کو قبروں سے نکلنے کے بعد میدان محشر میں لاحق ہوگی، جیسا کہ سیدنا ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) آدم (علیہ السلام) سے فرمائے گا، اے آدم! وہ عرض کریں گے، اے ہمارے رب! میں بار بار تیری خدمت میں حاضر ہوں اور ساری خیر تیرے ہاتھ میں ہے۔ پھر انھیں اللہ حکم دے گا کہ اپنی اولاد میں سے دوزخ والوں کا جتھا نکالو۔ وہ عرض کریں گے، اے اللہ! دوزخ کا جتھا کتنا نکالوں؟ حکم ہوگا، ہر ہزار آدمیوں میں سے نوسو ننانوے۔ وہ ایسا سخت وقت ہوگا کہ بچہ بوڑھا ہوجائے گا اور (وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ) [الحج:۲] "اور ہر حمل والی اپنا حمل گرادے گی اور تو لوگوں کو نشے میں دیکھے گا، حالانکہ وہ ہرگز نشے میں نہیں ہوں گے اور لیکن اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔" یہ حدیث صحابہ پر سخت گراں گزری، انھوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! وہ ایک (خوش نصیب) ہم میں سے کون ہوگا؟ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "خوش ہوجاؤ، یاجوج ماجوج میں سے ایک ہزار ہوں گے اور تم میں سے ایک۔" پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اس ذات کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! مجھے امید ہے کہ تم لوگ تمام جنت والوں کا چوتھائی ہوگے۔" یہ سن کر ہم نے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی اور "اللہ اکبر" کہا، پھر آپ نے فرمایا: "اس ذات کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم تہائی حصہ ہوگے۔" ہم نے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی اور "اللہ اکبر" کہا، پھر آپ نے فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم جنتیوں کا نصف ہوگے۔ تمہاری مثال دوسری امتوں کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے کسی سیاہ بیل کے جسم پر سفید بالوں کی (معمولی تعداد) ہوتی ہے، یا

اس سفید داغ کی طرح جو گدھے کے آگے کے پاؤں میں ہوتا ہے۔"[1]

سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تم (قیامت کے دن) ننگے بدن، ننگے پاؤں اور بغیر ختنے کے جمع کیے جاؤ گے۔" سیدہ عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! تو کیا مرد اور عورت ایک دوسرے کو دیکھیں گے؟ آپ نے فرمایا: "وہ ایسا سخت معاملہ ہوگا کہ کوئی اس کا خیال بھی نہیں کر سکے گا۔"[2]

سیدنا عدی بن حاتمؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "پھر (جب) قیامت کے دن تم میں سے کوئی اللہ کے سامنے کھڑا ہوگا تو اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوگا اور نہ کوئی ترجمان ہوگا جو اس کے لیے ترجمانی کرے، پھر اللہ اس سے فرمائے گا، کیا میں نے تجھ کو مال نہیں دیا تھا؟ وہ عرض کرے گا، کیوں نہیں (بے شک تو نے مال دیا تھا)۔ پھر اللہ فرمائے گا، کیا میں نے تیری طرف رسول نہیں بھیجا تھا؟ وہ عرض کرے گا، کیوں نہیں (تو نے رسول بھیجا تھا)۔ پھر وہ اپنے دائیں طرف دیکھے گا تو سوائے آگ کے کچھ نظر نہیں آئے گا، پھر وہ اپنی بائیں طرف دیکھے گا تو سوائے آگ کے کچھ نظر نہیں آئے گا، لہٰذا تم میں سے ہر شخص کو آگ سے بچنا چاہیے، اگرچہ (صدقہ میں) کھجور کا ایک ٹکڑا ہی دے کر سہی۔ اگر یہ بھی نہ ملے تو اچھی بات ہی کہہ کر (دوزخ سے بچے)۔"[3]

اور بعض آدمی ایسے ہیں یعنی نضر بن حارث جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بغیر جانے بوجھے اور بغیر کسی

۱۔[بخاری، کتاب الرقاق، باب (إن زلزلة الساعة شيء عظيم)۔۔الخ: ۶۵۳۰۔ مسلم، کتاب ال إیمان، باب قولہ: یقول اللہ لآدم أخرج بعث النار۔۔الخ: ۲۲۲]

۲۔[بخاری، کتاب الرقاق، باب الحشر: ۶۵۲۷]

۳۔[بخاری، کتاب الزکوۃ، باب الصدقة قبل الرد: ۱۴۱۳۔ مسلم، کتاب الزکوۃ، باب الحث علی الصدقة ولو بشق تمرة۔۔الخ: ۶۷/۱۰۱۶]

حجت ودلیل کے جھگڑا کرتے ہیں اور ہر ملعون شیطان کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔

شان نزول: (آیت) "ومن الناس من یجادل"۔ (الخ)

ابن ابی حاتمؒ نے ابو مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جو بڑا جھگڑالو تھا اور فرشتوں (علیہم السلام) کو خدا عزوجل کی بیٹیاں کہتا اور قرآن کریم کو پرانے قصے بتاتا اور کہتا کہ اللہ تعالیٰ گل سڑ جانے کے بعد پھر زندہ کرنے پر قادر نہیں۔

سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "نیک اور برے دوست کی مثال کستوری والے اور بھٹی دھونکنے والے کی مانند ہے۔ کستوری والا یا تو تمہیں (تحفہ کے طور پر) کچھ دے دے گا، یا تم اس سے خرید لو گے، یا تم اس سے اچھی خوشبو تو پا ہی لو گے اور بھٹی دھونکنے والا یا تو تمہارے کپڑے جلا دے گا، یا تم اس سے بدبو حاصل کرو گے۔"[1]

آگے فرمایا جس (شیطان) کے متعلق لوح محفوظ میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا وہ اس کو گمراہ کر دے گا اور اس کو بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف لے جائے گا۔

اس آیت کے دو محمل ہیں ایک یہ کہ جو شخص حشر اور قیامت کا انکار کرتا ہے اور اس میں جدال اور جھگڑا کرتا ہے، اس کے متعلق لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے کہ وہ لوگوں کو جنت سے گمراہ کر دے گا اور دوزخ کی طرف لے جائے گا۔ اس کا دوسرا محمل یہ ہے کہ جو شخص سرکش شیطان کی پیروی کرتا ہے اور اس سے دوستی رکھتا ہے تو وہ شیطان اس کو جنت سے گمراہ کر دے گا اور دوزخ کی طرف لے جائے گا، اس سے مقصود یہ ہے کہ سرکش شیطانوں اور بدمذہب لوگوں سے دوستی نہ رکھی جائے اور ان سے محبت کا تعلق نہ رکھا جائے۔

۱۔ [بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب المسک: ۵۵۳٤۔ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب استحباب مجالسۃ الصالحین۔۔الخ: ۲٦۲۸]

حدیث میں ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرت یہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: عنقریب میری امت کے آخر میں ایسے لوگ (ظاہر) ہوں گے جو تم سے ایسی باتیں کریں گے جو تم نے سنی ہوں گی نہ تمہارے باپ دادا نے تم ان سے دور رہنا وہ تم سے دور رہیں۔ [1]

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ۝۵ ﴾

ا۔ (مقدمہ صحیح مسلم باب: ٦ رقم الحدیث: ١ ص 254، مطبوعہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ، مسند حمد ج ٢ ص 321، قدیم، مسند احمد رقم الحدیث: 8250، جدید المستدرک ج ١ ص 103 قدیم المستدرک رقم الحدیث: 13080)

اے لوگوں اگر تمہیں دوبارہ جی اٹھنے کے بارے میں کسی طرح کا کوئی شک ہو تو تم خود اپنی پیدائش و پرورش سے متعلق ہی ہماری قدرت کاملہ کے مظاہر میں غور کر لو کہ ہم نے تمہیں کس عجیب و غریب اور پُر حکمت طریقے سے پیدا کیا مٹی کے اس بے حس اور بے جان مادے سے پھر نطفے سے پھر ایک جمے ہوئے خون سے پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی اور ہم نے تمہاری پیدائش سے متعلق یہ اہم تغیرات تمہیں بتا بھی دیئے تا کہ ہم کھول کر بیان کر دیں تمہارے لیے تمہاری حقیقت اور اس سے متعلق اپنی قدرت کے مظاہر کو اور ہم جس کو چاہتے ہیں ٹھہرا دیتے ہیں رحموں کے اندر ایک خاص مدت تک پھر ہم نکال لاتے ہیں تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے ایک بچے کی شکل میں پھر نہایت مناسب و عمدہ طریقے سے ہم تمہاری پرورش کرتے ہیں تا کہ تم اپنی جوانی کی بھرپور قوتوں کو پہنچ جاؤ اور تم میں سے کسی کو پہلے ہی واپس اٹھا لیا جاتا ہے اور کسی کو لوٹا دیا جاتا ہے اس کی گھٹیا اور بدترین عمر کی طرف جس کا اثر و نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ جاننے کے بعد کچھ بھی نہیں جان رہا ہوتا اور تم اپنے پیش یا افتادہ اس زمین ہی میں غور کر لو کہ ایک وقت تم اس کو بالکل ویران اور خشک پڑی ہوئی دیکھتے ہو پھر

جب ہم اس پر مینہ برسا دیتے ہیں تو یکا یک اس میں زندگی کی حرکت پیدا ہوتی ہے اور یہ ایک خاص انداز سے ابھرتی ہے اور اور طرح طرح کی بارونق چیزیں اگاتی ہے۔

امام ابن جریرؒ اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب نطفہ کو رحم میں چالیس دن گزر جاتے ہیں پھر چالیس دن وہ جما ہوا خون بن جاتا ہے پھر چالیس دن وہ گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے پھر جب وہ تخلیق کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک رفشتہ کو بھیجات ہے جس کی انگلیوں میں مٹی ہوتی ہے، وہ اس کو گوشت کے لوتھڑے میں ملا کر گوندھتا ہے اور پھر اس کی تصویر بناتا ہے، پھر پوچھتا ہے یہ مرد ہے یا عورت؟ نیک ہے یا بد ہے، اس کا رزق کتنا ہے اس کی عمر کتنی ہے، اس کے مصائب کیا کیا ہیں؟ پھر اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے لکھنے کا حکم دیتا ہے اور فرشتہ لکھ دیتا ہے اور جب وہ شخص مرجاتا ہے تو اس کو اس جگہ دفن کر دیا جاتا ہے جہاں سے اس کی مٹی لی گئی تھی۔ [1]

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تم میں سے ہر آدمی بطور نطفہ چالیس دن تک اپنی ماں کے پیٹ میں رہتا ہے، پھر چالیس دن تک جمے ہوئے خون کی شکل میں رہتا ہے، پھر چالیس دن تک گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں رہتا ہے، بعد ازاں اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے، جسے چار باتیں لکھنے کا حکم ہوتا ہے، یعنی اس کی روزی، اس کی عمر اور یہ کہ وہ بدبخت ہوگا یا نیک بخت۔" [2]

۱۔ (الدر المنثور ج ۳ ص ۱۴۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ)

۲۔ [بخاری، کتاب القدر، بابٌ: ۶۵۹۴۔ مسلم، کتاب القدر، باب کیفیۃ خلق ال آدمی فی بطن أمہ۔۔الخ: ۶۶۴۳]

سیدنا انس ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے رحم مادر پر ایک فرشتہ مقرر کر دیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے (سب حال) عرض کرتا رہتا ہے، اے میرے رب! یہ ابھی نطفہ ہے، اے میرے رب! اب یہ جما ہوا خون بن گیا ہے، اے میرے رب! اب یہ گوشت کا لوتھڑا بن گیا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ بچے کی پیدائش پوری کرنا چاہتا ہے تو وہ فرشتہ پوچھتا ہے، اے میرے رب! یہ مرد ہوگا یا عورت، نیک بخت ہوگا یا بد بخت، اس کی روزی کتنی ہوگی اور اس کی موت کب ہوگی؟ پھر (جیسا حکم ہوتا ہے) ویسا ہی اس کی ماں کے پیٹ میں لکھ دیا جاتا ہے۔"[1]

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ: تم میں سے کوئی بوڑھا ہو جاتا ہے اور بڑھاپے کی نہایت خراب عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے، یعنی پیری، بڑھاپے، ضعف قوت و عقل و فہم اور ضعف فکر و دانش کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس نکمی عمر کی طرف لوٹائے جانے سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے، جیسا کہ عمرو بن میمون ؓ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص ؓ اپنے بچوں کو یہ دعائیہ کلمات اس طرح سکھاتے تھے جیسے معلم بچوں کو لکھنا سکھاتا ہے اور فرماتے تھے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز کے بعد ان کلمات کے ذریعے سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے: (اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ، وَ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ، وَ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ أَنْ أُرَدَّ إِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ، وَ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا وَ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ) "اے اللہ! میں بزدلی سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور بخل سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ نکمی عمر کی طرف لوٹایا جاؤں اور میں دنیا کے فتنے اور قبر کے عذاب سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔"[2]

۱۔ [بخاری، کتاب القدر، باب: ۶۵۹۵۔ مسلم، کتاب القدر، باب کیفیۃ خلق ال آدمی فی بطن اُمہ۔۔الخ: ۲۶۴۶]

۲۔ [بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب مایتعوذ من الجبن: ۲۸۲۲، ۶۳۷۴]

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ﴿۶﴾ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۷﴾ ﴾

یہ سب کچھ اس لیے (ہوتا ہے) کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ مردوں کو زندہ فرماتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔(۶) اور بیشک قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں اور بیشک اللہ ان سب کو ایک دن زندہ کر کے اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔(۷)

اللہ ہی حق ہے اس کا معنی ہے وہی واجب الوجود ہے یعنی اس کا ہونا ضروری ہے اور نہ ہونا محال ہے، اور اس کے سوا ہر چیز ممکن اور حادث ہے اور ممکن کی شان یہ ہے کہ اس کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہوں، پھر اس کو عدم سے وجود میں لان کے لیے ایسی چیز ہنی چاہیے جو اس کی طرح ممکن نہ ہو ورنہ وہ بھی اسی کی طرح ہوگی اور اسکی چیز کو وجود میں لانے کی علت نہیں ہو سکے گی اور یہ سارا جہان ممکن ہے تو اس کو پیدا کرنے والا ایسا ہونا چاہیے جو واجب الوجود ہو اور جو واجب الوجود ہوگا اور ہر چیز پر قادر ہوگا وہ مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہوگا اور جب یہ ساری کائنات ممکن ہو تو پھر اس ساری کائنات کو معدوم کرنا بھی ممکن ہوگا اور پھر اس کو دوبارہ پیدا کرنا بھی ممکن ہوگا اور جب یہ سب امور ممکن ہیں تو پھر تم قیامت کا کیوں انکار کرتے ہو اور حشر اور نشر کا کیوں انکار کرتے ہو۔

خطیبؒ وابن عساکرؒ نے عائشہؓ سے اور انہوں نے ابوبکرؓ سے روایت کیا کہ میں نے رسول اللہ (صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا جب آپ صبح کی نماز پڑھتے تو نئے دن اور کاتب اور موجود آدمی کو خوش آمدید کہتے فرماتے تم دونوں لکھو بسم اللہ الرحمن، اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمد الرسول اللہ۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ دین ایسے ہی ہے جیسے اس کی تعریف کی گئی۔ اور کتاب کی وہی شان ہے ج وبیان کی گئی اور میں گواہی دیتا ہوں کہ قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور اللہ تعالیٰ اٹھائیں گے ان لوگوں کو جو قبروں میں ہیں۔

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۙ﴿۸﴾ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴿۹﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴿۱۰﴾ ﴾

اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو بغیر کسی علم، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں۔ (۸) تکبر سے گردن موڑتے ہوئے تا کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے برگشتہ کریں، ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ہم قیامت کے دن انھیں سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ (۹) اور اس سے کہیں گے کہ) یہ اس کا بدلہ ہے جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجے ہیں اور یہ کہ اللہ

اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔(۱۰)

جو شخص قیامت کا انکار کرتا ہے۔ درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ کذب بیانی اور اس کے عدل وانصاف کا انکار کرتا ہے۔ ایسے شخص کے پاس کوئی عقلی اور نقلی دلیل نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے جھوٹے موقف پر اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہوئے بحث وتکرار کرتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جھگڑا کرنے کے مترادف ہے۔ قیامت کا انکار کرنے والا۔ نا صرف علم سے تہی دست ہوتا ہے۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی روشن کتاب کی رہنمائی اور ہدایت سے بھی محروم ہوتا ہے۔ ایسے شخص کے پاس دلائل نہیں ہوتے اس لیے وہ متکبرانہ انداز میں منہ موڑتے ہوئے لوگوں کو گمراہی کے راستے پر قائم رکھنے کے درپے رہتا ہے۔ اس کو دنیا میں ذلت اٹھانا پڑے گی اور آخرت میں جلا دینے والے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ اس کے بارے میں دوسرے مقام پر فرمایا کہ جب ان کے جسم جل جائیں گے تو ان کے جسم بدل دیئے جائیں گے۔ اس طرح ہمیشہ ہوتا رہے گا اور وہ ہمیشہ جہنم میں جلتے رہیں گے۔ (النساء:٥٦)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دو صور پھونکنے کا عرصہ چالیس ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے ان کے شاگردوں نے پوچھا چالیس دن؟ ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ میں یہ نہیں کہتا۔ انہوں نے استفسار کیا چالیس ماہ؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے جواباً فرمایا میں یہ نہیں کہتا۔ انہوں نے پھر پوچھا چالیس سال ہیں؟ ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں میں یہ بھی نہیں کہتا۔ یعنی ابو ہریرہؓ بھول گئے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کتنی مدت بتلائی تھی اس کے بعد اللہ تعالیٰ بارش نازل فرمائے گا۔ لوگ یوں اگیں گے جس طرح انگوری اگتی ہے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، انسان کی دو مچی کے علاوہ ہر چیز بوسیدہ ہو جائے گی۔ قیامت کے دن اسی سے تمام اعضاء کو جوڑا جائے گا۔" (دو مچی سے

مراد اس کا کوئی خاص ذرّہ ہے

جو محفوظ رہتا ہے۔)۔ [1]

اور اس سے کہا جائے گا کہ بدر کے دن جو تو مارا گیا اور اب یہ سزا ملی یہ تیرے ہاتھ کے کیے ہوئے شرکیہ کاموں کا نتیجہ ہے، (آیت) "ومن الناس من یجادل فی اللہ"۔ سے لے کر یہاں تک یہ آیت نضر بن حارث کے متعلق نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ بغیر جرم وقصور کے اپنے بندوں کی گرفت کرنے والا نہیں۔

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ⑫ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ⑬ ﴾

اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو کنارے پر اللہ کی عبادت کرتا ہے پھر اگر اس کو کوئی نعمت پہنچ گئی تو اس سے مطمئن ہو گیا اور اگر اس پر کوئی آزمائش آ پہنچے (تو) الٹا

---

[1]۔ [رواہ البخاری: باب (یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا) زُمَرًا]

پھر گیا اس کی دنیا بھی خراب ہوگئی اور آخرت بھی یہی تو کھلا نقصان ہے۔(۱۱) وہ اللہ کو چھوڑ کر ایسی ہستی کو (اپنی حاجت روائی کے لئے) پکارتا ہے جو اس کو نہ تو نقصان ہی پہنچا سکتی ہے اور نہ نفع۔ یہی تو پرلے درجے کی گمراہی ہے۔(۱۲) وہ ایسی (ہستی) کو پکارتے ہیں جن کا ضرر ان کے نفع سے زیادہ قریب ہے، یقیناً وہ بڑا برا دوست اور بڑا برا ساتھی ہے۔(۱۳)

شان نزول: ومن الناس من یعبد اللہ"۔(الخ)

امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی مدینہ منورہ آ کر اسلام قبول کر لیتا تھا پھر اگر اس کی بیوی کے لڑکا پیدا ہو جائے اور اس کی گھوڑ بچہ دے دے تب تو کہتا تھا کہ یہ دین اچھا ہے اور اگر اس کی بیوی کے لڑکا نہ پیدا ہوا اور اس کی گھوڑی نے بچہ نہ دیا تو کہتا کہ یہ دین برا ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ بعض آدمی اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے طور پر کرتا ہے جیسے کوئی چیز کے کنارا پر کھڑا ہو۔

اور ابن مردویہؒ نے عطیہؒ کے ذریعے سے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ یہودیوں میں سے ایک شخص مشرف با اسلام ہوا، اسلام لاتے ہی اس کی بینائی مال واولاد سب چیزیں جاتی رہیں، اس نے اسلام سے برا شگون لیا اور کہنے لگا میرے اس دین سے مجھے نعوذ باللہ کوئی بھلائی نہیں حاصل ہوئی، میری نظر اور مال جاتا رہا، میرا لڑکا مر گیا، اور پر آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

دنیوی نفع سے ناامید ہو کر پلٹا تو وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اس چیز کو پکارتا ہے اور اس کی عبادت کرتا ہے جو نہ

اس کو کچھ نقصان پہنچا سکتی ہے نہ کچھ بگاڑ سکتی ہے اور نہ اس کو کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ اس کا کچھ بھلا کر سکتی ہے یہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارنا یہی تو پرلے درجے کی گمراہی ہے۔ یعنی ان چیزوں کی عبادت نہ کرے تو وہ نقصان نہیں پہنچا سکتیں اور عبادت کرے تو کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ بھلا جو چیز اللہ تعالیٰ سے نہ حاصل ہو وہ جمادات اور پتھروں سے حاصل کرنا چاہتا ہے اس سے بڑھ کر حماقت اور پرلے درجے کی گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے۔

اگر معنی صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو یہ وہم خود دور ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے کافر کی حماقت یہ بیان کی کہ وہ ایک جماد کی عبادت کرتا ہے جو ذرا بھر نفع و نقصان کا مالک نہیں۔ حالانکہ کافر کا اعتقاد اس کے متعلق یہ ہے کہ وہ اس کا سفارشی بنے گا۔ پھر فرمایا قیامت کے دن یہ کافر بڑے زوردار انداز سے کہہ اٹھے گا جبکہ وہ بتوں کا نقصان ملاحظہ کرے گا۔ مگر شفاعت کا ذرا بھر اثر نہ دیکھے گا۔ جس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے کہ یہ بہت برا مددگار ساتھی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھی جن کو مقرر کر رکھا ہے۔" صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا، (یا رسول اللہ!) اور آپ کے ساتھ بھی؟ آپ نے جواب دیا: "ہاں! میرے ساتھ بھی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلے میں میری مدد فرمائی ہے اور وہ مطیع بن گیا ہے، سو وہ مجھے خیر کے سوا اور کوئی حکم نہیں دیتا۔" دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: "تم میں سے ہر کسی کے ساتھ ایک ساتھی جنوں میں سے اور ایک ساتھی فرشتوں میں سے مقرر کر دیا گیا ہے۔"[1]

---

[1]۔[مسلم، کتاب صفات المنافقین، باب تحریش الشیطان وبعثہ سرایاہ لفتنۃ الناس۔۔الخ: ۲۸۱۴]

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾﴾

بلاشبہ جولوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے یقیناً اللہ ان کو بہشتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔(۱۴) جو شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی دنیا اور آخرت میں ہرگز مدد نہیں کرے گا تو اسے چاہیے کہ وہ آسمان کی طرف ایک رسی باندھ لے، پھر (اس سے لٹک کر اسے) کاٹ دے، پھر دیکھے کیا اس کی (خودکشی کی) تدبیر اس کے غصہ کو دور کرتی ہے۔(۱۵) اور اسی طرح ہم نے قرآن کو کھلی کھلی آیتیں بنا کر نازل کیا ہے اور یہ بھی کہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔(۱۶)

اس آیت میں ایمان اور اعمال صالحہ والوں کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور وہ اپنی حکمتوں کے تقاضے کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے، اپنی اطاعت کرنے والوں کو اچھا بدلہ دیتا ہے اور نافرمانوں کو عذاب دیتا ہے۔ سیدنا سہل بن سعد الساعدی ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ایک مجلس میں حاضر تھا، اس میں آپ نے جنت کا حال بیان کیا، یہاں تک کہ بے انتہا تعریف فرمائی، آخر میں فرمایا: "جنت میں ایسی ایسی نعمتیں ہیں جنھیں کسی آنکھ نے دیکھا نہیں، نہ کسی کان نے ان کی تعریف سنی ہے اور نہ ان کا تصور کسی آدمی کے دل میں پیدا ہوا ہے۔"[1]

ایک تفسیر یہ ہے عطاءؒ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباس ؓ نے کہا یہ ضمیر "من" کی طرف لوٹتی ہے۔ مجاہدؒ اور ابو عبیدہؒ کا بھی یہی قول ہے اور اب معنی اس طرح ہے اور جس شخص کا یہ گمان ہے کہ (سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دین کو قبول کرنے سے) اللہ اس کی دنیا اور آخرت میں مدد نہیں کرے گا یعنی اس کو رزق نہیں دے گا تو وہ آسمان میں رسی باندھ کر اپنا گلا گھونٹ لے۔[2]

دوسری تفسیر وہ ہے جو طبری نے صحیح سند کے ساتھ مجاہدؒ سے نقل کی ہے کہ جو شخص (اپنے متعلق) یہ گمان کرتا ہو کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں (اس کی کبھی مدد نہیں کرے گا) اسے کبھی رزق نہیں دے گا، وہ اوپر کی طرف رسی لٹکا کر اپنا گلا گھونٹ لے، پھر دیکھے۔۔ یعنی جو شخص اللہ کی نصرت پر یقین کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ایسے ناامید شخص کو چاہیے کہ وہ پھانسی لے کر مر جائے، پھر دیکھے کہ کیا اس سے اس کی امید بر آتی ہے؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کو کہا جائے کہ اگر تم فلاں بات پر یقین نہیں کرتے تو جاؤ دیوار سے ٹکر مار کر

۱۔ [مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا، باب صفۃ الجنۃ: ۲۸۲۵]

۲۔ (زاد المسیر ج ۵ ص 413) (جامع البیان جز 17 ص 168، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

مرجاؤ۔

شاہ عبدالقادرؒ نے اس آیت کی ایک بہت عمدہ تفسیر فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں: "دنیا کی تکلیف میں جو اللہ تعالیٰ سے ناامید ہو کر اس کی بندگی چھوڑ دے اور جھوٹی چیزوں کی پوجا کرے، جن کے ہاتھ نہ برا ہے نہ بھلا، وہ اپنے دل کو سمجھانے اور تسلی دینے کے لیے یہ صورت قیاس کر لے کہ جیسے ایک شخص اونچی لٹکتی رسی سے لٹک رہا ہے، اگر چڑھ نہیں سکتا تو توقع تو ہے کہ رسی اوپر کھینچے تو چڑھ جاوے۔ جب رسی توڑ دی پھر کیا توقع ؟ رسی کہا اللہ کی امید کو اور اس رسی کو آسمان کی طرف تانے یعنی اونچان کی طرف۔" (موضح القرآن)

آگے فرمایا اور ہم نے اسی طرح اس قرآن کریم کو بذریعہ جبرائیل امین نازل کیا ہے جس میں حلال و حرام کی واضح آیات ہیں اور جو شخص ہدایت کا اہل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنے دین کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَ الصّٰبِـُٔوۡنَ وَ النَّصٰرٰی وَ الۡمَجُوۡسَ وَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡۤا ۟ۖ اِنَّ اللّٰهَ یَفۡصِلُ بَیۡنَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ ﴿۱۷﴾ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسۡجُدُ لَهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ الشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ وَ النُّجُوۡمُ وَ الۡجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ

وَ كَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۱۸﴾

بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے یا وہ لوگ جو یہودی اور ستارہ پرست نصاری (مسیحی) اور مجوس (آتش پرست) اور مشرک بن گئے تو بلاشبہ قیامت کے دن اللہ ان کے درمیان فیصلہ فرمادے گا۔ بیشک اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔(۱۷) کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ جو بھی آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ درخت اور چوپائے اور بہت سے انسان وہ سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن پر اللہ کا عذاب نازل ہو چکا ہے اور جن کو اللہ ذلیل کردے ان کو کوئی دوسرا عزت دینے والا نہیں۔ اللہ ہی کرتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے۔(۱۸)

مجوسیوں کا مذہب

مجوس آگ پوجتے ہیں اور دو خالق مانتے ہیں ایک خیر کا خالق جس کا نام "یزدان" ہے دوسرا شر کا جس کو "اہرمن" کہتے ہیں اور کسی نبی کا نام بھی لیتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ پیچھے بگڑے ہیں یا سرے سے غلط ہیں۔ شہرستانی نے "ملل ونحل" میں ان کے مذہب پر جو کلام کیا ہے اسے بیان کرتے ہیں۔

صابئین کے بارے میں تین قول

پہلا قول: امام شہرستانیؒ ملل ونحل میں فرماتے ہیں کہ یہ کواکب پرستوں کا گروہ ہے جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے زمانہ میں تھا کواکب اور نجوم کی تعظیم ان کا مذہب تھا بعض یہ کہتے ہیں کہ اس عالم کی تدبیر انہی کواکب کے سپرد ہے اور بعض سرے سے قادر مختار کے منکر تھے اور تغیرات عالم کو انہی کی طرف منسوب کرتے تھے اور ان کی اصلاح اور ہدایت کے لیے ابراہیم (علیہ السلام) مبعوث ہوئے تھے یہ فرقہ صائبین نہ کسی ملت اور مذہب کا قائل تھا اور نہ پیغمبر اور پیغمبری کا قائل تھا اس فرقہ کے مقابل فرقہ کا نام حنفاء تھا جو ابراہیم (علیہ السلام) حنیف کے ماننے والے تھے۔

دوسرا قول: صابئین ایک قوم ہے جو فرشتوں کو پوجتی ہے اور قبلہ کی طرف نماز پڑھتی ہے اور زبور پڑھتی ہے اور صابئین اہل کتاب میں کا ایک فرقہ ہے۔

تیسرا قول: صابئین ایک قوم ہے جو مجوس اور نصاریٰ کے درمیان ہے اور ان کا کوئی دین نہیں اور نہ ان کی کوئی شریعت ہے اور نہ کسی ملت کی جانب منسون ہیں اور نہ کسی پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہی مختلف اقوال کی بنا پر فقہاء میں اختلاف ہے کہ ان کا ذبیحہ حلال ہے یا حرام اور ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے یا ناجائز۔ جن فقہاء کے نزدیک صائین اہل کتاب میں کا کوئی فرقہ ہے تو ان کے نزدیک ان کا ذبیحہ حلال ہے اور ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے اور جن فقہاء کے نزدیک یہ نیا دینی فرقہ ہے ان کے نزدیک انکا ذبیحہ حلال نہیں اور نہ ان کی عورتوں سے نکا جائز ہے۔

سب کا فیصلہ ہوجائے گا:

یعنی تمام مذاہب وفرق کے نزاعات کا عملی اور دوٹوک فیصلہ حق تعالیٰ کی بارگاہ سے قیامت کے دن ہوگا۔ سب جدا کر کے اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیئے جائیں گے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون کس مقام یا کس

سزا کا مستحق ہے۔

الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا سے مراد ہیں بت پرست۔ یَفۡصِلُ بَیۡنَہُمۡ یعنی حق پرست کو باطل پرست سے الگ کردے گا حق پرست کی حق پرستی اور باطل پرست کی باطل پرستی ظاہر کردے گا) یا یہ مراد ہے کہ اللہ ہر ایک کو اس کے مناسب بدلہ دے گا کسی فریق کو جنت میں اور کسی کو دوزخ میں بھجوادے گا۔

امام ابن جریر طبری متوفی 310ھ نے لکھا ہے کہ آسمان والوں اور زمین والوں اور پہاڑوں اور درختوں اور چوپایوں کا سجدہ کرنا دراں ان چیزوں کا سایہ ہے جب ان چیزوں پر سورج طلوع ہوتا ہے اور جب ان سے زائل ہوتا ہے اس وقت ہر چیز کا سایہ مڑ جاتا ہے اور یہی اس کا سجدہ کرنا ہے، اور سورج چاند اور ستاروں کا سجدہ کرنا ان کا غروب ہونا ہے۔

اور فرمایا: اور بہت سے لوگ یعنی بت کو بنو آدم سجدہ کرتے ہیں اور وہ مومنین ہیں۔

نیز فرمایا: اور بہت سے وہ بھی ہیں جن پر عذاب مقدر ہو چکا ہے۔ یعنی بہت سے بنو آدم ایسے ہیں جن کے لیے عذاب ثابت ہے اور ان کے کفر کی وجہ سے ان پر عذاب واجب ہے، اس کے باوجود ان کے سائے بھی اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ [1]

سیدنا ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غروب آفتاب کے وقت ابوذر سے پوچھا: "جانتے ہو یہ سورج کہاں جاتا ہے؟" تو میں نے جواب دیا، اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "یہ عرش تلے جا کر اللہ کو سجدہ کرتا ہے، پھر (دوبارہ طلوع ہونے کی) اجازت طلب کرتا ہے اور اسے اجازت دے دی جاتی ہے۔ وقت آرہا ہے کہ جب یہ سجدہ کرے گا تو اس کا سجدہ قبول

---

[1] (جامع البیان جز 17 ص 170-171 مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

نہیں ہوگا، اجازت مانگے گا تو اجازت نہیں دی جائے گی اور اس سے کہہ دیا جائے گا کہ جہاں سے آیا ہے وہیں واپس چلا جا، تو یہ مغرب ہی سے طلوع ہوگا۔"[1]

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص آیا اور اس نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! رات میں نے خواب میں دیکھا، گویا میں ایک درخت کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہوں، جب میں نے سجدہ کیا تو میرے سجدہ کرنے کی وجہ سے درخت نے بھی سجدہ کیا اور میں نے سنا کہ درخت سجدے میں کہہ رہا تھا: (اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِيْ بِهَا عِنْدَكَ اَجْرًا، وَضَعْ عَنِّيْ بِهَا وِزْرًا، وَّاجْعَلْهَا لِيْ عِنْدَكَ ذُخْرًا، وَ تَقَبَّلْهَا مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوٗدَ) "اے اللہ! تو اس سجدے کو قبول فرما اور اس کا ثواب اپنے ہاں لکھ دے اور اس کے سبب سے تو گناہوں کا بوجھ مجھ سے دور کر دے اور اس سجدے کو تو میرے لیے اپنے ہاں ذخیرہ بنا دے اور تو اس سجدے کو میری طرف سے ایسے ہی قبول فرما لے جیسے تو نے اپنے بندے داؤد (علیہ السلام) سے قبول فرمایا تھا۔"

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آیت سجدہ کی تلاوت فرمائی، پھر سجدہ کیا تو میں نے سنا کہ آپ سجدے میں وہی کلمات کہہ رہے تھے جن کے بارے میں اس شخص نے بتایا تھا کہ اس نے درخت سے حالت سجدہ میں یہ الفاظ سنے تھے۔[2]

وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ: سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جب انسان سجدے کی آیت پڑھ کر سجدہ کرتا ہے تو شیطان الگ ہٹ کر رونے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے مجھ پر افسوس! ابن آدم کو سجدے کا حکم ملا، اس نے سجدہ کر لیا اور جنتی بن گیا مگر

۱۔[بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفۃ الشمس والقمر: ۳۱۹۹۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الزمن الذی لا یقبل فیہ الایمان: ۱۵۹]

۲۔[ترمذی، کتاب الجمعۃ، باب ماجاء مایقول فی سجود القرآن: ۵۷۹۔ ابن ماجہ، کتاب إقامۃ الصلوات، باب سجود القرآن: ۱۰۵۳]

مجھے سجدے کا حکم دیا گیا تو میں نے انکار کر دیا اور جہنمی بن گیا۔"[1]

سیدنا عقبہ بن عامرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! کیا سورہ حج کو دو سجدوں کی وجہ سے باقی تمام سورتوں پر فضیلت حاصل ہے؟ آپ نے فرمایا: "ہاں! اور جو یہ نہ کرنا چاہے وہ ان کی تلاوت ہی نہ کرے۔"[2]

﴿ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۫ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿۱۹﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۱﴾ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۫ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۲۲﴾ ﴾

یہ دو گروہ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا سو جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لیے آگ کے کپڑے بنائے جائیں گے، ان کے سروں پر گرم پانی ڈال دیا جائے گا۔ (۱۹) جس سے ان کے پیٹ کے اندر کے حصے اور کھالیں

۱۔ [مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان إطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلوۃ: ۸۱۔ مسند أحمد: ۲/ ۴۴۳، ح: ۹۷۲۶]

۲۔ [ترمذی، کتاب الجمعۃ، باب ماجاء فی السجدۃ فی الحج: ۵۷۸۔ أبوداؤد، کتاب سجود القرآن، باب تفریع أبواب السجود۔۔۔ الخ: ۱۴۰۲]

بھی گل جائیں گی۔(۲۰)اوران کافروں کو مارنے کیلئے لوہے کے گرز ہوں گے ۔(۲۱)جب بھی وہ غم کے سبب دوزخ سے نکلنا چاہیں گے تو ان کو پھر اسی میں دھکیل دیا جائے گا۔اور(ان سے کہا جائے گا کہ)جلنے کا عذاب چکھو ۔(۲۲)

شان نزول:(آیت)ھذان خصمن"۔(الخ)

امام بخاریؒ ومسلمؒ نے حضرت ابوذرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آیت مبارکہ حضرت حمزہؓ،عبیدہؓ علی بن ابی طالبؓ اور عتبہ، شیبہ، ولید بن عتبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔اور امام حاکمؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کیا فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے غزوہ بدر میں ہم نے جومبارزت کی، نیز امام حاکمؒ نے دوسرے طریقے سے حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت مبارکہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے بدر کے دن جنگ کی یعنی حضرت حمزہؓ،حضرت علیؓ،حضرت عبیدہؓ اور عتبہ بن ربیعہ،شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ،اور ابن جریرؒ نے عوفی کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ ہم تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہیں اور ہماری کتاب بھی مقدم ہے اور ہمارا نبی بھی تمہارے نبی سے مقدم ہے،مسلمانوں نے ان کے جواب میں کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے قرب کے زیادہ مستحق ہیں ہم رسول اکرم(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)پر اور تمہارے نبی پر اور اللہ تعالیٰ نے جو کتاب نازل کی ہے سب پر ایمان لائے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا یہ اہل کتاب ہیں،جنہوں نے مومنین سے کہا تھا ہم تم

سے زیادہ اللہ کے قریب ہیں، ہماری کتاب تم سے پہلے نازل ہوئی اور ہمارے نبی تمہارے نبی سے پہلے تھے اور مومنین نے کہا ہم اللہ کے زیادہ حق دار ہیں ہم سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے اور تمہارے نبی پر بھی ایمان لائے اور اللہ نے جو کتاب نازل کی ہے اس پر بھی ایمان لائے۔ تم ہماری کتاب کو اور ہمارے نبی کو پہچانتے تھے پھر تم نے ان کو چھوڑ دیا اور ان سے حسد کی وجہ سے ان کا کفر کیا، ان کی یہ خصومت ان کے رب کے سامنے ہوگی۔ [1]

امام ابن جریرؒ نے جھگڑا کرنے والے دو فریقوں کے متعلق اور بھی اقوال ذکر کئے ہیں:

عکرمہؒ نے کہا اس سے مراد جنت اور دوخ ہیں۔ دوزخ نے کہا اللہ نے مجھے سزا دینے کے لیے پیدا کیا ہے اور جنت نے کہا اللہ نے مجھے رحمت کے لیے پیدا کیا ہے۔

عاصمؒ نے کہا اس سے مراد اہل الشرک اور اہل اسلام ہیں۔

مجاہدؒ نے کہا اس سے راد مومن اور کافر ہیں جن کی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے میں بحث ہوئی۔ [2]

آخرت میں کفار کی تین قسم کی سزائیں

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کفار کی آخرت میں سزا کے تین حال بیان فرمائے:

(ا) سو جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے کپڑے بیونت (کاٹ) کر کے بنائے جائیں گے۔ آگ کے کپڑوں سے مراد یہ ہے کہ آگ ان کے پورے جسم کا احاطہ کرلے گی۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے:

لھم من جھنم مھاد ومن فوقھم غواش (الاعراف: 41) ان کے لیے دوزخ کی آگ کا بچھونا ہوگا اور ان کے

ا۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 18889، تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: 13819)

۲۔ (جامع البیان جز 17 ص 174 مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

اوپر اسی کا اوڑھنا ہوگا۔

(۲) دوسرا حال یہ ہے کہ اور ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی انڈیلا جائے گا جس سے وہ سب گل جائے گا جو ان کے پیٹوں میں ہے اور ان کی کھالیں (بھی گل جائیں گی)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اگر اس پانی کا ایک قطرہ بھی پہاڑوں پر ڈالا جائے تو وہ گل جائیں گے۔ اس گرم پانی کو جب ان کے سروں کے اوپر سے ڈالا جائے گا تو جس طرح وہ ان کے ظاہر جسم پر اثر کرے گا، اسی طرح ان کے جسم کے باطن پر بھی اثر کرے گا اور ان کے پیٹ، انتڑیاں اور دیگر اجزاء جل جائیں گے جیسا کہ حدیث میں ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کھولتا ہوا پانی ان کے سروں کے اوپر سے انڈیلا جائے گا اور وہ کھولتا ہوا پانی ان کے جسم کے اندر داخل ہو کر ان کے پیٹ تک پہنچ جائے گا اور جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے، اس کو کاٹ ڈالے گا حتیٰ کہ وہ پانی ان کے قدموں سے نکل جائے گا پھر دوبارہ ان کے سروں پر ڈالا جائے گا۔

(و) تیسرا حال یہ ہے کہ اور ان (کو مارنے) کے لیے لوہے کے گرز ہیں جب وہ (شدت تکلیف سے) اس آگ سے نکلنے کا ارادہ کریں گے، ان کو پھر اسی آگ میں جھونک دیا جائے گا (اور ان سے کہا جائے گا) اوجلانے والے عذاب کو چھوھو

ابوظبیان نے بیان کیا کہ جب دوزخ کی آگ جوش سے ابل رہی ہوگی اور ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پھینک رہی ہوگی تو دوزخ ان کو دوزخ کے بڑے دروازوں کی طرف پھینک دے گی اسوقت وہ دوزخ سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو دوزخ کے محافظ انہیں لوہے کے گرز مار کر پھر دوزخ میں پھینک دیں

گے۔ایک قول یہ ہے کہ جب ان کی تکلیف بہت بڑھ جائے گی تو وہ دوزخ سے نکل کر اس کے کناروں تک پہنچیں گے تو فرشتے گرز مار کر انہیں پھر دوزخ میں دھکیل دیں گے۔ [1]

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۲۳﴾ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿۲۴﴾ ﴾

بیشک جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے اللہ ان لوگوں کو، ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا۔(۲۳) اور انہیں پاکیزہ بات کی طرف ہدایت دی گئی اور انھیں اس اللہ کی طرف رہنمائی کی گئی جو تمام صفات کا مالک ہے۔(۲۴)

آخرت میں مومنوں پر چار قسم کے انعامات

اس سے پہلی آیتوں میں آخرت میں کفار کی تین قسم کی سزاؤں کا بیان فرمایا تھا اور ان آیتوں میں آخرت

---

[1] (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۲ ص 27 مطبوعہ دار الفکر بیروت 1415ھ)

میں مومنوں کے چار قسم کے انعامات کا بیان فرمایا ہے،

(۱) پہلا انعام ان کے مسکن کا ذکر ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کو ان جنتوں میں رکھے گا جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں۔

(۲) دوسرا ان انعام یہ ہے کہ ان کا لباس ریشم کا ہوگا، دنیا میں ریشم مردوں پر حرام کر دیا تھا اور آخرت میں ان پر ریشم حلال فرما دیا۔

ابن ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں کہ حضرت حذیفہؓ مدائن میں تھے، انہوں نے پانی مانگا ایک دہقان ان کے لیے چاندی کے برتن میں پانی لایا۔ حضرت حذیفہ نے اس برتن کو پھینک دیا پھر کہا میں نے یہ چاندی کا برتن اس لیے پھینکا ہے کہ میں نے اس کو چاندی کے برتن میں پانی دینے سے منع کیا تھا مگر یہ باز نہیں آیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: سونا اور چاندی اور ریشم اور دیباج (ریشم کی ایک قسم) کفار کے لیے دنیا میں ہیں اور یہ تمہارے لیے آخرت میں ہونگے۔ [1]

(و) تیسرا انعام یہ ہے کہ مومنوں کو جنت میں زیورات پہنائے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں یہ حدیث ہے:

ابو حازمؒ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اور وہ نماز کا وضو کر رہے تھے، وہ اپنا ہاتھ بغل تک دھو رہے تھے میں نے کہا اے ابو ہریرہ! یہ کیسا وضو ہے؟ انہوں نے کہا اے چوز کے بچے! تو یہاں کھڑا ہوا ہے!! اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ تو یہاں کھڑا ہے تو میں اس طرح وضو نہ کرتا۔ میں نے اپنے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا ہے کہ جہاں تک مومن کا وضو پہنچے گا، وہاں تک

۱۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 5831 صحیح مسلم رقم الحدیث: 2028 سنن النسائی رقم الحدیث: 5301)

اس کا زیور پہنچے گا۔ [1]

اس حدیث میں مومن کو جنت میں زیورات پہنانے کا بھی ثبوت ہے اور ناسمجھ لوگوں کو ڈانٹنے کا بھی ثبوت ہے اور یہ بھی ثبوت ہے کہ خاصاں دی گل عاماں اگے نہیں مناسب کرنی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا لوگوں کے سامنے ایسی احادیث بیان کرو جو ان کے درمیان معروف ہیں (یعنی ان کے سامنے کوئی نئی بات نہ بیان کرو) کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی جائے۔ [2]

اس آیت میں فرمایا ہے: ان جنتوں میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ایک اور آیت میں ہے:

علیھم ثیاب سندس خضر واستبرق وحلوا اساور من فضۃ (الدھر:21) ان کے جسموں پر سبز باریک اور دبیز ریشمی کپڑے ہوں گے اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ انہیں جنت میں سونے، چاندی اور موتیوں کے کنگن پہنائے جائیں گے۔

مردوں کے لیے سونے اور چاندی کے زیورات کی جنت میں تخصیص کی وجہ

علامہ ابوعبداللہ قرطبی مالکیؒ متوفی 668ھ نے لکھا ہے کہ مفسرین نے کہا ہے کہ جب کہ دنیا کے بادشاہ کنگن اور تاج پہنتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے جنت میں ان کا پہننا حلال کر دیا۔ [3]

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانیؒ متوفی 852ھ لکھتے ہیں:

ابن عینیہ نے از اسرائیل از ابومسویٰ از حسن روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے

۱۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: 250، سنن النسائی رقم الحدیث: 149)

۲۔ (صحیح البخاری کتاب العلم باب: 49)

۳۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۲ ص 28)

سراقہ بن مالک سے فرمایا، اس وقت تمہاری کیا شان ہوگی جب تم کسریٰ کے کنگن پہنو گے۔ (۱)
انہوں نے کہا کہ جب حضرت عمرؓ کے پاس کسریٰ کے کنگن اور اس کا مطنقہ (پٹکا) اور تاج لایا گیا تو حضرت عمرؓ نے وہ کنگن حضرت سراقہ کو پہنا دیئے۔ حضرت سراقہ پست قد تھے اور ان کی کلائیوں پر بال بہت زیادہ تھے، حضرت عمر نے کہا اپنے ہاتھ اوپر اٹھائیں اور کہیں اللہ کے لیے سب تعریفیں ہیں جس نے یہ کنگن کسریٰ بن ہرمز یس اتار کر سراقہ اعرابی کو پہنا دیئے۔ (۲)

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "مومن کو وہاں تک زیور پہنایا جائے گا جہاں تک اس کے وضو کا پانی پہنچے گا۔" (۳)

سیدنا انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جو ریشم کو دنیا میں پہن لے گا وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا۔" (۴)

سیدنا جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جیسے سانس بے قصد و بے تکلف آتا جاتا رہتا ہے، اسی طرح جنتیوں کو تسبیح و تحمید کا الہام ہوگا۔" (۵)

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ِۨالْعَاكِفُ فِیْهِ وَالْبَادِ ؕ

۱۔ (اتحاف السادۃ المتقین ج ۷ ص 18)

۲۔ (الاصابہ ج ۳ ص 35-36 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1415ھ)

۳۔ [مسلم، کتاب الطہارۃ، باب تبلغ الحلیۃ۔۔الخ: ۲۵۰]

۴۔ [بخاری، کتاب اللباس، باب لبس الحریر للرجال۔۔الخ: ۵۸۳۲۔ مسلم، کتاب اللباس، باب تحریم لبس الحریر وغیر ذلک للرجال: ۷۳]

۵۔ [مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا، باب فی صفات الجنۃ واھلھا وتسبیحھم فیھا بکرۃ وعشیا: ۲۸۳۵۔ مسند احمد: ۳/۳۴۹، ح: ۱۴۷۸۱]

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۵﴾

بیشک وہ لوگ جو کافر ہوئے اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور مسجد الحرام سے منع کرتے ہیں جسے ہم نے لوگوں کے لیے یکساں عبادت گاہ بنایا ہے خواہ وہ وہاں کا رہنے والا ہو یا باہر سے آنے والا ہو اور جو کوئی اس میں اللہ کی حدود کو تجاوز کرتے ہوئے شرک و بدعت کی راہ اختیار کرے گا، ہم اسے دردناک عذاب کا مزا چکھائیں گے۔

شان نزول: (آیت) "ومن یرد فیہ"۔ (الخ)

ابن ابی حاتم ؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عبداللہ بن انیس کو دو افراد کے ساتھ بھیجا ایک ان میں مہاجر تھے، دوسرے انصاری چنانچہ تینوں نے آپس میں نسب پر فخر کیا، عبداللہ بن انیس کو غصہ آیا اور اس نے انصاری کو قتل کر دیا پھر اسلام سے مرتد ہو کر مکہ مکرمہ بھاگ گیا، اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

بیشک جن لوگوں نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن حکیم کے ساتھ کفر کیا جیسا کہ حضرت ابوسفیان اور ان کے ساتھی (اس واقعہ تک حضرت ابوسفیان اسلام نہیں لائے تھے) اور لوگوں کو دین خداوندی اور اطاعت خداوندی سے روکتے ہیں اور مسجد حرام سے بھی روکتے ہیں جب کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے صحابہ کرام حدیبیہ کے سال عمرہ کے لیے تشریف لے جا رہے تھے

حالانکہ جس مقام کو ہم نے سب آدمیوں کے لیے حرم اور قبلہ بنایا ہے اس میں سب برابر ہیں اس حرم کے اندر رہنے والا بھی اور باہر سے آنے والا بھی اور جو شخص حرم میں کسی خلاف دین کام کی ظلم کے ساتھ ابتدا کرے گا تو ہم اسے دردناک عذاب دیں گے یعنی سخت ترین اس کو سزا دیں گے تاکہ اس کو پھر کسی پر ظلم کرنے کی جرأت نہ ہو، یہ آخری آیت عبداللہ بن انس بن حنظل کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس نے مدینہ منورہ میں ایک انصاری کو جان بوجھ کر قتل کر دیا اور پھر اسلام سے مرتد ہو کر مکہ مکرمہ میں جا کر پناہ حاصل کی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی یعنی جو شخص قصداً قتل ظلم و شرک کا ارتکاب کر کے مکہ مکرمہ میں پناہ لے گا تو ہم اس کو دردناک سزا دیں گے یعنی اسے کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا جائے گا اور نہ کسی قسم کی پناہ دی جائے گی تاوقتیکہ حرم سے باہر سے نہ نکلے پھر اس پر دفعہ گرائی جائے گی۔

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ابوجہل نے کہا، اگر میں نے کعبہ کے پاس محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو میں ہر صورت ان کی گردن روند ڈالوں گا۔ یہ بات رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پہنچی تو آپ نے فرمایا: "اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کو فرشتے پکڑ لیں گے۔"[1]

سیدنا عمرو بن عبسہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں جاہلیت کے دور میں گمان کرتا تھا کہ لوگ گمراہی میں ہیں اور کسی (سیدھی) راہ پر نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ سب لوگ بتوں کو پوجتے تھے۔ اسی اثنا میں میں نے ایک شخص کی خبر سنی کہ وہ مکہ میں ہے اور بہت سی خبریں سناتا ہے۔ میں اپنی سواری پر بیٹھا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان دنوں چھپے ہوئے تھے اور ان کی قوم ان پر غالب

---

[1]۔ [بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ تعالیٰ: (کلالئن لم ینتہ لنسفعا بالناصیۃ۔۔الخ): ۴۹۵۸]

اور مسلط تھی۔ میں نے خفیہ طور پر تدبیر کی، حتیٰ کہ میں مکہ میں آپ کے پاس پہنچ گیا اور آپ سے عرض کی کہ آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: "میں نبی ہوں۔" میں نے عرض کی، نبی کسے کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: "مجھے اللہ نے (پیغام دے کر) بھیجا ہے۔" میں نے کہا، آپ کو کیا پیغام دے کر بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے مجھے رشتہ داروں کے ساتھ نیکی کرنے، بتوں کو توڑنے، اللہ کو ایک ماننے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے کا حکم دے کر بھیجا ہے۔" میں نے عرض کی، آپ کے ساتھ ان باتوں میں کون کون قائم ہے؟ فرمایا: "آزاد بھی اور غلام بھی۔" اس دن ایمان لانے والوں میں سے آپ کے ساتھ صرف ابوبکر اور بلالؓ تھے۔ میں نے کہا، میں بھی آپ کی اتباع کروں گا۔ آپ نے فرمایا: "ابھی تم اس کی طاقت نہیں رکھتے، تم نہیں دیکھتے کہ میرا اور لوگوں کا کیا حال ہے؟ ابھی تم اپنے اہل وعیال کے پاس چلے جاؤ اور جب تم سنو کہ میں غالب آ گیا ہوں تو میرے پاس آ جانا۔" الغرض، میں اپنے اہل و عیال کے پاس لوٹ آیا۔ [1]

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا ابوذرؓ نے جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے متعلق سنا تو انھوں نے اپنے بھائی کو مکہ بھیجا، اس نے واپس جا کر خبر دی، لیکن ان کی تسلی نہ ہوئی تو وہ خود مکہ پہنچے اور مسجد حرام میں آئے، انھوں نے وہاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تلاش کیا، لیکن وہ آپ کو پہچانتے نہیں تھے اور انھوں نے (مشرکین کے خوف کی وجہ سے) آپ کے متعلق کسی سے پوچھنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ الغرض وہ تین دن کی تگ و دو کے بعد سیدنا علیؓ کی معاونت سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچ گئے اور جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت سنی تو فوراً

۱۔ [مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب إسلام عمرو بن عبسۃ: ۸۳۲]

اسی جگہ اسلام قبول کرلیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے فرمایا: "ابھی تو تم اپنی قوم کے لوگوں میں چلے جاؤ اور ان کو (اسلام کی) خبر دو (اور اسی حالت میں رہو) جب تک تمہیں میرے (غلبہ کی) خبر نہ پہنچے۔" ابوذرؓ نے عرض کی، اللہ کی قسم! میں تو مشرکوں کے سامنے اسلام کا کلمہ بلند کروں گا۔ وہ باہر نکلے اور مسجد حرام میں پکار کر کہا: (اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ) یہ سنتے ہی (قریش کے) کچھ لوگ کھڑے ہوئے اور انھیں اتنا مارا کہ مارتے مارتے زمین پر لٹا دیا۔ اتنے میں عباسؓ وہاں آ نکلے اور ابوذرؓ پر اوندھے منہ لیٹ گئے اور کہنے لگے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ (یہ شخص) قوم غفار کا فرد ہے اور جب تم تجارت کے لیے ملک شام جاتے ہو تو راستے میں اس کی قوم پڑتی ہے؟ یہ کہہ کر سیدنا عباسؓ نے انھیں چھڑایا۔ دوسرے دن پھر ابوذرؓ نے یہی کیا، پھر لوگوں نے ان کو مارا اور پھر سیدنا عباسؓ آئے اور ان پر اوندھے منہ لیٹ گئے۔ [1]

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ اپنے والد سیدنا عمرؓ سے بیان کرتے ہیں کہ وہ ڈرے ہوئے گھر میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں ابوعمرو عاص بن وائل سہمی ایک دھاری دار حبری چادر اور ایک ریشمی کرتے کا جوڑا پہنے ہوئے ان کے پاس آیا۔ وہ بنی سہم کے قبیلہ سے تھا، جو جاہلیت کے زمانہ میں ہمارے حلیف تھے۔ اس نے کہا، عمر! تمہارا کیا حال ہے؟ انھوں نے کہا، تیری قوم کے لوگ کہتے ہیں کہ اگر میں نے اسلام قبول کیا تو مجھے مار ڈالیں گے۔ عاص نے کہا، جب میں نے امان دے دی تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ پھر عاص نے باہر نکل کر دیکھا تو میدان لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ عاص نے کہا، کیوں کہاں کا ارادہ ہے؟ انھوں نے کہا، خطاب کے بیٹے کی خبر لینے کا ارادہ ہے، جس نے اپنا دین بدل دیا۔ عاص نے کہا، تم کو ان تک پہنچنے

۱۔ [بخاری، کتاب المناقب، باب قصۃ إسلام أبي ذر (رض): ۳۵۲۲۔ مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل أبي ذر (رض): ۲۴۷۴]

کا کوئی حق نہیں (میں انھیں امان دے چکا ہوں) یہ سن کر وہ لوٹ گئے۔ [1]

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ: جیسا کہ ہاتھی والوں نے جب بیت اللہ کی تخریب کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تباہی و بربادی کے لیے ابابیل بھیج دیے تھے: (تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ)[الفیل:٤،٥] "جو ان پر کھنگر (پکی ہوئی مٹی) کی پتھریاں پھینکتے تھے۔ تو اس نے انھیں کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔"

یعنی انھیں تباہ و برباد کر کے ہر اس شخص کے لیے نمونہ عبرت بنا دیا جو یہاں کے بارے میں برا ارادہ کرے، اسی طرح حدیث میں ہے، سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "(قیامت کے قریب) ایک لشکر بیت اللہ پر حملے کے ارادے سے آئے گا اور جب وہ مقام بیداء میں پہنچیں گے تو سب کے سب مع اول و آخر کے دھنسا دیے جائیں گے۔" [2]

سعیدؒ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس آئے اور فرمایا، اے ابن زبیر! آپ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حرم کی بے حرمتی کرنے سے بچیں، کیونکہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا، آپ نے فرمایا: "قریش میں سے ایک شخص اللہ تعالیٰ کے حرم کی بے حرمتی کرے گا، اس کے گناہ اگر تمام جن وانس کے گناہوں سے تولے جائیں تو بھی بڑھ جائیں۔" دیکھو! خیال رکھو، کہیں تم وہی نہ بن جانا۔ [3]

۱۔ [بخاری، کتاب مناقب الأنصار، باب إسلام عمر بن خطاب (رض):٣٨٦٤]

۲۔ [بخاری، کتاب البیوع، باب ما ذکر فی الأسواق۔۔۔الخ:٢١١٨]

۳۔ [مسند أحمد:٢/١٣٦، ح:٦٢٠٥]

﴿ وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا
وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿٢٦﴾ وَاَذِّنْ
فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ
كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿٢٧﴾ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ
اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا
مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿٢٨﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ
وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿٢٩﴾ ﴾

اور جب ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو خانہ کعبہ کی جگہ بتادی کہ تم میرے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھنا۔(۲۶) اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو کہ وہ آپ کے پاس دور دراز راستوں سے پیدل اور ہر دبلے اونٹ پر سوار ہو کر آئیں گے۔(۲۷) تاکہ وہ ان فائدوں کو دیکھیں جو ان کے لیے رکھے گئے ہیں۔ اور تاکہ جو چار پائے خدا نے ان کو دے رکھے ہیں ان پر (قربانی کرتے

وقت) ایام مقررہ میں خدا کا نام یاد کیا کریں پھر ان میں سے آپ بھی کھاؤ اور محتاج فقیر کو بھی کھلاؤ۔(۲۸) پھر چاہیے کہ وہ اپنا میل کچیل دور کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور بیت عتیق کا طواف کریں۔(۲۹)

اس آیت کریمہ میں مشرکین قریش کو ڈانٹ پلائی گئی ہے کہ جو گھر پہلے دن سے اس لیے بنایا گیا تھا کہ وہاں صرف ایک اللہ کی عبادت ہو، تم لوگوں نے اس میں سیکڑوں بت لا کر رکھ دیے اور اللہ کو چھوڑ کر ان کی پوجا کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے بیت اللہ کی جگہ مقرر فرمادی تھی اور انھیں تعمیر کعبہ کا حکم دے دیا تھا اور کہا کہ اسے بنانے کے بعد اس میں صرف اسی کی عبادت کیجیے اور اسے ہر قسم کی آلائشوں اور گندگیوں سے پاک رکھیے، تاکہ طواف کرنے والوں، نماز پڑھنے والوں اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کو تکلیف نہ پہنچے۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل کی اور مسجد حرام کو اپنے بیٹے اسماعیل (علیہ السلام) کے ساتھ مل کر بنایا۔

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ متوفی 310ھ اپنی اسانید کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

قتادہؒ اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو زمین پر اتارا تو ان کے ساتھ اپنے بیت کو بھی زمین پر رکھ دیا۔ ابتداء میں یہ بہت بڑا تھا پھر اس کو چھوٹا کر کے ساٹھ ہاتھ کر دیا جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے زمین پر آ کر فرشتوں کی تسبیح کی آوازیں نہیں سنیں تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! میں نے تمہارے لیے اپنا بیت زمین پر رکھ دیا ہے، اس کے گرد بھی اس طرح طواف کیا جاتا ہے جس طرح میرے عرش کے گرد طواف کیا جاتا تھا اور اس کے پاس بھی اسی طرح نماز پڑھی جاتی ہے جس طرح میرے عرش کے

پاس نماز پڑھی جاتی تھی پھر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سفر کر کے بیت اللہ تک گئے اور اس کا طواف کیا اور ان کے بعد انبیاء (علیہم السلام) نی اس کا طواف کیا۔ ①

سدی ؒ بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) سے یہ عہد لیا کہ وہ طواف کرنے والوں کے لیے میرے بیت کو پاک کریں تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) روانہ ہو کر مکہ گئے پھر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) کدال اور پھاوڑے لے کر کھڑے ہوئے اور ان کو یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کعبہ کس جگہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے ہوا کو ایک سانپ کی صورت میں بھیجا اس نے کعبہ کے اردگرد اور اس کی پہلی بنیادوں سے کوڑا کرکٹ صاف کر دیا پھر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) نے ان بنیادوں سے کعبہ کی تعمیر شروع کی۔ ②

سیدنا ابوذر ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کی، اے اللہ کے رسول! سب سے پہلے زمین میں کون سی مسجد بنائی گئی؟ آپ نے فرمایا: "مسجد حرام۔" میں نے پوچھا، پھر کون سی؟ آپ نے فرمایا: "مسجد اقصیٰ۔" میں نے پوچھا، ان دونوں کی تعمیر کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟ آپ نے فرمایا: "چالیس سال کا۔" ③

علامہ سید محمود آلوسی ؒ متوفی 1270ھ لکھتے ہیں:

کعبہ کو پانچ مرتبہ بنایا گیا ہے، پہلی بار کعبہ کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے پہلے فرشتوں نے بنایا اور

---

①۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 18927، تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: 13872)

②۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 18928، تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: 13874 الجامع لاحکام القرآن جز 12 ص 35)

③۔ [بخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، بابٌ: ٣٣٦٦]

اس وقت یہ سرخ یاقوت سے بنا ہوا تھا۔ حضرت نوح (علیہ السلام) کے طوفان میں اس کی بنیادیں اکھڑ گئیں اور اس کو دوسری بار حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے بنایا۔ روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں بیت اللہ کو بنانے کا حکم دیا تو ان کو یہ پتا نہیں چلا کہ وہ کس جگہ بیت اللہ کو بنائیں پھر اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی جس کا نام ریح الخجوج تھا، اس نے کعبہ کی بنیادوں سے کوڑا کرکٹ صاف کر دیا پھر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کعبہ کو اس کی قدیم بنیادوں پر تعمیر کیا اور تیسری بار اس کو زمانہ جاہلیت میں قریش نے بنایا اس کی تعمیر میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی شریک تھے، اس وقت آپ جوان تھے جب انہوں نے حجر اسود کو نصب کرنے کا ارادہ کیا تو ان میں اختلاف ہوا ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ وہ اس کو نصب کرے پھر انہوں نے اس پر اتفاق کر لیا کل جو شخص سب سے پہلے کعبہ میں داخل ہوگا، وہی اس کو نصب کرے گا۔ دور سے دن سب سے پہلے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کعبہ میں داخل ہوئے۔ آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ حجر اسود کو ایک چادر پر رکھ دیں اور تمام قبیلوں کے سردار اس چادر کو مل کر اٹھائیں پھر آپ نے اس کو اٹھا کر اس کی جگہ نصب کر دیا۔ وہ آپ کو امین کہتے تھے یہ واقعہ آپ کے اعلان نبوت سے پندرہ سال پہلے کا ہے۔ چوتھی مرتبہ کعبہ کو حضرت عبداللہ ابن الزبیرؓ نے بنایا اور پانچویں بار اس کو حجاج نے بنایا اور وہی بنا آج تک قائم ہے۔ اس کی بلندی ستائیس ہاتھ ہے (تقریباً چالیس فٹ) اور اس کی لمبائی رکن یمانی سے حجر اسود تک پچیس ہاتھ (تقریباً پینتیس فٹ) ہے اور اس کا عرض رکن یمانی سے حجر اسود تک بیس ہاتھ ہے۔ (تقریباً تیس فٹ) اس کی مشرقی جانب میں ساگوان کی لکڑی کا دروازہ ہے جس پر چاندی سے کام کیا گیا ہے رکن یمانی اور حجر اسود کی درمیانی دیوار میں میزاب رحمت ہے۔ [1]

ا۔ (روح المعانی جز 17 ص 211، مطبوعہ دار الفکر بیروت 1417ھ)

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ آپ لوگوں میں حج کرنے کا اعلان کیجیے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا اے میرے رب! ان سب لوگوں تک میری آواز کیسے پہنچ گی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اعلان کرو آواز پہنچانا میرے کام ہے، پھر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اعلان کیا اے لوگو! تم پر اس قدیم گھر کا حج فرض کر دیا گیا پس تم حج کرو، آسمان اور زمین کی تمام مخلوق نے اس اعلان کو سنا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ زمین کے دور دراز علاقوں سے لوگ تلبیہ پڑھتے ہوئے حج کرنے کے لیے آتے ہیں۔ [1]

مجاہدؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے۔ اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ایک پتھر پر کھڑے ہو کر ندا کی: اے لوگو! اللہ نے تمہارے اوپر حج فرض کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ندا ان سب کو سنا دی جو مردوں کی پشت میں اور عورتوں کے رحموں میں تھے اور ان سب نے اس ندا کا جواب دیا جو اللہ کے علم میں قیامت تک حج کرنے والے تھے، انہوں نے کہا لبیک اللھم لبیک۔ [2]

مجاہدؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے سب سے اونچے پہاڑ پر کھڑے ہو کر حج کا اعلان کیا۔ اللہ تعالیٰ نے سات سمندروں کی گہرائی تک یہ اعلان سنوا دیا لبیک اطعنا، لبیک اجبنا ہم حاضر ہیں ہم نے اطاعت کی، ہم حاضر ہیں ہم نے قبول کیا اور قیامت تک وہی حج کر سکے گا جس نے اس ندا پر لبیک کہا تھا۔ [3]

۱۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 18935 تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: 13877، المستدرک ج ۲ ص 388-389)

۲۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 18936 المستدرک ج ۲ ص ۵۵۲)

۳۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیب: 13882، جامع البیان رقم الحدیث: 18939)

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جو شخص اللہ کے لیے حج کرے اور اس دوران میں شہوت اور گناہ کی باتیں نہ کرے تو وہ اس طرح پاک ہو کر لوٹتا ہے جس طرح اس دن پاک تھا، جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔"[1]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا گیا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: "اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔" پوچھا گیا، پھر کونسا عمل؟ فرمایا: "اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔" پوچھا گیا، اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: "حج مبرور۔"[2]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ایک عمرہ کے بعد دوسرا عمرہ دونوں کے درمیان کے گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کا بدلہ جنت کے سوا اور کچھ نہیں۔"[3]

سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "عرفہ سے بڑھ کر کوئی دن ایسا نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ بندوں کو آگ سے اتنا آزاد کرتا ہو جتنا عرفہ کے دن آزاد کرتا ہے اور (اس دن) اللہ تعالیٰ (بندوں کے) قریب ہوتا ہے اور بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ کس ارادے سے جمع ہوئے ہیں؟"۔[4]

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "یکے بعد دیگرے حج اور عمرہ کیا کرو، کیونکہ یہ دونوں فقر اور گناہوں کو اس طرح نکال دیتے ہیں جس طرح بھٹی

۱۔[بخاری، کتاب الحج، باب فضل الحج المبرور: ۱۵۲۱۔ مسلم، کتاب الحج، باب فضل الحج والعمرۃ: ۱۳۵۰]

۲۔[بخاری، کتاب الحج، باب فضل الحج المبرور: ۱۵۱۹]

۳۔[بخاری، کتاب العمرۃ، باب وجوب العمرۃ وفضلھا۔۔الخ: ۱۷۷۳۔ مسلم، کتاب الحج، باب فضل الحج والعمرۃ: ۱۳۴۹]

۴۔[مسلم، کتاب الحج، باب فضل یوم عرفۃ: ۱۳۴۸]

لوہے، سونے اور چاندی کے میل کو نکال دیتی ہے۔"[1]

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ : سیدنا انس ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دو چتکبرے سینگ دار مینڈھوں کی قربانی کی۔ آپ نے ان کو اپنے ہاتھ سے ذبح کیا اور (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا اور اس کی کبریائی بیان کی (یعنی "بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ" کہا) اور آپ نے اپنا پاؤں ان کی گردن پر رکھا۔[2]

سیدنا جابر ؓ بیان کرتے ہیں کہ (حج کے موقع پر) آپ نے اونٹنی کو آگے بڑھایا اور بیچ کی راہ لی جو جمرہ کبریٰ پر نکلتی ہے، یہاں تک کہ اس جمرہ کے پاس آئے جو درخت کے پاس ہے (اسی کو جمرہ عقبہ کہتے ہیں) اور سات کنکریاں اس کو ماریں اور ہر کنکری مارتے وقت "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" کہا۔ یہ کنکریاں ان کنکریوں کے مثل تھیں جو چٹکی سے ماری جاتی ہیں۔ آپ نے یہ کنکریاں وادی کے بیچ میں کھڑے ہو کر ماریں اور پھر نحر کی جگہ آئے اور تریسٹھ اونٹ اپنے دست مبارک سے نحر کیے۔ باقی سیدنا علی ؓ کو دیے، جو انھوں نے نحر کیے۔ آپ نے ان کو اپنی قربانی میں شریک کر لیا تھا۔ پھر حکم فرمایا: "ہر اونٹ میں سے گوشت کی ایک ایک بوٹی لے لیں۔" پھر وہ سارا گوشت ایک ہانڈی میں ڈالا گیا اور پکایا گیا، پھر آپ نے اور سیدنا علی ؓ نے اس میں سے گوشت کھایا اور اس کا شوربا پیا، پھر سوار ہوئے اور بیت اللہ کو روانہ ہو گئے۔[3]

فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ: سیدنا عبداللہ بن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ (اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ) سے دس دن مراد

۱۔ [ترمذی، کتاب الحج، باب ماجاء فی ثواب الحج والعمرۃ: ۸۱۰]

۲۔ [بخاری، کتاب الأضاحی، باب التکبیر عند الذبح: ۵۵۶۵۔ مسلم، کتاب الأضاحی، باب استحباب استحسان الضحیۃ وذبحھا مباشرۃ۔۔الخ: ۱۹۶۶]

۳۔ [مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): ۱۲۱۸]

ہیں۔ [1]

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ان دنوں کے عمل سے زیادہ کسی دن کے عمل میں فضیلت نہیں۔" صحابہ نے عرض کی، جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں؟ آپ نے فرمایا: "جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں الا یہ کہ کوئی شخص اپنی جان اور اپنا مال لے کر اللہ کے راستے میں نکل جائے، پھر ان میں سے کچھ بھی واپس لے کر نہ آئے۔" [2]

سیدنا عبداللہ بن عمر اور سیدنا ابو ہریرہؓ ان دس دنوں میں بازاروں میں نکل جاتے، تکبیریں پڑھتے اور انھیں تکبریں پڑھتے ہوئے سن کر دوسرے لوگ بھی تکبیریں پڑھا کرتے تھے۔ [3]

ان دس دنوں میں یوم عرفہ بھی شامل ہے جس کے بارے میں سیدنا ابوقتادہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یوم عرفہ کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: "مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ یہ گزشتہ (روزہ) اور آئندہ سال (کے گناہوں) کا کفارہ بن جائے گا۔"۔۔۔ [4]

سیدنا انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب منیٰ میں آئے تو پہلے جمرہ عقبہ پر گئے اور کنکریاں ماریں، پھر آپ منیٰ میں اپنی منزل میں تشریف لائے اور قربانی کی، پھر حجام سے کہا: "ہاں مونڈ دو۔" اور اشارہ کیا سر کے داہنی طرف اور پھر بائیں طرف اور پھر اپنے بال مبارک لوگوں کو دینا

۱۔[بخاری، کتاب العیدین، باب فضل العمل فی أیام التشریق تعلیقاً، قبل الحدیث:۹۶۹]
۲۔[بخاری، کتاب العیدین، باب فضل العمل فی أیام التشریق:۹۶۹]
۳۔[بخاری، کتاب العیدین، باب فضل العمل فی أیام التشریق تعلیقاً، قبل الحدیث:۹۶۹]
۴۔[مسلم، کتاب الصیام، باب استحباب صیام ثلاثۃ أیام۔۔الخ:۱۱۶۲/۱۹۶]

شروع کیے۔ [1]

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ (حج کے موقع پر) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے صحابہؓ میں سے ایک گروہ نے سر منڈایا اور بعضوں نے بال کتروائے۔ [2]

سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں، میں نے اپنے ان ہاتھوں سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس وقت بھی خوشبو لگائی جب آپ نے احرام باندھا اور اس وقت بھی خوشبو لگائی جب آپ نے طواف سے پہلے احرام اتارا۔ [3]

اس سے معلوم ہوا کہ مناسک حج میں سب سے آخری عمل یہ ہے کہ بیت اللہ کا طواف کیا جائے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی اسی طرح کیا تھا کہ یوم نحر کو جب آپ منیٰ میں واپس تشریف لائے تو آپ نے سب سے پہلے رمی کی اور جمرہ کبریٰ کو سات کنکریاں ماریں، پھر ہدی کے اونٹوں کو نحر کیا، سر مبارک منڈوایا، پھر مکہ مکرمہ میں واپس تشریف لائے اور بیت اللہ کا طواف کیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ ان کا آخری عمل بیت اللہ کا طواف ہونا چاہیے، البتہ حائضہ عورت سے تخفیف کر دی گئی ہے۔ [4]

﴿ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ

۱۔[مسلم، کتاب الحج، باب بیان أن السنة یوم النحر أن یرمی ثم ینحر۔۔الخ:۱۳۰۵]

۲۔[بخاری، کتاب الحج، باب الحلق والتقصیر عند الإحلال:۱۷۲۹]

۳۔[بخاری، کتاب الحج، باب الطیب بعد رمی الجمار۔۔الخ:۱۷۵۴]

۴۔[بخاری، کتاب الحج، باب طواف الوداع:۱۷۵۵۔مسلم، کتاب الحج، باب وجوب طواف الوداع۔۔الخ:۱۳۲۸]

وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا
الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۙ﴿۳۰﴾ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ
غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ
فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ﴿۳۱﴾ ذٰلِكَ ۚ
وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴿۳۲﴾ لَكُمْ
فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ
الْعَتِيْقِ﴿۳۳﴾ ع

اور جو شخص اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے۔ یہ اس کے رب کے نزدیک اور اس کے لیے بھی بہتر ہے اور تمہارے لیے چوپائے حلال کیے گئے ہیں سوائے ان چیزوں کے جو تمہیں بتائی جا چکی ہیں پس بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو۔ (۲۹) صرف ایک اللہ کے ہو کر اس کے ساتھ شرک کرنے والے نہ ہو، اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک کرے اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ آسمان سے گر پڑا پھر پرندوں نے اس کی بوٹیاں نوچ لیں یا ہوا، اسے کسی دور دراز جگہ لے

جا کر پھینک دے گی۔(۳۱) یہ سب کچھ (تم نے سن لیا) اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے گا تو یقیناً یہ (تعظیم کرنا) دل کا تقویٰ ہے۔(۳۲) تمہارے لیے ایک مقرر مدت تک قربانی کے ان جانوروں میں طرح طرح کے فائدے ہیں ۔پھر ان کی (قربانی) کی جگہ اسی قدیم گھر کے پاس ہے۔(۳۳)

حج کی ادائیگی کے بعد ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حرمات کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔جنھیں سورہ البقرۃ میں شعائر اللہ کہا گیا ہے۔ان حرمتوں میں بیت اللہ کا احترام، صفا اور مروہ، مزدلفہ میں مشعر حرام، قربانی کا جانور اور اس کا گوشت، مسلمان کا احترام و اکرام یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حرمتیں ہیں، ان کا احترام کرنے کا حکم ہے۔اس لیے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حرمتوں کا احترام کیا۔ حرمتوں کا خیال رکھنے والے کے لیے اس کے رب کے ہاں خیر ہے۔

اگر کسی قبر کی پوجا کی جائے تو وہ قبر بھی "وثن" یعنی بت بن جائے گی۔سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اے اللہ! میری قبر کو وثن (آستانہ) نہ بنانا (کہ لوگ اس کی پوجا کرنے لگیں)۔"[1]

حضرت عدی بن حاتمؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور میرے گلے میں سونے کی صلیب لٹکی ہوئی تھی۔آپ نے فرمایا: اے عدی! اس بت کو اپنے گلی سے اتار کر پھینک دو۔[2]

۱۔[مسند أحمد:۲/۲٤٦، ح:۷۳۷٦۔مسند حمیدی بتحریفات الأعظمی:۲/٤٤٥، ح:۱۰۲۵]

۲۔(سنن الترمذی رقم الحدیث:3095 المعجم الکبیر ج۱۷ رقم الحدیث:219,218)

حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ : سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں، مشرکین مکہ کہتے تھے: (لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ) "اے اللہ! ہم حاضر ہیں، تیرا کوئی شریک نہیں۔" تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے تھے: "ہلاکت ہو تمہارے لیے، یہیں تک رہنے دو، یہیں تک رہنے دو۔" مگر وہ اس کے بعد یہ کہتے: (اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ) "سوائے اس شریک کے جو تیرا ہے، اس کا مالک بھی تو ہے اور وہ (کسی چیز کا) مالک نہیں۔" غرض یہ کہ وہ یہ کہتے جاتے تھے اور بیت اللہ کا طواف کرتے جاتے تھے۔ [1]

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مشرکین کے تلبیہ کے بجائے مندرجہ ذیل تلبیہ کی تعلیم دی اور شرک کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا، سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس طرح تلبیہ کہتے: (لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ ، لَا شَرِيْكَ لَكَ) "میں حاضر ہوں، اے اللہ! میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں۔ ہر قسم کی تعریف، نعمت اور بادشاہت تیرے ہی لیے ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔" [2]

یہ شرک کے انجام کی مثال ہے۔ انسان جب شرک کرتا ہے تو فطرت کی بلندی سے گرتا ہے۔ بلندی سے گرتے ہی اسے شیاطین پرندوں کی طرح اچک لے جاتے ہیں اور اس کے پرخچے اڑا دیے ہیں۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ جب وہ بلندی سے گرا تو ہواؤں نے اسے دور لے جا کر کسی گڑھے میں پھینک دیا اور واقعہ یہ ہے کہ شرک کے نتیجہ میں انسان خواہشات کا شکار ہو جاتا ہے اور خواہشات اسے پستی کی

۱۔ [مسلم، کتاب الحج، باب التلبیۃ وصفتھا ووقتھا: ۱۱۸۵]

۲۔ [بخاری، کتاب الحج، باب التلبیۃ: ۱۵۴۹۔ مسلم، کتاب الحج، باب التلبیۃ وصفتھا ووقتھا: ۱۱۸۴]

طرف لے جا کر تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہے۔ چنانچہ ایک مشرک میں کبھی فکری بلندی پیدا نہیں ہو پاتی بلکہ وہ ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے پستی ہی کی طرف مائل رہتا ہے۔

امام ابن جریرؒ نے اپنی سند کے ساتھ محمد بن موسیٰ سے روایت کیا ہے کہ عرفات اور مزدلفہ میں وقوف کرنا شعائر اللہ میں سے ہے اور شیطانوں کو کنکریاں مارنا شعائر اللہ میں سے ہے، اور قربانی کے اونٹ (ھدی) شعائر اللہ میں سے ہیں اور جو شخص ان کی تعظیم کرے گا وہ اس کے دل میں تقویٰ کا اظہار ہے۔ [1] ابن زیدؒ نے کہا شیطانوں کو کنکریاں مارنا اور صفا مروہ اور المشعر الحرام اور المزدلفہ یہ سب شعائر اللہ ہیں۔ [2]

امام ابن جریرؒ نے کہا جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی عبادت اور ان کے مناسک حج کی علامات بنا دیا ہے اور وہ مقامات جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے فرائض ادا کرنے کا حکم دیا ہے وہ سب شعائر اللہ ہیں اور ان کی تعظیم کرنا دلوں کا تقویٰ ہے۔ [3]

علامہ سید محمود آلوسیؒ متوفی 1270ھ لکھتے ہیں:

شعائر سے مراد ہے ھدایا یعنی قربانی کے اونٹ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ اور تابعین کی ایک جماعت سے منقول ہے۔ یہ شعیرہ کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے علامت، اور الھدایا پر شعائر کا اطلاق اس لیے کیا ہے کہ وہ حج کی علامتیں ہیں یا اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی ہدیات کی علامتیں ہیں اور ان کی تعظیم کا یہ معنی ہے کہ قربانی کے لیے بہت خوبصورت، بہت فربہ اور بہت مہنگے اونٹ خریدے جائیں۔ روایت

۱۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 19017)

۲۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 19018)

۳۔ (جامع البیان جز 17 ص 206، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قربانی کے لیے سو اونٹ لے گئے ان میں ایک اونٹ ابوجہل کا تھا اس کی ناک میں سونے کا چھلا تھا اور حضرت عمر اور عمدہ اونٹ ھدی کے لیے اپنے ساتھ لے گئے، ان کو اس اونٹ کو خریدنے کے لیے تین سو دینار کی پیشکش کی گی۔ انہوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا کہ اس اونٹ کو بیچ دیں اور اس رقم سے اور کئی اونٹ خرید لیں۔ تو آپ نے منع فرمایا بلکہ یہ حکم دیا کہ اس کو قربانی کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤ، اور زید بن اسلم نے کہا الشعائر چھ ہیں، الصفا، المروۃ قربانی کے اونٹ، جمار (شیطانوں کو مارنے کی کنکریاں) المجسد الحرام، میدان عرفات اور حجر اسود، اور ان کی تعظیم کا معنی یہ ہے کہ ان کے متعلق تمام افعال اور مناسک حج کو تمام و کمال کے ساتھ کیا جائے اور حضرت ابن عمرؓ، حسن بصریؒ، امام مالکؒ اور ابن زیدؒ نے کہا ہے کہ منیٰ، عرفہ، المزدلفتہ، الصفا، المروۃ اور بیت اللہ وغیرہ تمام مواضع حج شعائر اللہ ہیں۔ [1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حاجیوں کے لیے ہدی کے جانوروں سے، انھیں قربانی کے دن حدود حرم میں ذبح کرنے سے پہلے تک، دیگر فوائد حاصل کرنا جائز ہے۔ سیدنا انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ایک اونٹ ہانکے جا رہا تھا، تو اس سے کہا: "اس پر سوار ہو جاؤ۔" اس نے کہا کہ یہ تو ہدی کا اونٹ ہے، تو آپ نے اس سے پھر کہا: "تمہارا بھلا ہو، اس پر سوار ہو جاؤ۔" [2]

سیدنا جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جب تمہیں ضرورت ہو تو

۱۔ (روح المعانی جز 17 ص 223 مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1417ھ)

۲۔ [بخاری، کتاب الحج، باب رکوب البدن: ۱۶۹۰۔ مسلم، کتاب الحج، باب جواز رکوب البدنۃ الھداۃ لمن احتاج إلیھا: ۱۳۲۳]

پھر دستور کے مطابق اس پر سوار ہو جاؤ۔"[1]

﴿ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا
رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ
أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿٣٤﴾ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ
قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ
وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣٥﴾ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ
اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ ۖ فَإِذَا
وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۗ
كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٣٦﴾ ﴾

اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کا ایک خاص طریقہ مقرر کیا ہے تا کہ وہ لوگ چوپایوں کی قسم کے ان مخصوص جانوروں کی قربانی کے موقع پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ تو اسی کے آگے سر جھکاؤ۔ اور

---

[1]۔[مسلم، کتاب الحج، باب جواز رکوب البدنۃ۔۔الخ: ۱۳۲٤]

اے پیغمبر! خوشخبری سنا دو ان عاجزی کرنے والوں کو۔(۳۴) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، اور وہ مصیبتوں پر صبر کرنے والے ہیں اور نمازیں قائم کرنے والے ہیں اور ہم نے جو کچھ انہیں دیا ہے اس میں سے نیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔(۳۵) اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے اللہ کی نشانیوں میں سے بنایا ہے ،تمہارے لیے ان میں دین و دنیا کی بھلائی ہے، پس جب وہ پاؤں بندے کھڑے ہوں تو انہیں اللہ کے نام سے ذبح کرو پس جب وہ اپنے پہلو کے بل گر جائیں تو ان کا گوشت کھاؤ، اور نہ مانگنے والے اور مانگنے والے دونوں قسم کے فقیروں کو کھلاؤ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے تا کہ تم شکر ادا کرو۔(۳۶)

قربانی کی تاریخ

جب سے حضرت آدم (علیہ السلام) دنیا میں تشریف لائے اسی وقت سے لے کر "اللہ" کی راہ میں اس کی رضا کے لیے قربانی کرنا مشروع ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں واقعہ بیان ہوا ہے:

(وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخِرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ لَئِنْ م بَسَطْتَّ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ أَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ إِلَيْكَ لِأَقْتُلَكَ إِنِّيْ اَخَاف اللهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ)[

المائدۃ:۲۷،۲۸]

"آپ ان کو آدم (علیہ السلام) کے دو بیٹوں کا واقعہ سنائیں۔ جب ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قربانی قبول نہیں کی گئی۔ جس کی قربانی قبول نہ ہوئی اس نے دوسرے بھائی کو کہا کہ میں تجھے قتل کردوں گا۔ پہلے نے جواب دیا اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا کیونکہ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔"

اللہ کے بندے صرف جانور ذبح کرتے وقت ہی اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتے بلکہ جب بھی ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا یعنی اس کی توحید اور فرمان کا تذکرہ ہو تو ان کے دل لرز جاتے ہیں۔

اللہ سے ڈرنے کے تقاضے ہیں کہ جب جانور ذبح کیا جائے تو اس پر دوسروں کا نام لینے کی بجائے صرف "اللہ" ہی کا نام یعنی بسم اللہ واللہ اکبر پڑھ کر ذبح کیا جائے۔ اس کا دوسرا تقاضا ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے "اللہ" ہی کا مال ہے اسی کے حکم اور اس کی خوشنودی کے لیے ذبح کر رہا ہوں اس میں کسی بت یا بزرگ کا کوئی حصہ نہیں۔ اللہ کے ذکر کا یہ بھی تقاضا ہے کہ صاحب ایمان کے سامنے جب اللہ کی ذات اور صفات کا بیان ہو تو اس کی جلالت و جبروت کے سامنے اس کا دل لرز جائے۔ دل لرزنے کا حقیقی معنی یہ ہے کہ بتوں اور مزارات کے سامنے نذ و نیاز پیش کرنے کی بجائے صرف اللہ کے حضور پیش کرے اور غیر اللہ کی اطاعت چھوڑ کر اللہ کی اطاعت میں آجائے۔ اگر اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے مشکلات پیش آئیں تو انھیں صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرے۔ صبر و تحمل کے لیے ضروری ہے کہ وہ پانچ وقت کی نماز ادا کرے اور جو کچھ اسے اس کے رب نے عطا کر رکھا ہے۔ اس میں سے دین کی بالادستی اور اللہ کے بندوں پر

خرچ کرتا رہے۔اس آیت مبارکہ میں اللہ سے ڈرنے کے چار اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جب آسمان پر اللہ تعالیٰ کوئی حکم صادر فرماتا ہے تو فرشتے اس کا ارشاد سن کر عاجزی کے ساتھ اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد انھیں اس طرح سنائی دیتا ہے جیسے ایک صاف پتھر پر زنجیر کھینچی جائے، جب ان کی گھبراہٹ جاتی رہتی ہے تو آپس میں پوچھتے ہیں، تمہارے رب نے کیا ارشاد فرمایا؟ وہ کہتے ہیں جو کچھ فرمایا بجا فرمایا اور وہ بلند و بالا ہے۔اب بات چرانے والے شیطان جو اوپر تلے موجود ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے سن کر اس بات کو اڑا لیتے ہیں اور اوپر والا شیطان نیچے والے کو اور وہ اپنے سے نیچے والے کو سناتا ہے۔اس طرح جادوگر یا کاہن تک وہ بات پہنچ جاتی ہے۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بات چرانے سے پہلے انگارا شیطان کو پالیتا ہے اور کبھی انگارے کے پہنچنے سے پہلے وہ اپنے نیچے والے شیطان کو وہ بات سنا چکا ہوتا ہے۔غرض یہ کہ جادوگر یا کاہن ایک بات میں سو جھوٹ ملا کر لوگوں سے بیان کرتا ہے اور لوگ (اسی ایک سچی بات کی وجہ سے) کہتے ہیں کہ دیکھو! اس کاہن نے ہم سے فلاں دن یہ کہا تھا، یہ کہا تھا۔الغرض، اس ایک بات کی وجہ سے جو آسمان سے اڑائی گئی تھی، لوگ اس کاہن کی تصدیق کرتے ہیں۔"[1]

سیدنا جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک عید الاضحیٰ کے موقع پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ عیدگاہ میں حاضر تھا۔جب آپ نے اپنا خطبہ مکمل کرلیا اور منبر سے اترے تو آپ کو ایک مینڈھا پیش کیا گیا۔آپ نے اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کیا اور یہ دعا پڑھی: (بِاسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ،

۱۔[بخاری، کتاب التفسیر، باب (حتی إذا فزع عن قلوبھم۔۔الخ): ۴۸۰۰]

اَللّٰھُمَّ ! ھٰذَا عَنِّیْ وَ عَمَّنْ لَّمْ یُضَحِّ مِنْ أُمَّتِیْ) "اللہ کے نام سے اور اللہ سب سے بڑا ہے، یہ میری طرف سے اور میری امت کے ان لوگوں کی طرف سے ہے جو قربانی نہیں کر سکے۔" (۱)

جندب بن سفیانؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جس نے (نماز) عید سے قبل (قربانی) ذبح کی وہ اس کی جگہ (اور) بکری ذبح کرے اور جس نے (نماز عید تک جانور) ذبح نہیں کیا، یہاں تک کہ ہم نے نماز پڑھ لی تو وہ بسم اللہ کہہ کر جانور ذبح کرے۔" (۲)

سیدنا انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دو مینڈھے ذبح کیے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (انھیں ذبح کرتے وقت) "بِسْمِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ" کہتے تھے۔ (۳)

سیدنا انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سات اونٹ کھڑے کر کے اپنے ہاتھ سے نحر کیے۔ (۴)

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ "صَوَاف" کی تفسیر "قِیَامًا" ہے (یعنی اونٹوں کو کھڑا کر کے نحر کرو)۔ (۵)

زیاد بن جبیرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا، وہ ایک شخص کے پاس آئے جس نے نحر کرنے کے لیے اپنا اونٹ بٹھایا تھا، انھوں نے اسے کہا، اس کو کھڑا کر اور پاؤں باندھ دے (اور نحر

{9105 [مسند أحمد: ۳/۳۵۶، ح: ۱۴۸۴۹۔ أبوداؤد، کتاب الضحایا، باب فی الشاۃ یضحی۔۔ الخ: ۲۸۱۰]

۲۔ [بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب قول النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): فلیذبح علی اسم اللہ: ۵۵۰۰۔ مسلم، کتاب الأضاحی، باب وقتہا: ۱۹۶۰]

۳۔ [بخاری، کتاب التوحید، باب السؤال بأسماء اللہ۔۔ الخ: ۷۳۹۹۔ مسلم، کتاب الأضاحی، باب استحباب استحسان الضحیۃ۔۔ الخ: ۱۹۶۶]

۴۔ [بخاری، کتاب الحج، باب نحر البدن قائمۃ: ۱۷۱۴]

۵۔ [بخاری، کتاب الحج، باب نحر البدن قائمۃ، تعلیقاً، قبل الحدیث: ۱۷۱۴]

کر) یہی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت ہے۔ [1]

سیدنا جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اونٹ اور گائے میں سات سات آدمی شریک ہوجائیں۔ [2]

فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا: یعنی جب یہ زمین پر گر پڑیں، کیونکہ اونٹ کے گوشت کو اس وقت تک کھانا جائز نہیں جب تک نحر کرنے کے بعد وہ مر نہ جائے اور اس کی حرکت ٹھنڈی نہ ہوجائے۔ جانور کو احسن طریقے سے ذبح کیا جائے، جیسا کہ سیدنا شداد بن اوسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض قرار دیا ہے، حتیٰ کہ جب تم قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو اور اپنی چھری کو تیز کرلیا کرو اور اپنے ذبیحے کو آرام پہنچایا کرو۔" [3]

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ: "الْقَانِعَ" سے مراد وہ شخص ہے جسے گھر بیٹھے ہوئے آپ جو دے دیں وہ اسی سے مستغنی ہوجائے اور "الْمُعْتَرَّ" سے مراد وہ ہے جو آپ کے سامنے آئے، آپ کی طرف جھانکے، تاکہ آپ اسے گوشت دے دیں مگر وہ سوال نہ کرے۔

سیدنا جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ (حج کے موقع پر) آپ نے اونٹنی کو آگے بڑھایا اور بیچ کی راہ لی جو جمرہ کبریٰ پر نکلتی ہے، یہاں تک کہ اس جمرہ کے پاس آئے جو درخت کے پاس ہے (اسی کو جمرہ عقبہ کہتے ہیں) اور سات کنکریاں اس کو ماریں اور ہر کنکری مارتے وقت "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" کہا۔ یہ کنکریاں ان

۱۔[بخاری، کتاب الحج، باب نحر الإبل مقیدۃ: ۱۷۱۳۔ مسلم، کتاب الحج، باب استحباب نحر الإبل قیاما معقولۃ: ۱۳۲۰]

۲۔[مسلم، کتاب الحج، باب جواز الاشتراک فی الهدی۔۔الخ: ۱۳۱۸/۳۵۱]

۳۔[مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب الأمر بإحسان الذبح۔۔الخ: ۱۹۵۵]

کنکریوں کے مثل تھیں جو چٹکی سے ماری جاتی ہیں۔آپ نے یہ کنکریاں وادی کے بیچ میں کھڑے ہو کر ماریں اور پھر نحر کی جگہ آئے اور تریسٹھ اونٹ اپنے دست مبارک سے نحر کیے۔باقی سیدنا علیؓ کو دیے، جو انھوں نے نحر کیے۔آپ نے ان کو اپنی قربانی میں شریک کرلیا تھا۔پھر حکم فرمایا: "ہر اونٹ میں سے گوشت کی ایک ایک بوٹی لے لیں۔" پھر وہ سارا گوشت ایک ہانڈی میں ڈالا گیا اور پکایا گیا، پھر آپ نے اور سیدنا علیؓ نے اس میں سے گوشت کھایا اور اس کا شوربا پیا، پھر سوار ہوئے اور بیت اللہ کو روانہ ہو گئے۔ (۱)

سیدنا علیؓ بیان کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حکم دیا کہ میں قربانی کے اونٹوں کی نگرانی کروں اور (قربانی کے بعد) ان کی سب چیزیں بانٹ دوں، ان کا گوشت، ان کی کھال اور ان کی جھول اور قصائی کی اجرت میں اس میں سے کوئی چیز نہ دوں۔ (۲)

سیدہ عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ ذی قعدہ کے مہینے کے پانچ دن باقی تھے اور ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ (مدینہ سے) نکلے، ہمارا ارادہ حج کرنے کا تھا۔جب ہم مکہ کے قریب پہنچے تو جن لوگوں کے ساتھ قربانی نہیں تھی، انھیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ حکم دیا کہ جب وہ طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرلیں تو احرام کھول لیں۔بعد ازاں قربانی کے دن گائے کا گوشت ہمارے پاس لایا گیا۔میں نے پوچھا، یہ گوشت کیسا ہے؟ (لانے والے نے) کہا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی بیویوں کی طرف سے گائے کی قربانی کی ہے۔ (۳)

۱۔[مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): ۱۲۱۸]

۲۔[بخاری، کتاب الحج، باب یتصدق بجلود الھدی: ۱۷۱۷۔مسلم، کتاب الحج، باب الصدقۃ بلحوم الھدایا۔۔الخ: ۱۳۱۷]

۳۔[بخاری، کتاب الحج، باب ذبح الرجل البقر عن نساۂ من غیر أمرہن: ۱۷۰۹]

كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: یعنی جانوروں کو اسی لیے ہم نے تمہارے زیر فرمان کر دیا ہے، تا کہ اگر تم چاہو تو ان پر سواری کرلو، چاہو تو ان کا دودھ دھولو اور اگر چاہو تو انھیں ذبح کرلو، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۷۱ ○ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ۷۲ ○ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ)[یٰسٓ:۷۱ تا ۷۳] "اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان چیزوں میں سے جنھیں ہمارے ہاتھوں نے بنایا، ان کے لیے مویشی پیدا کیے، پھر وہ ان کے مالک ہیں۔ اور ہم نے انھیں ان کے تابع کر دیا تو ان میں سے کچھ ان کی سواری ہیں اور ان میں سے بعض کو وہ کھاتے ہیں۔ اور ان کے لیے ان میں کئی فائدے اور پینے کی چیزیں ہیں۔ تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔"

﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۷ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۝۳۸﴾

اللہ تعالیٰ تک نہ تو ان کے گوشت پہنچتے ہیں اور نہ ان کے خون، لیکن اسے تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے اسی طرح اللہ نے انہیں تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے تا کہ تم اللہ کی تکبیر کیا کرو اس ہدایت پر جو اس نے تمہیں بخشی ہے اور (اے نبی (صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم)! نیک لوگوں کو خوشخبری دے دیجیے۔(۳۷) یقیناً اللہ ایمان والوں کا دفاع کرتا ہے بیشک اللہ کسی خیانت کرنے والے اور ناشکرے کو پسند نہیں کرتا۔(۳۸)

شانِ نزول: (آیت) "لن ینال اللہ لحومہا"۔(الخ)

ابن ابی حاتمؒ نے ابن جریجؒ سے روایت نقل کی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ بیت اللہ کو اونٹوں کے گوشت اور اس کے خون سے ملوث کر دیا کرتے تھے تو صحابہ کرامؓ یہ دیکھ کر کہنے لگے تو ہم اس چیز کے زیادہ مستحق ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون۔

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔"[1]

كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ: عبداللہ بن سنجرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کے ساتھ منیٰ سے عرفات کی طرف گیا، وہ تلبیہ کہہ رہے تھے، لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ یوم تلبیہ نہیں، بلکہ یوم تکبیر ہے، تو انھوں نے فرمایا، اس ذات کی قسم، جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ نکلا، آپ نے لبیک کہنا نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ آپ نے جمرہ عقبہ پر کنکریاں ماریں، الا یہ کہ درمیان میں کبھی آپ

۱۔[مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظلم المسلم وخذلہ۔۔الخ:۳٤/۲٥٦٤]

اللہ اکبر یا لا الہ الا اللہ بھی پڑھتے رہے۔ [1]

محمد بن ابوبکر ثقفیؒ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے انس بن مالکؓ سے پوچھا، (اس وقت) جب وہ دونوں صبح کو منیٰ سے عرفات کی طرف جا رہے تھے کہ تم آج کے دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی معیت میں کیا کیا کرتے تھے؟ انھوں نے کہا، کوئی ہم میں سے لبیک کہتا تھا اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا اور کوئی تکبیر کہتا تھا، اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا۔ [2]

سیدنا جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ سعی کے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صفا پر چڑھے اور جب بیت اللہ پر نظر پڑی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قبلہ کی طرف منہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی کبریائی بیان کی اور یہ کلمات کہے: (لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهُ، اَنْجَزَ وَعْدَهُ وَ نَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهُ) اس کے بعد دعا کی (پھر ایسا ہی کیا، پھر دعا کی، غرض) تین بار ایسا ہی کیا، پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نیچے اترے اور مروہ کی طرف چلے، یہاں تک کہ جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میدان کے درمیان پہنچے تو دوڑے، یہاں تک کہ مروہ پر پہنچے اور مروہ پر بھی ویسا ہی کیا (جیسا کہ صفا پر کیا تھا)۔ [3]

سیدنا انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دو مینڈھوں کی قربانی کی، جو چتکبرے اور سینگوں والے تھے اور کہتے ہیں کہ میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے انھیں اپنے دست

۱۔ [مسند أحمد: ۱/ ۴۱۷، ح: ۳۹۶۰]

۲۔ [بخاری، کتاب الحج، باب التلبیۃ والتکبیر إذا غدا من منی إلی عرفۃ: ۱۶۵۹]

۳۔ [مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): ۱۲۱۸]

مبارک سے ذبح کیا اور یہ بھی دیکھا کہ (ذبح کے وقت) آپ اپنا پاؤں ان کی گردن پر رکھے ہوئے تھے اور آپ نے "بِسْمِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ" پڑھا۔"[1]

وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ: سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوگوں کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ کے پاس ایک شخص آیا۔۔اس نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کئی سوال کیے، ایک سوال اس نے یہ پوچھا: "احسان کیا چیز ہے؟" تو آپ نے فرمایا: "احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح (خشوع وخضوع اور خلوص سے) کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر (یہ حالت) نصیب نہ ہو کہ تم اس کو دیکھتے ہو تو یہ خیال رہے کہ وہ تو ضرور تمہیں دیکھتا ہے۔"[2]

ہجرت کے چھٹے سال نبی کریم اور چودہ سو کے قریب صحابہ کرام عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ مکرمہ جا رہے تھے تو کفار مکہ نے مسلمانوں کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا اور انہیں مسجد حرام میں داخل ہونے سے منع کر دیا جس کا ذکر آیت نمبر ۲۵ میں گزر چکا ہے۔ مسلمانوں کو بظاہر اس سے بڑی تکلیف ہوئی، اس آیت میں اہل ایمان کو خوشخبری سنائی گئی کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی مدافعت فرمائے گا اور مکہ کے خائن اور ناشکرے کفار کا مکہ پر غلبہ ختم کر دے گا۔ چنانچہ دو ہی سال بعد ہجرت کے آٹھویں سال کفار مکہ کو ایسی شکست ہوئی کہ سارے مکہ پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو گیا۔

﴿ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ﴿۳۹﴾ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ

---

[1]۔[مسلم، کتاب الأضاحی، باب استحباب استحسان الضحیۃ وذبحہا مباشرۃ بلاتوکیل والتسمیۃ والتکبیر: ۱۹۶۶/۱۸]

[2]۔[بخاری، کتاب الإیمان، باب سؤال جبرائیل النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عن الإیمان والإسلام والإحسان۔۔الخ: ۵۰]

يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾

ان لوگوں کو (جہاد کی) اجازت دے دی گئی جن کے خلاف جنگ کی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے، اور بیشک اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔ (۳۹) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب "اللہ" ہے اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دور نہ کرے تو خانقاہیں، گرجے، معبد خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر دی جائیں اور بیشک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ بیشک اللہ بہت قوت والا اور غالب ہے۔ (۴۰)

شان نزول: (آیت) "اذن للذین یقتلون"۔ (الخ)

امام احمدؒ نے اور ترمذیؒ نے تحسینؒ اور امام حاکمؒ نے تصحیح کے ساتھ ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ

رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے چلے تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ان لوگوں نے اپنے نبی کو نکال دیا تا کہ وہ ہلاک ہوں اس پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی یعنی اب لڑنے کی ان لوگوں کو اجازت دی گئی۔

بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا : یعنی مسلمانوں کو قتال کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے، یہ ظلم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بھی کیا گیا اور مسلمانوں پر بھی۔ عروہ بن زبیر فرماتے ہیں: میں نے عبداللہ بن عمروؓ سے پوچھا: "مشرکین نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سب سے زیادہ سخت تکلیف کیا پہنچائی تھی؟" انھوں نے فرمایا: "میں نے (بدبخت) عقبہ بن ابی معیط کو دیکھا، وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف بڑھا جبکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے، اس نے اپنی چادر آپ کی گردن میں ڈالی اور آپ کا گلا بہت سختی سے گھونٹ دیا تو ابوبکرؓ آئے اور اسے دھکیل کر پیچھے ہٹایا اور کہا: (اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ) [المؤمن: ۲۸] " کیا تم ایک آدمی کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے، میرا رب اللہ ہے، حالانکہ یقیناً وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیلیں لے کر آیا ہے۔"[1]

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا وہ سات آدمی تھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ابوبکر، عمار، ان کی والدہ سمیہ، صہیب، بلال اور مقدادؓ، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے چچا ابوطالب کے ذریعے سے محفوظ رکھا، ابوبکرؓ کو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کے ذریعے سے محفوظ رکھا۔ باقی سب کو مشرکین نے پکڑ لیا اور انھیں لوہے کی

۱۔ [بخاري، فضائل أصحاب النبي (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، باب: ۳۶۷۸]

قمیصیں پہنا کر دھوپ میں جھلسنے کے لیے پھینک دیا۔ چنانچہ ان میں سے جو بھی تھا اس نے اس کے مطابق کہہ دیا جو وہ چاہتے تھے سوائے بلالؓ کے۔ [1]

اللہ تعالیٰ کے معاملے میں اس کے نزدیک اس کی جان بے قدر و قیمت ٹھہری (اس نے اپنی جان کی کوئی پروانہ کی) اور وہ ان لوگوں کی نظر میں ایسا بے قدر و قیمت ٹھہرا کہ انھوں نے اسے پکڑا اور لڑکوں کو دے دیا۔ وہ اسے مکہ کی گھاٹیوں میں پھراتے تھے اور وہ کہتا تھا: اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے۔" ابوبکرؓ کو مشرکین کی بے تحاشا مار کا تذکرہ بھی کتب سیرت میں موجود ہے۔ جابرؓ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عمار اور اس کے خاندان کے پاس سے گزرے، جب انھیں عذاب دیا جا رہا تھا تو فرمایا: "اے آل عمار اور آل یاسر! خوش ہو جاؤ، تمہارے وعدے کی جگہ جنت ہے۔" [2]

حضرت خبابؓ نے بیان کیا کہ میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا، آپ کعبہ کے سائے میں چادر کی ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور ہمیں مشرکین کی طرف سے بہت سخت تکلیف پہنچی تھی۔ میں نے کہا: "کیا آپ اللہ سے دعا نہیں کرتے؟" آپ (سیدھے ہو کر) بیٹھ گئے اور آپ کا چہرہ (غصے سے) سرخ تھا، فرمایا: "تم سے پہلے لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا کہ لوہے کی کنگھیوں کے ساتھ ان کی ہڈیوں سے گوشت اور پٹھے چھیل دیے جاتے تھے، یہ چیز انھیں ان کے دین سے نہیں پھیرتی تھی اور انھیں سر کی چوٹی پر آرا رکھ کر دو حصوں میں چیر دیا جاتا، یہ چیز انھیں ان کے دین سے پھیرتی نہ تھی اور (اللہ کی قسم!) یہ کام ضرور پورا ہو کر رہے گا یہاں تک کہ سوار صنعاء سے حضر موت تک چلے گا اور اسے کسی کا خوف نہیں

۱۔ [ابن ماجہ، السنۃ، باب فضل سلمان وأبي ذر والمقداد: ۱۵۰ وصححہ الحاکم والذھبي وابن حبان وغیرھم والالبانی]

۲۔ [مستدرک حاکم: ۳/ ۳۸۳، ح: ۵۶۶۶ وصححہ الحاکم ووافقہ الذھبی]

ہوگا سوائے اللہ کے، یا سوائے بھیڑیے کے اس کی بھیڑ بکریوں پر اور لیکن تم جلدی کرتے ہو۔"[1]

کفار نے مسلمانوں پر اس قدر ظلم کیا اور اتنی ایذائیں دیں کہ ان میں سے کچھ حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور کچھ مکہ ہی میں ظلم کی چکی میں پستے رہے، حتیٰ کہ انھوں نے مدینہ کی طرف ہجرت اختیار کی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ ابوبکرؓ بھی ایک دفعہ ہجرت کرنے کے لیے نکلے مگر ابن الدغنہ برک الغماد سے انھیں واپس لے آئے، پھر بعد میں وہ بھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے دو ظلم بیان فرمائے ہیں، ایک یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا، جب کہ یہ تمام دنیا کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ جو شخص جہاں رہتا ہے وہاں رہنے میں اور اس کی تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھانے میں وہاں کے تمام لوگوں کے ساتھ برابر حق رکھتا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ اسے اس کے گھر سے نکال باہر کرے۔ دوسرا ظلم یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کو صرف اس جرم کی وجہ سے ان کے گھروں سے نکالا کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب صرف اللہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جرم ہے ہی نہیں بلکہ عین عدل ہے اور یہ گھروں سے نکالنے کا باعث نہیں بلکہ امن وسکون سے اپنے گھروں میں سکونت کا ضامن ہے۔

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ اسلام سے پہلے صوامع نصاریٰ کے راہبوں کے ساتھ مخصوص تھے اور صائبین (آتش پرست) گرجوں کے ساتھ مختص تھے پھر بعد میں مسلمانوں کی اذان کی جگہ کو صومعہ کہا جانے لگا۔[2]

۱۔ [بخاري، مناقب الأنصار، باب مالقي النبي (صلى الله عليه وآله وسلم) وأصحابه من المشركين بمكة: ۳۸۵۲]

۲۔ (الجامع لاحکام القرآن جز 12 ص 67)

بیع: یہ بیع کی جمع ہے عبادت خانہ، اس کا معنی ہے یہود و نصاریٰ کا عبادت خانہ اور گرجا۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ یہ عیسائیوں کا معبد ہے اور امام طبری نے لکھا ہے یہ یہودیوں کی عبادت گاہ ہے۔ [1]

صلوات: یہ صلوۃ کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے رحمتیں، دعائیں، نمازیں عبادت خانے۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا الصلوت سے مراد ہے یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہیں۔ ابو العالیہ نے کہا اس سے مراد ہے صائبین کی مساجد۔ ابن زیاد نے کہا اس سے مراد ہے جب دشمنان اسلام کے حملوں کی وجہ سے مسلمانوں کی مساجد ویران ہو جائیں اور ان میں نمازیں معطل ہو جائیں۔ [2]

حسن بصریؒ نے کہا یہ تمام مساجد کے اسماء ہیں۔ رہا الصوامع تو وہ اس لیے ہے کہ کبھی مسلمان اس طرز کی مساجد بناتے ہیں اور رہا البیع تو یہ اس لیے کہ مسلمانوں کی مساجد پر اس کا تشبیاً اطلاق ہے اور رہا الصلوات تو اس کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مفسدوں کو دور نہ کرتا تو نمازیں معطل ہو جاتیں اور مساجد منہدم اور ویران ہو جاتیں۔ [3]

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ

۱۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۲ ص 67)

۲۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۲ ص 67)

۳۔ (تفسیر کبیر ج ۸ ص 230 مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿۳۸﴾ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿۳۹﴾ وَّاَصْحٰبُ
مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ
فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾

یہ وہ لوگ ہیں اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے اور تمام کاموں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔(۴۱) اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے نوح (علیہ السلام) کی قوم بھی عاد اور ثمود کی قوم بھی (اپنے پیغمبروں کو) جھٹلا چکے ہیں۔(۴۲) اور قوم ابراہیم اور قوم لوط بھی جھٹلا چکی ہے۔ (۴۳) اور مدین والوں نے بھی جھٹلایا تھا۔ اور موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی جھٹلایا گیا۔ ان سب کافروں کو میں نے پہلے مہلت دی پھر انھیں پکڑ لیا سو دیکھ لو کہ میرا عذاب کیسا سخت تھا۔(۴۴)

علامہ ابوعبداللہ مالکی قرطبیؒ نے اس آیت کے مصداق میں حسب ذیل اقوال نقل کئے ہیں:

(۱) یہ چار خلفاء راشدین ہیں، زمین میں ان کے علاوہ اور کسی کو ایسا اقتدار نہیں ملا۔

(۲) حضرت ابن عباسؓ نے کہا اس سے مراد مہاجرین اور انصار ہیں اور جو ان کی نیکی کے ساتھ اتباع

کریں۔

(۳) قتادہؒ نے کہا یہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب ہیں۔

(۴) الحسن اور ابو العالیہؒ نے کہا یہ امت اس آیت کا مصداق ہے جب اللہ تعالیٰ اس کو فتح عطا فرماتا ہے تو یہ نمازوں کو قائم کرتی ہے یعنی حکمران۔

(۵) ضحاکؒ نے کہا اللہ تعالیٰ نے ملک اور اقتدار عطا فرمانے کی شرط عائد کی ہے کہ وہ ان چار امور پر عمل کرائیں۔

(۶) سہل بن عبداللہؒ نے کہا سلطان پر اور جو علماء اس کے پاس آتے ہیں ان پر واجب ہے کہ وہ نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں، عام لوگوں پر یہ واجب نہیں ہے کہ وہ سلطان اور علماء کو حکم دیں۔ [1]

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وفات پا گئے اور آپ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا اور عرب کے کچھ لوگوں نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے ابو بکر صدیقؓ سے عرض کیا کہ آپ کیسے ان لوگوں سے جنگ کریں گے جبکہ نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے میں لوگوں سے اسوقت تک جنگ کروں جب تک وہ یہ گواہی نہ دے دیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں جس نے اس کا اقرار کر لیا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں تو اس نے مجھ سے اپنی جان اور مال کو بچا لیا البتہ اسلام کے حق کی وجہ سے اس کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا اللہ کی قسم! میں ان لوگوں سے ضرور لڑائی کروں گا جو نماز اور زکوۃ میں فرق کرتے ہیں۔ کیونکہ زکوۃ مال پر فرض ہے اللہ کی قسم اگر لوگ مجھ سے بھیڑ

۱۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۲ ص 68-69 مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

کے بچے کو روک لیں گے جس کو وہ رسول اللہ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے تو میں اس کے روکنے پر ان سے قتال کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے اعتراف کیا کہ اللہ کی قسم! مجھے اطمینان ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر صدیقؓ کے سینے کو جہاد کے لیے کھول دیا ہے۔ میں نے سمجھا کہ لڑنا حق ہے۔"[1]

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ ۔۔" یہ جملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دینے اور ان کا غم دور کرنے کے لیے فرمایا ہے، یعنی اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو میں انھیں پکڑ لوں گا، خواہ وہ کتنی قوت رکھتے ہوں، میں نے ان سے پہلے عمر، قد و قامت، قوت و شوکت، مال و متاع، خبث و نجاست اور حکومت و اقتدار میں ان سے کہیں بڑھی ہوئی قوموں کو، جب وہ باز نہ آئے تو پکڑ لیا اور وہ میری گرفت سے بچ نہ سکے، تو مکہ کے ان کافروں کی کیا بساط ہے؟ اس لیے آپ غم زدہ نہ ہوں۔ آپ سے پہلے نوح (علیہ السلام) کی قوم نے جھٹلایا، جن کی عمریں سب لوگوں سے زیادہ اور جن کا اقتدار نہایت مضبوط تھا اور عاد نے جو بہت لمبے اور نہایت مضبوط قد رکھتے تھے، جن کے بعد ان جیسی قوم پیدا نہیں ہوئی اور ثمود، جنھوں نے میدانوں میں اور پہاڑوں میں چٹانیں تراش کر نہایت مضبوط اور بلند و بالا عمارتیں بنا رکھی تھیں اور ابراہیم (علیہ السلام) کی قوم کو جو جبر و تکبر میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے اور لوط (علیہ السلام) کی خبیث اور نجس قوم کو اور مدین والوں کو جنھوں نے حرام طریقے سے کمائے ہوئے مال کے خزانے جمع کر رکھے تھے۔

وَ كُذِّبَ مُوْسٰى: موسیٰ (علیہ السلام) کو چونکہ سب لوگوں کو نظر آنے والے اتنے معجزے عطا کیے گئے جو اس سے پہلے کسی کو عطا نہیں ہوئے تھے، اس لیے ان کی تکذیب انتہائی بعید بات تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ

---

[1] ۔[رواہ البخاری: باب الأمر بقتال الناس حتی یقولوا لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ]

نے کلام کا اسلوب بدل دیا اور اس لیے بھی بدل دیا کہ پہلے ذکر کردہ تمام انبیاء کی اقوام نے انھیں جھٹلایا تھا جب کہ موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم بنی اسرائیل نے انھیں چند ایک کے سوا نہیں جھٹلایا، صرف فرعون کی قوم قبطیوں نے انھیں جھٹلایا تھا۔ رہی بنی اسرائیل کی نافرمانیاں تو وہ موسیٰ (علیہ السلام) کو جھوٹا سمجھنے کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس قوم کی بدعملی اور طبیعت کی خست کی وجہ سے تھیں۔

سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ ہر ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے، پھر جب پکڑتا ہے تو اسے نہیں چھوڑتا۔" بعد ازاں آپ نے یہ آیت پڑھی: (وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ) [ھود:۱۰۲] "اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے، جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، اس حال میں کہ وہ ظلم کرنے والی ہوتی ہیں، بیشک اس کی پکڑ بڑی دردناک، بہت سخت ہے۔"[1]

﴿ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَاۤ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي

۱۔ [بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ: (وکذلک أخذ ربک إذا أخذ القری وہی ظالمۃ ۔۔الخ): ۴۶۸۶۔ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظلم: ۲۵۸۳]

الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾

اور کتنی ہی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا وہ ظالم تھیں پس وہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی ہیں اور کتنے ہی بیکار کنویں (بند پڑے ہیں) اور کتنے ہی مضبوط محلات (ویران) ہیں۔(۴۵) کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل ایسے ہوتے کہ ان سے سمجھ سکتے اور کان ایسے ہوتے کہ ان سے سن سکتے حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔(۴۶)

بڑی بڑی اقوام کی تباہی کا تذکرہ کرنے کے بعد اہل دنیا کو دعوت فکر دی ہے کہ کیا انھوں نے دنیا کا جغرافیہ نہیں دیکھا اور تاریخ عالم کو نہیں پڑھا کہ تباہ و برباد ہونے والے لوگ زمین پر اس طرح دندناتے پھرتے تھے کہ ان کے دبدبہ کی وجہ سے مخلوق کانپتی تھی۔ان کی زبان جنبش کرتی تو لشکر و سپاہ حرکت میں آجاتے۔یہ لوگ اپنے محلات سے باہر نکلتے تو ہٹو بچو کی صدائیں بلند ہوتی تھیں جس راستہ سے گزرتے لوگ ان کا جاہ و جلال دیکھ کر ساکت و جامد رہ جاتے تھے۔ان کو دیکھ کر کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ یہ کبھی زوال پذیر اور تباہ ہونگے۔لیکن جب رب ذوالجلال کے عذاب کا کوڑا حرکت میں آیا تو اس طرح نیست و نابود کر دیے گئے کہ آج ان کے محلات میں الوؤں کے ڈیرے اور ان کی بستیاں ویرانیوں کا خوفناک منظر پیش کر رہی ہیں۔ان میں عبرت کا سامان ہے مگر ان لوگوں کے لیے جن کے سینے میں

سوچنے والے دل، جن کے کان حقیقت سننے والے اور عبرت کی نگاہ سے دیکھنے والی آنکھیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتی۔ لوگوں کے دل اندھے ہوجاتے ہیں۔ جب دل اندھے ہوجائیں تو دیکھنے والی آنکھیں، سننے والے کان اور دھڑکنے والے دل کچھ کام نہیں آتے۔ جب کسی قوم کی اجتماعی صورت ایسی ہوجائے تو ان کو نہ اقتدار بچا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی سہارا کام دیتا ہے، مذکورہ بالا اقوام کا یہی حال تھا جس وجہ سے انھیں نشان عبرت بنا دیا گیا۔

﴿ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾ ﴾

اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں اور اللہ ہرگز اپنے وعدہ کے خلاف نہ فرمائے گا، اور بلاشبہ آپ کے رب کے نزدیک ایک ایسا دن ہے جو تم لوگوں کے شمار کے مطابق ایک ہزار سال کے برابر ہوگا۔ (۴۷) اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو میں نے مہلت دی اور وہ ظلم کرنے والی تھیں، پھر میں نے انہیں پکڑ لیا، اور (سب کو) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ (۴۸)

یعنی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہو کہ وقت کے جو پیمانے تم نے قائم کئے ہیں اور جس کی بنا پر تم عجلت اور تاخیر کا حکم لگاتے ہو وہی پیمانے اللہ کے ہاں بھی ہیں۔ نہیں بلکہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اس کے

نزدیک وقت کا پیمانہ تمہارے پیمانوں سے بالکل مختلف ہے۔اس کے نزدیک ایک دن تمہارے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔گویا کسی قوم کے لیے چند سالوں کی مہلت کائناتی گھڑی کے حساب سے محض چند منٹوں کی مہلت ہے۔

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ ۔۔: یعنی رب تعالیٰ تمہاری طرح تنگ ظرف اور جلد باز نہیں بلکہ بیحد حلیم اور وسعت والا ہے۔اس کی دی ہوئی تھوڑی سی مہلت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے،تمہارا ایک ہزار سال اس کے نزدیک صرف ایک دن ہے،وہ اتنا حلیم ہے کہ آدھے دن کی مہلت دے تو وہ بھی پانچ سو برس ہوگی اور ایک گھنٹہ کی مہلت دے تو چالیس برس سے زیادہ ہوگی۔اس کے حلم کی وجہ یہ ہے کہ وہ انتقام پر قادر ہے،کوئی چیز اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتی،خواہ وہ کتنی مہلت دے یا رسی دراز کرے۔

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:"نادار وفقیر مومن دولت مندوں سے نصف دن،یعنی پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔"[1]

سیدنا ابو ثعلبہ خشنیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:"اللہ تعالیٰ اس امت کو آدھے دن کی مہلت سے عاجز نہیں رکھے گا۔"[2]

سیدنا عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:"جب تم قیامت کے دن جمع کیے جاؤ گے تو کہا جائے گا کہ اس امت کے فقرا اور مساکین کہاں ہیں؟ سو وہ کھڑے ہوں گے تو ان سے کہا جائے گا،تم کیا علم رکھتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب! تو نے ہمیں آزمائش میں ڈالا تو ہم نے صبر کیا اور تو نے ہمارے علاوہ دوسرے لوگوں کو اموال اور حکومتیں دیں۔اللہ تعالیٰ

۱۔[ابن ماجہ،کتاب الزھد،باب منزلۃ الفقراء:۴۱۲۲۔ترمذی،کتاب الزھد،باب ماجاء أن فقراء المھاجرین یدخلون الجنۃ قبل أغنیاءھم:۲۳۵۱]

۲۔[أبوداؤد،کتاب الملاحم،باب قیام الساعۃ:۴۳۴۹]

فرمائے گا، تم نے سچ کہا۔ یہ (یعنی فقرا و مساکین دیگر) لوگوں سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے اور حساب کتاب کی شدت مال والوں اور حکمران پر باقی رہے گی۔"[1]

الحج:48 میں فرمایا: اور میں نے ایسی بہت سی بستیوں کو مہلت دی تھی جو ظالم تھیں پھر میں نے ان کو پکڑ لیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کتنی ہی ایسی بستیاں تھیں جو کفر اور ظلم کرتی تھیں اور اس کے باوجود میں نے ان کو مہلت دی اور ان سے عذاب کو موخر رکھا اور اس مہلت سے انہوں نے دھوکا کھایا اور اپنے کفر اور ظلم پر ڈٹے رہے پھر میں نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور ان پر اپنا عذاب نازل کر دیا۔ پس ان کا عذاب روکا ہوا ہے اور بالآخر انہوں نے میری ہی طرف لوٹنا ہے۔

سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ ظالموں کو مہلت دیتا رہتا ہے، مگر جب ان کی گرفت فرماتا ہے تو پھر نہیں چھوڑتا۔" اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: (وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ) "اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے، جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، اس حال میں کہ وہ ظلم کرنے والی ہوتی ہیں، بیشک اس کی پکڑ بڑی دردناک، بہت سخت ہے۔"[2]

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اگر ان عذاب زدہ لوگوں (کی بستیوں) پر تمہارا گزر ہو تو روتے ہوئے گزرو، اگر تم رو نہ سکو تو ان بستیوں میں مت جاؤ، ایسا نہ ہو کہ ان جیسا عذاب تم پر بھی نازل ہو جائے۔"[3]

۱۔ [ابن حبان: ۷۴۱۹۔ حلیۃ الأولیاء: ۷/۲۴۲، ح: ۱۰۳۵۴]

۲۔ [بخاری، کتاب التفسیر، باب (وکذلک أخذ ربک إذا أخذ القری۔۔الخ): ۴۶۸۶۔ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظلم: ۲۵۸۳]

۳۔ [بخاری، کتاب الصلوۃ، باب الصلوۃ فی مواضع الخسف۔۔الخ: ۴۳۳]

﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾ فَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾
وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۵۱﴾

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ اے لوگو! میں تو تم کو کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔(۴۹) سو جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے لیے بخشش اور عزت کی روزی ہے۔(۵۰) اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلانے کی کوشش کی وہی دوزخ والے ہیں۔(۵۱)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کے بارے میں دی گئی ڈھیل پر اہل مکہ اس قدر دلیر ہوئے کہ وہ سرور کونین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو الزام دیتے کہ تم جھوٹے ہو اس لیے ہم پر عذاب نازل نہیں ہوا؟ اس پر ایک طرف سرور گرامی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آپ کے منصب کے حوالے سے سمجھایا گیا کہ عذاب نازل کرنا آپ کے اختیار میں نہیں آپ کا کام فقط یہ ہے کہ آپ لوگوں کو ان کے برے کردار کے نتیجہ میں بھیانک مستقبل کے بارے میں کھلے الفاظ میں ڈرائیں۔ یہ کام آپ پوری تندہی سے کر رہے ہیں جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں نا وہ ہماری آیات کو دلائل کی بنیاد پر غلط

ثابت کر سکتے ہیں اور نہ ہی عذاب نازل کرنے یا اسے ٹالنے میں ہمیں بے بس کر سکتے ہیں۔ ان کے لیے جہنم تیار کی گئی ہے جس میں انھیں داخل کیا جائے گا۔ ان کے مقابلے میں جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے صالح اعمال اختیار کیے ان سے جو کوتاہیاں سرزد ہونگی۔ اللہ تعالیٰ انھیں معاف کرتے ہوئے باعزت اور بہترین رزق عطا فرمائے گا۔ یہاں رزق کریم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جس سے مراد دنیا میں حلال وطیب روزی اور آخرت میں جنت کی نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے تیار کر رکھی ہے۔

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یہ آیت نازل ہوئی: (وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ) [الشعراء: ٢١٤] "اور اپنے سب سے قریب رشتہ داروں کو ڈرا۔" تو آپ کھڑے ہو کر اعلان کرنے لگے: "اے قریش کے لوگو! (اللہ کی اطاعت کے ذریعے سے) اپنی جانوں کو (اس کے عذاب سے) بچاؤ، (اگر تم کفر وشرک سے باز نہ آئے تو) اللہ کے ہاں میں تمہارے کسی کام نہیں آؤں گا۔"[1]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہمراہ یہود کے بیت المدراس میں گئے، آپ نے انھیں آواز دی اور فرمایا: "اے یہودیو! اسلام لاؤ تو تم سلامت رہو گے۔" اس پر یہودیوں نے کہا، اے ابوالقاسم! آپ نے (اللہ تعالیٰ کا) پیغام پہنچا دیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دوبارہ فرمایا: "یہی میرا مقصد ہے، اسلام لاؤ تو تم سلامت رہو گے۔" انھوں نے پھر کہا، اے ابوالقاسم! آپ نے (اللہ تعالیٰ کا) پیغام پہنچا دیا۔[2]

---

[1] ۔[بخاری، کتاب التفسیر، باب (وأنذر عشیرتک الأقربین۔۔الخ): ٤٧٧١]

[2] ۔[بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب (وکان الإنسان أکثر شئ جدلا)۔۔الخ: ٧٣٤٨]

اور جو لوگ ہماری آیتوں کے ہرانے اور نیچا دکھانے کی سعی اور کوشش کرتے رہتے ہیں تو ایسے ہی لوگ اہل جہنم ہیں۔ ڈرانے والے کا کام یہی ہے کہ وہ ایمان کی دعوت دے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے خطرات سے آگاہ کردے جو شخص اس کی دعوت کو قبول کرتا ہے وہ دوسرے عالم میں آرا کی بلکہ من مانی زندگی گزارتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور اس کے احکام کو ہرانے کی کوشش کرتا ہے وہ جہنم اور دائمی عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾ ﴾

اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر (اس کا یہ حال تھا کہ) جب وہ کوئی آرزو کرتا تھا تو شیطان اس کی آرزو میں (وسوسہ) ڈالتا تھا جو وسوسہ شیطان ڈالتا خدا اس کو دور کر دیتا ہے۔ پھر خدا اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیتا ہے اور خدا علم والا اور حکمت والا ہے۔

شان نزول: (آیت) "۔ وما ارسلنا من قبلک"۔ (الخ)

ابن ابی حاتمؒ اور ابن جریرؒ اور ابن منذرؒ نے سند صحیح کے ساتھ سعید بن جبیرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ

رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مکہ مکرمہ میں سورہ نجم کی تلاوت فرمائی جس وقت آپ (آیت) "افرایتم اللات والعزی ومناۃ الثالثۃ الاخری"۔ (الخ) پر پہنچے تو شیطان نے آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلوا دیے"۔ تلک الغرانیق العلی، وان شفاعتھن لترتجی"۔ (الخ) (کہ ان بڑے بڑے بتوں کی سفارش قبول کی جائے گی) مشرکین کہنے لگے آج سے پہلے ہمارے بتوں کا اچھائی کے ساتھ ذکر نہیں کیا گیا غرض کہ آپ نے سورت کے اختتام پر سجدہ کیا اور تمام لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

اور بزارؒ اور ابن مردویہؒ نے دوسرے طریقے سے سعید بن جبیرؒ کے ذریعے حضرت ابن عباسؓ سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ روایت نقل کی ہے اور اس سند کے علاوہ اور دوسری سند سے یہ روایت متصلا مروی نہیں ہے اور صرف امیہ بن خالد اس روایت کو متصلا بیان کر رہے ہیں، باقی وہ ثقہ اور مشہور آدمی ہیں اور نیز اسی روایت کو امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جس میں واقدیؒ ہے اور ابن مردویہؒ نے کلبیؒ، ابو صالحؒ کے طریق سے ابن عباسؓ سے اور ابن جریرؒ نے عوفی کے ذریعے سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔

اور ابن اسحاقؒ نے اسی روایت کو سیرت میں محمد بن کعبؒ اور موسیٰ بن عقبہؒ کے ذریعے سے ابن شہابؒ سے اور ابن جریرؒ نے محمد بن کعبؒ اور محمد بن قیسؒ سے اور ابن ابی حاتمؒ نے سدیؒ سے روایت کیا ہے اور یہ سب روایات قریب قریب ایک ہی مضمون کی ہیں باقی یہ تمام روایات سعید بن جبیرؓ کی سند کے علاوہ جو سب سے پہلے روایت کی ہے ضعیف ہیں یا منقطع، حافظ بن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ روایت کے کثرت طرق اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ اس واقعہ کی کوئی اصلیت موجود ہے اور پھر

جب کہ دو مرسل صحیح طریق بھی اس روایت کے موجود ہیں جنھیں ابن جریرؒ نے روایت کیا ہے ایک طریق تو ان میں سے زہری عن ابی بکر بن عبدالرحمن بن الحارث بن ہشام کا طریق ہے اور دوسرا داؤد بن ہند عن ابی العالیہ کا طریق ہے اور شیخ ابن عربی اور قاضی عیاضؒ کے اس قول کا کہ یہ سب روایات باطل ہیں، کی کوئی اصلیت نہیں اور کچھ اعتبار نہیں۔

قاضی ابوبکر بن العربیؒ نے دس وجوہ سے اس روایت کو باطل کیا ہے۔ پہلی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب نبی کے پاس فرشتہ کو وحی دے کر بھیجتا ہے تو اس میں ایک علم پیدا کرتا ہے جس سے وہ جان لیتا ہے کہ یہ فرشتہ ہے ورنہ نبی کو کیسے یقین ہوگا کہ یہ اللہ کی وحی ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ شیطان آ کر کچھ کلمات پڑھے اور آپ کو پتا نہ چلے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کفر و شرک سے معصوم رکھا ہے اور جو شخص ایک آن کے لیے بھی آپ پر کفر کو جائز رکھے وہ خود اسلام سے خارج ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ بتوں کی تعریف کرنا اور ان کو شفاعت کرنے اولا کہنا کفر ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ہم امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا تلچھٹ ہیں ہم بھی ان کلمات کا کفریہ ہونا جانتے ہیں تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جن کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی معرفت کرائی ہے، کب ان کلمات کے کفر سے غافل ہو سکتے ہیں۔ علامہ ابن العربی نے اسی طرح باقی وجوہات بیان کیں اور آخر میں فرمایا کہ یہ تمام روایات باطل ہیں ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔[1]

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہے:

وان کادوا لیفتنونک عن الذی اوحینا الیک لتفتری علینا غیرہ، واذا لاتخذوک خلیلاً۔ ولولا ان ثبتنک لقد

---

[1]۔ (احکام القرآن ج ۳ ص 1303-1300، بیروت)

کدت ترکن الیھم شیئاً قلیلاً ۔(الاسراء:73-74) وہ آپ کو ہماری وحی سے لغزش دینے کے قریب تھے تا کہ آپ ہم پر کوئی بات گھڑ دیں اور اس وقت وہ ضرور آپ کو اپنا دوست بنا لیتے اور اگر ہم آپ کو مضبوط نہ رکھتے تو آپ ان کی طرف تھوڑا سا مائل ہو جاتے۔

ان آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اللہ پر افتراء باندھنے سے محفوظ اور عمصوم رکھا اور اس روایت میں ہے کہ آپ نے اللہ پر افتراء باندھا اور وہ بات کہی جو اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی۔ نیز یہ ہے کہ آپ نے کہا "میں نے شیطان کی اطاعت کی اور اس کا کلام کہا" لہٰذا یہ روایت صراحتاً ان آیتوں کے خلاف ہے اور ان کی ضد ہے۔ پس یہ روایت اگر سند تصحیح سے بھی وارد ہوتی تو مردود قرار دی جاتی اور جب فی الواقع اس کی سند صحیح نہیں ہے تو یہ کیونکر نہ مردود ہوگی۔ نیز علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ ہم اس روایت سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں، اس کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔ [1]

نبی کریم جب قرآن کی آیات پڑھ کر سناتے تو شیطان ان آیات کے بارے میں منکر اور مذبذب لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کر دیتا اور وہ طرح طرح کے اعتراض کرنے لگتے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: بیشک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں (وسوسے) ڈالتے ہیں تا کہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔ (قرآن:٦۔١٢١) اس پر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کو تسلی دی کہ یہ کوئی نئی بات نہیں، پہلے انبیاء و رسل بھی جب آیات پڑھ کر سناتے تھے تو شیطان اسی طرح لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا تھا۔

﴿لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ

۱۔(الجامع لاحکام القرآن جز۱۲ ص75-76، دار الفکر بیروت)

وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ۝۵۳
وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ
فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۴ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى
تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ۝۵۵

تا کہ اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسہ کو ان لوگوں کے لیے آزمائش بنا دے جن کے دلوں میں مرض ہے اور جن کے دل سخت ہیں۔ بلاشبہ یہ ظالم (حق کی) مخالفت میں دور تک چلے گئے ہیں۔ (۵۳) نیز یہ اس لیے کہ تا کہ جان لیں وہ لوگ جنھیں علم بخشا گیا ہے یہی آپ کے رب کی جانب سے حق ہے تا کہ وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کے لیے ان کے دل جھک جائیں اور بیشک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں سیدھے راستے کی طرف راہ دکھانے والا ہے۔ (۵۴) اور کافر لوگ ہمیشہ اس (قرآن) کے متعلق شک میں مبتلا رہیں گے یہاں تک کہ ان پر اچانک قیامت آجائے یا ان پر منحوس دن کا عذاب آجائے۔ (۵۵)

جن کے دلوں میں بیماری ہے، ان سے مراد منافقین ہیں جن کے دلوں میں شکوک اور شبہات کی بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہو چکے ہیں ان سے مراد کفار ہیں۔ شیطان نے یہ شبہات ڈالے تھے کہ قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ دوزخ میں شجرۃ الزقوم ہے تو آگ میں درخت کیسے ہوسکتا ہے؟ اور اللہ تو سب سے بڑا ہے اس نے مچھر کی مثال کیوں دی ہے، اسی طرح کے دوسرے شبہات ڈالے جن کا بیان گزر چکا ہے۔ سو منافقین تو ان شبہات کی بنیاد پر اسلام کے خلاف مہم چلائیں گے۔ سو منافقین تو ان شبہات کی بنیاد پر اسلام کے خلاف مہم چلائیں گے اور کفار وان شبہات کی وجہ سے اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹے رہنے کا اور موقع ملے گا۔

اللہ تعالیٰ اس لیے شیطان کی شیطنت کو دباتا اور مٹاتا ہے تا کہ حقیقی علم رکھنے والے لوگوں کو معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان سچ اور حق ہے۔ حقیقی علم رکھنے والے لوگ "اللہ" کے فرمان پر ایمان لاتے ہیں اور ان کے دل حق بات کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی ضرور رہنمائی کرتا اور انھیں سیدھے راستے پر گامزن رہنے کی توفیق دیتا ہے۔ یہاں علم سے مراد شریعت کا وہ علم ہے جس سے ایماندار لوگ رہنمائی حاصل کر کے شیطانی قوتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے صراط مستقیم پر گامزن رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "اُوْتُوْا الْعِلْمَ" سے مراد وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو پہلے عیسائی اور یہودی تھے۔ جب ان کے سامنے قرآن وسنت پیش کیے جاتے ہیں تو انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ وہی حق ہے جس کا ذکر انھوں نے تورات، انجیل میں پڑھا تھا۔ پھر وہ حق کو قبول کرنے میں کسی قسم کا تامل نہیں کرتے۔ "اللہ" سے ڈرنے والے علماء اُوْتُوا الْعِلْمَ میں شامل ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ اہل علم سے مراد مومنین ہیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب ہیں۔

نیز اس آیت میں فرمایا یہ حق ہے، مقاتلؒ نے کہا اس سے مراد ہے کہ یہ قرآن حق ہے۔ کلبیؒ نے کہا شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کا منسوخ ہونا حق ہے اور فرمایا: اور اللہ ایمان والوں کو ضرور صراط مستقیم دکھانے والا ہے جس سے وہ جان لیں گے کہ شیطان کے یہ ڈالے ہوئے شبہات باطل ہیں۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ۔۔: یعنی کفار اس قرآن کے متعلق ہمیشہ کسی نہ کسی شک میں مبتلا رہیں گے، خواہ وہ شیطان کا پیدا کردہ ہو یا خود ان کے نفس کا اور اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ان کے پاس قیامت کی گھڑی نہ آجائے، یا یوم عقیم (بانجھ دن) کا عذاب نہ آجائے۔ بانجھ دن سے مراد قیامت کا دن ہے، اسے عقیم اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے بعد کوئی دن نہیں ہوگا، جس طرح عقیم اسے کہا جاتا ہے جس کی اولاد نہ ہو، یا اس لیے کہ کفار کے لیے اس دن میں کوئی خیر نہیں ہوگی، جس طرح آندھی کو جو عذاب کے طور پر آئی "الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ" (ہر خیر سے خالی ہوا) کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ)[الذاریات:٤١] "اور عاد میں (بھی نشانی ہے) جب ہم نے ان پر بانجھ (خیر و برکت سے خالی) ہوا بھیجی۔" اس یوم عقیم سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے اس سے مراد یوم بدر لیا ہے کہ اس میں کفار کے لیے کوئی خیر و برکت نہیں تھی۔ مگر یہ اس لیے درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کافر اس یوم عقیم کا عذاب آنے تک شک میں رہیں گے، گویا اس دن کے آنے کے بعد کافروں کو کوئی شک نہیں رہے گا اور ظاہر ہے کہ بدر کے بعد بھی کافر موجود ہیں اور ان کے شکوک و شبہات بھی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود اس دن کی تعیین فرما دی ہے، فرمایا: (اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ)[الحج:٥٦] "تمام بادشاہی اس دن اللہ کی ہوگی، وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔" معلوم ہوا کہ اس یوم عقیم سے مراد قیامت کا دن

ہے اور مزید فرمایا: (یَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا وَالۡاَمۡرُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ) [الانفطار: ۱۷ تا ۱۹] "اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ پھر تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کا اختیار نہ رکھے گی اور اس دن سب حکم اللہ کا ہوگا۔" اس پر یہ سوال ہے کہ اس سے تکرار لازم آتا ہے، کیونکہ "السَّاعَةُ" سے مراد بھی قیامت ہے۔ جواب یہ ہے کہ "السَّاعَةُ" میں قیامت کا ذکر ہے اور "عَذَابُ يَوۡمٍ عَقِيۡمٍ" میں قیامت کے دن کے عذاب کا ذکر ہے۔ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ کفار اس وقت سے پہلے ایمان نہیں لائیں گے جب ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

﴿اَلۡمُلۡكُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ ؕ فَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِىۡ جَنّٰتِ النَّعِيۡمِ ۝۵۶ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ۝۵۷﴾

اس روز بادشاہی اللہ کی ہوگی، وہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا، چنانچہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک اعمال کیے، وہ نعمتوں کے باغات میں ہونگے۔ (۵۶) اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، ان ہی لوگوں کے لیے ذلت والا عذاب ہے۔ (۵۷)

قیامت کے دن بادشاہی اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جس کا اصلاً کوئی شریک نہیں اور وہ بادشاہی اس طرح

ہے کہ اس دن کوئی شخص سلطنت کا دعویٰ بھی نہ کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی بادشاہ کا قانون نہ ہوگا ورنہ حقیقی بادشاہت تو آج بھی اسی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دن مسلمانوں اور کافروں کے درمیان فیصلہ کردے گا اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ ایمان لانے والے اور اچھے کام کرنے والے مسلمان اللہ تعالیٰ کے فضل سے نعمتوں کے باغات میں ہوں گے اور جنہوں نے کفر کیا اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلایا ان کے لیے ان کے کفر کی وجہ سے رسوا کردینے والا عذاب ہے۔

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تم اپنے میں سے کن لوگوں کو شہید شمار کرتے ہو؟" صحابہ نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! جو اللہ کی راہ میں قتل کردیا جائے، وہ شہید ہے۔ آپ نے فرمایا: "تب تو میری امت میں شہداء بہت کم ہونگے۔" انھوں نے پوچھا، پھر یا رسول اللہ! کون شہید ہیں؟ آپ نے فرمایا: "جو اللہ کے راستے میں قتل کردیا جائے وہ شہید ہے، جو اللہ کے راستے میں (طبعی موت) مرجائے وہ بھی شہید ہے، جو طاعون کی بیماری میں فوت ہوجائے وہ بھی شہید ہے، جو پیٹ کی بیماری سے مرجائے وہ بھی شہید ہے اور جو ڈوب کر مرجائے وہ بھی شہید ہے۔"[1]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے کی مثال اس قیام کرنے والے اور روزہ رکھنے والے کی سی ہے، جو نہ تو نماز سے غافل ہوتا ہے اور نہ روزہ چھوڑتا ہے، حتیٰ کہ مجاہد کو اللہ تعالیٰ واپس اس کے گھر اجر اور غنیمت کے ساتھ لوٹائے، یا اس کو فوت کرکے جنت میں داخل کردے۔"[2]

---

[1]۔ [مسلم، کتاب الإمارة، باب بیان الشہداء: ۱۹۱۵]

[2]۔ [صحیح ابن حبان: ٤٦٢٢]

﴿ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۵۸ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝۵۹ ﴾

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر وہ قتل کیے گئے یا طبعی موت سے وفات پا گئے اللہ انہیں ضرور اچھا رزق دے گا اور بیشک اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔(۵۸) البتہ وہ انہیں ضرور ایسے مقام میں داخل کرے گا جس سے وہ راضی ہو جائیں گے اور بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا بڑا بردبار ہے۔ (۵۹)

اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ حضرت عثمان بن مظعونؓ اور حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسدؓ جب مدینہ میں فوت ہو گئے تو بعض لوگوں نے کہا جو اللہ کی راہ میں فوت ہو جائے وہ اس سے افضل ہے جو طبعی موت مرے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی کہ مہاجرین میں سے جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے یا جو طبعی موت مرے گا اللہ تعالیٰ دونوں کو رزق حسن عطا فرمائے گا یعنی دونوں کا مرتبہ برابر ہے اور ظاہر شریعت کی اس پر دلالت ہے کہ شہید افضل ہے اور بعض اہل علم نے یہ کہا ہے کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جانے والا اور اللہ کی راہ میں مرنے والا دونوں شہید ہیں لیکن اللہ کی راہ میں قتل کئے جانے والے کا مرتبہ اور اس کی فضیلت زیادہ ہے اور بعض نے کہا کہ دونوں کا مرتبہ زیادہ ہے۔

عبداللہ بن المبارکؒ نے بیان کیا ہے کہ ایک شخص ایک جہاد میں منجنیق کے پتھر لگنے سے فوت ہوا اور

دوسرا شخص طبعی موت کے پاس بیٹھ گئے، انہوں نے کہا مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ میں ان دونوں میں سے کسی کی قبر سے بھی اٹھایا جاؤں گا پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی:

والذین ھاجروا فی سبیل اللہ ثم قتلوا او ماتوا لیرزقنھم اللہ رزقا حسناً۔ (الحج: ۵۸) اور جن لوگوں نے اللہ کے راستہ میں ہجرت کی پھر وہ قتل کر دیئے گئے یا وہ (طبعی موت) مر گئے، اللہ ضرور ان کو عمدہ رزق عطا فرمائے گا۔

اور سلیمان بن عامرؒ نے کہا کہ فضالہ برودس ایک علاقہ کے امیر تھے وہ دو آدمیوں کے جنازہ پر گئے ایک قتل کیا گیا تھا اور دوسرا طبعی موت مرا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ لوگوں کا میلان اس شخص کی طرف تھا جو قتل کیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا یہ کیا وجہ ہے کہ تم مقتول کی طرف میلان کر رہے ہو، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ مجھے دونوں میں سے کس کی قبر سے اٹھایا جاتا ہے پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی۔ (۱)

سیدنا انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ حارثہ بن سراقہؓ کی ماں ام الربیع بنت براءؓ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئیں اور عرض کی، اے اللہ کے نبی! کیا آپ مجھے (میرے بیٹے) حارثہ کی کوئی خبر نہیں دیں گے؟ وہ بدر کے دن قتل ہو گئے تھے، انھیں ایک نامعلوم تیر لگ گیا تھا، (آپ بتائیں) اگر وہ جنت میں ہے تو میں صبر کروں (کہ وہ آرام میں ہے) اور اگر کوئی دوسری بات ہے تو میں ان پر خوب روؤں۔ آپ نے فرمایا: "اے ام حارثہ! (ایک جنت کیا) جنت کے اندر بہت سی جنتیں (باغ) ہیں اور بیشک تمہارا بیٹا سب سے اعلیٰ جنت الفردوس میں ہے۔" (۲)

۱۔ (تفسیر الثعالبی، الجامع لاحکام القرآن جز ۱۲ ص ۸۳)

۲۔ [بخاری، کتاب الجہاد، باب من أتاہ سہم غرب فقتلہ: ۲۸۰۹]

سیدنا انسؓ سے اصحاب بئر معونہ، یعنی ان ستر (۷۰) صحابہ کے بارے میں روایت ہے جنھیں ایک ہی دن دھوکے سے شہید کر دیا گیا تھا اور جنھوں نے ان کو شہید کیا تھا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قنوت میں ان کے لیے بددعا اور لعنت بھی فرمائی تھی۔ سیدنا انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ان کے بارے میں قرآن مجید میں یہ الفاظ بھی نازل ہوئے تھے جو بعد میں منسوخ ہو گئے تھے: (بَلِّغُوْا عَنَّا قَوْمَنَا اَنَّا لَقِيْنَا رَبَّنَا فَرَضِيَ عَنَّا وَاَرْضَانَا) "ہماری طرف سے ہماری قوم تک یہ بات پہنچا دو کہ ہم نے اپنے رب سے اس طرح ملاقات کی ہے کہ وہ ہم سے خوش ہے اور اس نے ہمیں بھی خوش کر دیا ہے۔"[1]

﴿ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۶۰ ﴾

یہ (بات خدا کے ہاں طے ہو چکی ہے) اور جو شخص (کسی سے) اتنا ہی بدلہ لے جتنی اسے اذیت دی گئی تھی اس کے بعد پھر اس شخص پر زیادتی کی جائے تو خدا اسکی مدد کرے گا بیشک خدا معاف کرنے والا (اور) بخشنے والا ہے۔

شان نزول: (آیت) "ذلک ومن عاقب بمثل ما عوقب۔" ۔(الخ)

ابن ابی حاتمؒ نے مقاتلؒ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت مبارکہ ایک چھوٹے لشکر کے بارے میں نازل ہوئی جس کو رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے روانہ فرمایا تھا چنانچہ راستے میں ان سے مشرکین

۱۔[بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الرجیع ورعل وذکوان۔۔الخ:۴۰۹۰۔ مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات:۶۷۷

ایسے وقت میں ملے جب کہ ماہ محرم الحرام کے اختتام میں دو راتیں باقی تھیں مشرکین نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کر دو کیونکہ یہ شہر حرام میں قتال کو حرام سمجھتے ہیں (اس لیے ہم سے جھگڑا نہیں کریں گے موقع اچھا ہے) صحابہ کرامؓ نے ان کو قسمیں دلائیں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرایا کہ ہمارے سے جھگڑا مت کرو کیونکہ ہم شہر حرام میں قتال کو حلال نہیں سمجھتے مشرکین نے اس بات کے ماننے سے انکار کیا اور ان سے قتال کیا اور ان پر زیادتی کی چنانچہ پھر مسلمانوں نے بھی ان سے قتال کیا اور مسلمانوں کی اللہ کی طرف سے مدد کی گئی، اسی کے بارے میں یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

یعنی ہم نے تم سے جو بیان کیا ہے، وہ اسی طرح ہے، مقاتل نے کہا یہ آیت مکہ کے ان مشرکین کے متعلق نازل ہوئی جب رجب شروع ہونے سے دو دن پہلے مسلمانوں کے ساتھ مشرکوں کا ٹکراؤ ہوا۔ انہوں نے آپس میں کہا (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب حرمت والے مہینوں میں قتال مکروہ جانتے ہیں سو انہوں نے مسلمانوں پر حملہ کیا، پس مسلمانوں ثابت قدم رہے اور اللہ نے مشرکین کے خلاف ان کی مدد فرمائی پھر حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کے دل میں خطرہ پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

امام فخر الدین محمد ابن عمر رازی متوفی 727ھ لکھتے ہیں:

امام شافعیؒ نے فرمایا جس شخص نے کسی کو آگ سے جلایا ہم اس کو آگ سے جلانے کی سزا دیں گے اور جس شخص نے کسی کو دریا میں غرق کیا ہم اس کو دریا میں غرق کرنے کی سزا دیں گے اور امام ابوحنیفہ نے فرمایا بلکہ قاتل کو تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ نے اس آیت سے استدلال فرمایا ہے کیونکہ اللہ

تعالیٰ نے مظلوم کے لیے یہ جائز قرار دیا یہ کہ وہ ظالم سے ویسا ہی بدلہ لے جیسا اس نے مظلوم پر ظلم کیا ہے اور اس کی نصرت کا وعدہ فرمایا ہے۔ (۱)

سیدنا معاذ بن جبلؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو (جب یمن کا گورنر بنا کر) بھیجا تو ان سے فرمایا: "مظلوم کی بددعا سے بچے رہنا، کیونکہ مظلوم کی پکار اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔" (۲)

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ایک دوسرے کو گالی دینے والے دو شخص جو کچھ کہیں اس کا گناہ پہل کرنے والے پر ہے، جب تک مظلوم زیادتی نہ کرے۔" (۳)

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے ابوبکرؓ کو گالی دی۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہاں بیٹھے ہوئے تھے، آپ تعجب کرتے رہے اور مسکراتے رہے۔ جب اس نے زیادہ ہی برا بھلا کہا تو ابوبکرؓ نے اس کی کسی بات کا جواب دے دیا، تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غصے میں آ گئے اور وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ابوبکرؓ آپ کے پیچھے جا کر آپ سے ملے اور کہنے لگے، یا رسول اللہ! وہ مجھے گالیاں دے رہا تھا اور آپ بیٹھے ہوئے تھے اور جب میں نے اس کی کسی بات کا جواب دیا تو آپ غصے سے اٹھ گئے؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "بات یہ ہے کہ تمہارے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو تمہاری طرف سے جواب دے رہا تھا، لیکن جب تم نے اس کی کسی بات کا جواب دیا تو شیطان آ گھسا،

۱۔ (تفسیر کبیر ج ۸ ص ۲۴۶ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

۲۔ [مسلم، کتاب الإیمان، باب الدعاء إلی الشهادتین وشرائع الإسلام: ۱۹]

۳۔ [مسلم، کتاب البر والصلة، باب النهی عن السباب: ۲۵۸۷]

سو میں شیطان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا۔"[1]

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿٦١﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٦٢﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿٦٣﴾ ۚ ﴾

یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن میں رات کو داخل کرتا ہے اور بیشک اللہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔(٦١) یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور یہ کہ جس کو یہ لوگ پکارتے ہیں اس کے سوا وہ سب باطل ہے اور یہ کہ یقیناً اللہ ہی بلند و بالا اور سب سے بڑا ہے۔(٦٢) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور (سوکھی) زمین سرسبز ہو کر لہلہانے لگتی ہے، بیشک اللہ تعالیٰ بڑا ہی باریک بین اور ہر چیز سے باخبر ہے۔ (٦٣)

ہجرت کا ذکر کرنے کے بعد اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل

---

[1]۔[مسند أحمد:٢/٤٣٦، ح:٩٦٣٧۔أبوداؤد، کتاب الأدب، باب فی الانتصار:٤٨٩٦]

کرتا ہے۔ یقیناً وہ ہر بات سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ لوگو! اللہ تعالیٰ ہی معبود حق ہے۔ اس کے سوا جن کو لوگ پکارتے ہیں وہ جھوٹ ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر اعتبار سے بلند و بالا اور سب سے بڑا ہے۔ رات اور دن کا تذکرہ کرنے کے ساتھ فرمایا کہ اللہ ہر بات سننے اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ جس طرح رات اور دن ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے ہیں بالکل یہی کیفیت انسان کی زندگی کی ہے کہ اس کی زندگی میں دکھ اور پریشانیاں بھی ہیں اور خوشیاں اور کامیابیوں کے روشن پہلو بھی موجود ہیں۔ جو "اللہ" رات کی تاریکیوں کو دن کے اجالے میں تبدیل کرتا اور دن کے اجالے کو رات میں بدلتا ہے۔ وہی غم کو خوشی میں تبدیل کرتا ہے اور وہی خوشی کی جگہ غم نازل کرتا ہے۔" اللہ" کے سوا کوئی رات کو دن اور دن کو رات، خوشی کو غم اور غم کو خوشی میں تبدیل کرنے والا نہیں۔ جب اس کے سوا کوئی ایسا نہیں کرسکتا تو پھر "اللہ" ہی حق ہے باقی سب باطل ہیں'۔ لہٰذا ہر حال میں اسی سے مانگا کرو۔ جو لوگ اس کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں وہ باطل اور جھوٹ پر ہیں۔ یہاں باطل کے دو مفہوم ہیں ایک تو ان کا پکارنا باطل ہے دوسرا جن کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے ہیں یہ جھوٹ اور باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات میں بلند و بالا ہے۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور عظیم بادشاہت کی نشانی ہے کہ وہ ایسی ہوائیں بھیجتا ہے جو بادلوں کو اٹھا کر لے جاتی ہیں اور خشک، بنجر، سیاہ اور ویران زمین پر بارش برسا دیتی ہیں، جس سے زمین خشک اور بنجر ہونے کے باوجود سرسبز و شاداب ہوجاتی ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ

وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ)[الانعام:۹۹] "اور وہی ہے جس نے آسمانوں سے پانی اتارا تو ہم نے اس کے ساتھ ہر چیز کی انگوری نکالی، پھر ہم نے اس سے سبز کھیتی نکالی، جس میں سے ہم تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے درختوں سے ان کے گابھے میں سے جھکے ہوئے خوشے ہیں اور انگوروں اور زیتون اور انار کے باغات ملتے جلتے اور نہ ملنے جلنے والے۔ اس کے پھل کی طرف دیکھو جب وہ پھل لائے اور اس کے پکنے کی طرف۔ بیشک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔"

﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۶۴ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۭ وَيُمْسِكُ السَّمَاۗءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۶۵ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۣ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۝۶۶﴾

اسی کا ہے جو کچھ آسمان میں اور زمین میں ہے۔ اور (بیشک) اللہ وہی ہے جو ہر

طرح سے بے نیاز اور ہر تعریف کے لائق ہے۔(۶۴) کیا تم نے دیکھا نہیں کہ جو کچھ زمین میں ہے وہ اللہ نے تمہارے تابع فرمان بنا دیا ہے اور کشتی کو بھی کہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے۔اور (وہی) آسمان کو زمین پر گرنے سے روکے ہوئے ہے کہ زمین پر گر نہ پڑے مگر اس کے حکم سے بیشک اللہ لوگوں پر بڑا شفیق (اور) مہربان ہے۔(۶۵) اور وہی ہے جس نے تمہیں زندگی دی، پھر وہ تمہیں موت دے گا پھر تم کو زندہ کرے گا، بیشک انسان بڑا ناشکرا ہے۔(۶۶)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تمام کائنات اپنے اختیار سے یا بغیر اختیار کے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر رہی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کائنات میں ہر قسم کا تصرف فرما رہا ہے اور وہ ہر چیز سے مستغنی ہے اور وہ کسی کی تعریف کرنے سے بھی مستغنی ہے۔اس نے مخلوق کو پیدا کیا اور اپنی حکمت سے آسمان سے پانی برسایا اور زمین سے اناج پیدا فرمایا۔یہ اس کی انسانوں اور حیوانوں پر رحمت ہے اور اس کا انعام اور احسان ہے، اسے اس کی ضرورت اور غرض نہ تھی سو وہی حمد کا مستحق ہے، اس لیے اس کا حمد کیا ہوا ہونا واجب ہے۔

اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا اور کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو زمین میں ہیں تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور تمہارے بس میں کر دیا ہے اور کشتی کو بھی جو اس کے حکم سے دریا میں چلتی ہے اور اسی نے آسمان کو اس بات سے روک رکھا ہے کہ زمین پر گر پڑے مگر اس کا حکم ہو جائے تو اور بات ہے۔بلاشبہ! اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑی شفقت کرنے والا بڑی مہربانی کرنے والا ہے۔یعنی یہ اس کی شفقت و مہربانی ہے کہ زمین کی ہر چیز کو خواہ وہ نباتات ہو یا حیوانات و جمادات ہو تمہارے قابو

میں دے دیا ہے اور دریاؤں میں کشتیاں دوڑاتے پھرتے ہو اور آسمان کو زمین پر گرنے سے روک رکھا ہے آسمان میں کوئی ستون نہیں اور نہ یہ شامیانہ کہیں بندھا ہوا ہے پھر اس کو روک رکھا ہے۔ البتہ اگر اس کی اجازت اور حکم ہو جائے تو یہ امر دیگر ہے کہ آسمان زمین پر گر پڑے۔ یہ دلیل بھی منجملہ دلائل توحید کے ہے۔

سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اذیت کی بات سن کر صبر کرنے والا اللہ سے زیادہ کوئی نہیں ہے، (کم بخت مشرک) لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے اور وہ پھر بھی ان کو عافیت سے رکھتا ہے اور رزق دیتا ہے۔"[1]

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ : یعنی تم اللہ تعالیٰ کے کس طرح شریک بناتے اور اس کے ساتھ غیروں کی کیونکر پوجا کرتے ہو، حالانکہ خلق، رزق اور تصرف صرف اسی کے قبضہ اختیار میں ہے، ارشاد فرمایا: (اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ)[الروم: ٤٠] "اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہیں رزق دیا، پھر تمہیں موت دے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا، کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو ان کاموں میں سے کچھ بھی کرے؟ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔"

﴿لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي

---

[1]۔ [بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: (إن اللہ ہو الرزاق ذو القوۃ المتین): ۷۳۷۸]

الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ۝۶۷ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۶۸ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۶۹

ہم نے ہر امت کے لیے ایک طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کے مطابق وہ عبادت کرتے ہیں، تو یہ لوگ آپ سے اس بات میں جھگڑا نہ کریں اور آپ ان کو اپنے رب کی طرف بلاتے رہیں بلاشبہ آپ ہدایت پر ہیں جو سیدھا راستہ ہے۔(٦٧) اور اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہیں کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔(٦٨) اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا ان باتوں میں جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔(٦٩)

اللہ تعالیٰ نے ہر امت کو اس کے مخصوص حالات کے پیش نظر ایک مخصوص نظام شریعت عطا فرمایا جو بعض چیزوں میں ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ جس طرح انجیل کا نظام شریعت تورات کے نظام شریعت سے مختلف تھا اسی طرح اب قرآن کا نظام شریعت (اسلام) بھی پہلے نظامہائے شریعت سے مختلف ہے۔ لہٰذا کسی کو مناسب نہیں کہ وہ اسلام کے نظام شریعت میں جھگڑا کرے کیونکہ جس طرح شریعت عیسوی کے آنے سے شریعت موسوی منسوخ ہوگئی تھی اسی طرح اب شریعت محمدی کے آنے سے پہلی تمام

شریعتیں منسوخ ہوگئی ہیں۔

اس آیت کے دوسرے حصہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کو تسلی دی ہے کہ آپ ان کے جھگڑنے کی پرواہ نہ کریں بلکہ ان کو اسلام کی دعوت دیتے رہیں کیونکہ اب اسلام ہی سیدھا راستہ ہے جس پر آپ گامزن ہیں۔

حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا اس آیت سے مشرکین مکہ مراد ہیں جو آپ کی نبوت کے دعویٰ میں آپ سے جھگڑا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ ان کے کرتوتوں کو یعنی ان کے شرک اور بت پرستی کو اور حق کے خلاف شوروغوغا کرنے کو اور بے حیاتی کے کاموں کو اور کمزوروں اور ناتوانوں پر ظلم وستم کرنے کو خوب جانتا ہے اور قیامت کے دن فیصلہ ہوجائے گا کہ کس کا طریقہ حق تھا اور کس کا طریقہ باطل تھا اور کون جنت میں جائے گا اور کس کو دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔

ایام جاہلیت میں حج کے جو مناسک رواج پا گئے تھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان میں سے بعض میں تبدیلی کردی، مثلاً مشرکین حج کے مہینوں میں عمرہ نہیں کرتے تھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حج کے مہینوں میں عمرہ کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ لوگ ایام جاہلیت میں حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کو زمین پر بہت بڑا گناہ شمار کرتے تھے اور وہ محرم کو صفر قرار دے لیا کرتے تھے (اس لیے کہ تین مہینے مسلسل حرمت والے ہیں، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم اور تین ماہ تک قتل وغارت گری سے باز رہنا ان کے لیے بڑا مشکل تھا) اور وہ کہتے تھے، جب اونٹوں کی پیٹھیں اچھی ہوجائیں (یعنی سفر حج کی وجہ سے جو اونٹ زخمی وغیرہ ہوئے ہیں وہ ٹھیک ہوجائیں) اور راستوں سے حاجیوں کے اونٹوں کے نشان قدم مٹ جائیں اور صفر کا مہینا ختم ہوجائے تو تب عمرہ کرنے والے

کے لیے عمرہ جائز ہے۔ پھر جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے ساتھی چار ذوالحجہ کی صبح کو حج کا احرام باندھے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے ان کو حکم دیا کہ حج کے احرام کو عمرہ کے احرام میں بدل دیں، تو لوگوں کو یہ بات بڑی انوکھی لگی، انھوں نے عرض کی، اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہم کس نوعیت کے حلال ہوئے ہیں (یعنی پورے یا ادھورے)؟ تو آپ نے فرمایا: "تم پورے حلال ہو گئے (یعنی کسی چیز سے پرہیز کی ضرورت نہیں)۔"[1]

اسی طرح ۹ ذوالحجہ کو قریش مزدلفہ میں قیام کرتے تھے، جبکہ دوسرے لوگ عرفات میں قیام کیا کرتے تھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے باوجود قریشی ہونے کے عرفات میں قیام کیا۔ سیدہ عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ آیت: (ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ) یہ قریش کے سلسلہ میں نازل ہوئی، وہ مزدلفہ (میں قیام کرتے تھے اور وہیں) سے روانہ ہوتے تھے (اس آیت کے ذریعے سے) انھیں عرفات کی طرف لوٹا دیا گیا (یعنی انھیں حکم دیا گیا کہ وہ بھی وہیں سے روانہ ہوں جہاں سے عام لوگ روانہ ہوتے ہیں)۔[2]

مشرکین ایام جاہلیت میں مزدلفہ سے سورج طلوع ہونے کے بعد منیٰ روانہ ہوتے تھے، لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) طلوع آفتاب سے پہلے روانہ ہو گئے۔ سیدنا عمر بن خطابؓ بیان کرتے ہیں کہ مشرک لوگ (جاہلیت کے زمانہ میں) مزدلفہ سے اس وقت روانہ ہوتے تھے جب سورج نکل آتا تھا۔ وہ کہتے اے ثبیر! چمک جا اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے اس فعل کے خلاف کیا، آپ

۱۔ [مسلم، کتاب الحج، باب جواز العمرۃ فی اشھر الحج: ۱۲٤۰]

۲۔ [بخاری، کتاب الحج، باب الوقوف بعرفۃ: ۱٦٦٥۔ مسلم، کتاب الحج، باب فی الوقوف: ۱۲۱۹]

مزدلفہ سے سورج نکلنے سے پہلے روانہ ہو گئے۔ [1]

﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ ﴾

کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے اللہ اس کو جانتا ہے بیشک یہ سب چیزیں ایک کتاب (لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی ہیں۔ بیشک یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ ۔۔: یعنی کیا تمہیں واضح بات بھی معلوم نہیں کہ آسمان وزمین میں جو کچھ بھی ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور کوئی بھی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں؟ نہ اس کے مخلص اور فرماں بردار بندوں کی فرماں برداری اس سے مخفی ہے اور نہ اس کے منکروں اور نافرمانوں کی شرارتیں اور فساد اس سے اوجھل ہے۔ اس لیے اس علم کے ساتھ وہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا کہ ہر شخص جو کچھ کر رہا ہے وہ پورے اہتمام کے ساتھ ایک کتاب میں محفوظ ہے، اس لیے کوئی اس خام خیالی میں نہ رہے کہ یہ محض ہوائی باتیں ہیں، اتنی مخلوق کے ہر عمل کا ریکارڈ کیسے رکھا جا سکتا ہے اور ان کے درمیان فیصلہ کیسے ہوگا؟ فرمایا بیشک یہ تمہارے لیے ایک مشکل بلکہ ناممکن کام ہے مگر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں، کیونکہ وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔

---

[1] [بخاری، کتاب الحج، باب متی یدفع من جمع: ۱۶۸۴]

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے تھے: "اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تقدیریں آسمانوں اور زمین کے بنانے سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دی تھیں اور اس وقت اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔"[1]

سیدنا عبادہ بن صامت ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اس سے کہا، لکھ! اس نے کہا، اے میرے رب! کیا لکھوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، قیامت قائم ہونے تک جو بھی چیز (معرض وجود میں آنے والی) ہے اس کی تقدیر لکھ دے۔ (چنانچہ اس نے اللہ کے حکم سے قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا، سب لکھ دیا)۔"[2]

﴿ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿٧١﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ

---

[1] [مسلم، کتاب القدر، باب حجاج آدم وموسیٰ صلی اللہ علیہما وسلم: ۲۶۵۳]

[2] [أبوداؤد، کتاب السنۃ، باب فی القدر: ۴۷۰۰۔ ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ نون والقلم: ۳۳۱۹۔ مسند أحمد: ۳۱۷/۵، ح: ۲۲۷۷۱۔ مسند أبی یعلیٰ: ۳۶۸/۲، ح: ۲۳۲۵]

كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۲﴾

اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن کے بارے میں اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، جس کا انھیں کچھ علم نہیں اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔(۷۱) اور جب ان کے سامنے ہماری خوب واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو آپ ان کافروں کے بگڑے چہرے پہچان جاتے ہیں۔قریب ہے کہ یہ ان پر حملہ کر بیٹھیں جو ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھ رہے ہیں۔آپ فرما دیجیے کیا میں اس سے زیادہ ناگوار چیز نہ بتادوں؟ وہ دوزخ ہے! جس کا اللہ نے کافروں سے وعدہ فرمایا ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔(۷۲)

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔۔: یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی کتاب میں نہیں فرمایا کہ میں نے فلاں فلاں ہستی کو فلاں فلاں اختیارات دے رکھے ہیں، لہٰذا ان کاموں کے لیے اپنی حاجات ان سے طلب کرو اور نہ اس بات کی کوئی علمی یا عقلی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو بھی کائنات میں اپنی مرضی چلانے کا اختیار ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس سے مرادیں مانگی جائیں۔دیکھیے سورہ احقاف (۴، ۵) اور فاطر (۴۰) جب شرک کی نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی، تو معلوم ہوا کہ لوگوں نے جو غیر اللہ کے آستانے بنا رکھے ہیں، یا زندہ یا فوت شدہ بزرگوں کو خدائی اختیارات کا مالک سمجھ کر ان کی نذریں نیازیں چڑھا رہے ہیں اور ان کی قبروں کا یا ان کے بتوں کا طواف یا ان کے سامنے قیام، رکوع یا سجود کر

رہے ہیں، یا ان کے مجاور بن کر ان کا اعتکاف کر رہے ہیں، یا انھیں حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر ان سے فریادیں کر رہے ہیں تو ان کے پاس اوہام پرستی اور باپ دادا کی اندھی تقلید کے سوا کچھ نہیں۔

کفار کے سامنے جب قرآن مجید کی آیات پڑھی جاتیں تو وہ غصے سے بھر جاتے جس کی وجہ سے ان کے چہروں پر ناگواری کے آثار ظاہر ہو جاتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ابھی تلاوت کرنے والے مسلمانوں پر حملہ کر دیں گے۔ اس پر کفار کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ ابھی تو قرآن کی آیات سن کر صرف تمہارے چہرے کے تیور بدلتے ہیں مگر ایک وقت آنے والا ہے اگر تم نے آج کفر سے توبہ نہ کی تو اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ صورتحال سے تمہیں دوچار ہونا پڑے گا اور وہ دوزخ کی آگ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے کفار سے وعدہ کر رکھا ہے۔

سیدنا انس بن مالک ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "قیامت کے دن اہل دوزخ میں سے ایک ایسے شخص کو لایا جائے گا جو دنیا میں خوشحال اور آسودہ تھا، پھر اسے ایک بار دوزخ میں غوطہ دیا جائے گا اور بعد ازاں پوچھا جائے گا کہ اے ابن آدم! کیا تو نے کبھی دنیا میں عیش و آرام دیکھا تھا؟ کیا تجھ پر کبھی خوشحالی آئی تھی؟ وہ کہے گا اے میرے رب! اللہ کی قسم! کبھی نہیں، پھر اہل جنت میں سے ایک شخص کو لایا جائے گا، جو دنیا میں سب لوگوں سے زیادہ تکلیف اور مصیبت میں رہا تھا، پھر اسے جنت میں ایک غوطہ دیا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ اے آدم کے بیٹے! کیا تو نے کبھی کوئی تکلیف بھی دیکھی ہے؟ کیا تجھ پر کبھی کوئی مصیبت بھی آئی تھی؟ وہ کہے گا، اے میرے رب! اللہ کی قسم! مجھے تو کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی اور نہ میں نے کبھی کوئی مصیبت دیکھی تھی۔"[1]

---

[1]۔ [مسلم، کتاب صفات المنافقین، باب صبغ أنعم أہل الدنیا فی النار وصبغ أشدھم بؤسا فی الجنۃ: ۲۸۰۷]

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝۷۳ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۷۴ ﴾

اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے سنو کہ جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے چاہے اس کے لیے سب جمع ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اس چیز کو اس مکھی سے چھڑا نہیں سکتے، طالب اور مطلوب دونوں کمزور ہیں۔ (۷۳) ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق تھا بیشک اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور (اور) سب پر غالب ہے۔ (۷۴)

یعنی یہ معبودان باطلہ، جن کو تم اللہ کو چھوڑ کر مدد کے لیے پکارتے ہو، یہ سارے کے سارے جمع ہو کر ایک نہایت حقیر سی مخلوق مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں، تو نہیں کر سکتے اور وہ حقیر ترین مکھی اگر ان سے کوئی چیز چھین

لے تو اسے وہ واپس نہیں لے سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارے بت اور مکھی دونوں ہی حقیر اور کمزور ہیں، بلکہ تمہارے معبود تو زیادہ حقیر اور کمزور ہیں کہ وہ اپنے آپ سے مکھی کو بھی نہیں اڑا سکتے۔ سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرماتے ہوئے سنا، آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو میری طرح پیدا کرنا چاہتا ہے، (اگر کسی کو یہی گھمنڈ ہے تو) وہ ایک دانہ پیدا کرے، یا ایک چیونٹی پیدا کر کے دکھا دے۔"[1]

بعض لوگ جو فوت شدہ بزرگوں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر پکارتے ہیں وہ "مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ" سے مراد صرف بت لیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ انبیاء و اولیاء "مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ" نہیں۔ اس پر خود بخود سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ "مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ" (اللہ کے سوا نہیں) تو پھر وہ خود خدا ٹھہرے۔ اگر تمہارا یہ عقیدہ ہے تو اس کائنات میں تم سے بڑا کافر کوئی نہیں کہ تم نے اللہ کی پیدا کردہ مخلوق کو رب بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء ہوں، اولیاء ہوں یا فرشتے سب اللہ کی مخلوق ہیں اور "مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ" ہیں، خود اللہ نہیں۔ دلیل اس کی یہی آیت ہے کہ صرف بت ہی نہیں تمام زندہ یا فوت شدہ انبیاء و اولیاء اور تمہارے بنائے ہوئے مشکل کشا، داتا اور دستگیر جمع ہو کر بھی ایک مکھی نہیں بنا سکتے۔ اگر کوئی بنا سکتا ہے یا کسی نے بنائی ہے تو اس کا نام لو۔ اللہ تعالیٰ نے کیا خوب فرمایا: (قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِي الۡاَعۡمٰى وَالۡبَصِيۡرُ ۙ اَمۡ هَلۡ تَسۡتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوۡرُ ۚ اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوۡا كَخَلۡقِهٖ فَتَشَابَهَ الۡخَلۡقُ عَلَيۡهِمۡ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَىۡءٍ وَّهُوَ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ)[الرعد:١٦] "کہہ دے کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوتے ہیں؟ یا کیا اندھیرے اور روشنی برابر ہوتے ہیں؟ یا انھوں نے اللہ کے لیے کچھ شریک بنا

---

[1]۔ [بخاری، کتاب اللباس، باب نقض الصور: ٥٩٥٣]

لیے ہیں جنھوں نے اس کے پیدا کرنے کی طرح پیدا کیا ہے، تو پیدائش ان پر گڈمڈ ہوگئی ہے؟ کہہ دے اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی ایک ہے، نہایت زبردست ہے۔

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ: نتیجہ اس ساری مثال کا یہ ہے کہ مشرک اللہ تعالیٰ سے بالکل جاہل ہے، تبھی وہ اللہ کا حق کہ صرف اسے پکارا جائے، کسی دوسرے کو دیتا ہے، خواہ کوئی بھی ہو۔ پھر اس سے بڑھ کر بے قدری کیا ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حق ان ہستیوں کو دے دے جو حقیر ترین چیز مکھی بھی نہ پیدا کر سکتے ہیں اور نہ اس سے چھینی ہوئی چیز واپس لے سکتے ہیں۔

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ ﴾

اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں سے (اپنا) پیغام پہنچانے کے لیے چن لیتا ہے، بیشک اللہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔ (۷۵) وہ سب کچھ جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے، اور اللہ ہی کی طرف سب کام لوٹائے جاتے ہیں۔ (۷۶)

مشرکوں کو یہ اعتراض تھا کہ اللہ نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نبی کیوں منتخب کیا ہے؟ حالانکہ دولت اور اثر رسوخ کے اعتبار سے اس سے فلاں فلاں آدمی زیادہ موزوں تھے۔ یہودیوں کو حضرت جبرائیل

(علیہ السلام) پر اعتراض ہے کہ اس نے ہمارے آباواجداد پر عذاب نازل کیا ہے۔ اس لیے اس کی بجائے وحی لانے پر کسی اور فرشتے کو مامور کرنا چاہیے تھا۔

اب یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حسن انتخاب ہے کہ وہ ملائکہ میں جس کو چاہے اپنی وحی کے لیے منتخب فرمائے اور بندوں میں سے جس کو چاہیے نبی بنائے۔ وہ ہر بات سنتا اور ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔ یعنی اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ کون کس نیت کے ساتھ اعتراض کرتا ہے اور کس کا کیا کردار ہے؟ وہ ہر کسی کے ماضی، حال اور مستقبل کو جانتا ہے۔ ہر کام کا انجام اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹایا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ کوئی اس کی توحید کا انکار کرے یا اس کے نبی کی رسالت یا جبرائیل امین کا بالآخر ہر کسی نے اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ اور سب کا انجام بھی اس کے ہاں لکھا ہوا ہے۔

"جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ ہمیں اس جیسا دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔ اللہ زیادہ جانتا ہے کہ رسالت کسے دے۔ جنہوں نے جرم کیے عنقریب انہیں اللہ کے ہاں ذلت اٹھانا پڑے گی اور انہیں سخت عذاب دیا جائے گا اس وجہ سے کہ وہ مکروفریب کرتے تھے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ

حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰهِیۡمَ ؕ هُوَ سَمّٰىکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۙ۬ مِنۡ
قَبۡلُ وَفِیۡ هٰذَا لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ وَتَکُوۡنُوۡا
شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۚۖ فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ
وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوۡلٰىکُمۡ ۚ فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰی وَنِعۡمَ
النَّصِیۡرُ ﴿۷۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! رکوع کرو، سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو اور نیک کام کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ (۷۷) اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے اور اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی اپنے باپ ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو اسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا اس سے پہلے اور اس (کتاب) میں بھی، تا کہ رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دیں اور تم دوسرے لوگوں پر اس کی گواہی دو تو نماز قائم رکھو اور زکوۃ دو اور اللہ کی رسی مضبوطی سے تھام لو وہ تمہارا مولیٰ ہے تو کیا اچھا مولیٰ اور کتنا اچھا مددگار ہے۔ (۷۸)

جہاد کا حق کس طرح ادا کیا جائے

اس سے پہلی آیت میں تین احکام شرعیہ بیان فرمائے تھے نماز پڑھنا، عبادت کرنا (یعنی اطاعت کو بہ طور عبادت کرنا)، اور نیکی کے کام کرنا اور اس آیت میں چوتھا حکم بیان فرمایا اور وہ اللہ کی راہ میں اس طرح جہاد کرنا ہے جس طرح جہاد کرنے کا حق ہے۔ اللہ کی راہ میں اسطرح جہاد کرنا جس طرح جہاد کرنے کا حق ہے اس کی حسب ذیل تفسیریں کی گئی ہیں:

(۱) اس سے مراد خصوصیت کے ساتھ جہاد کرنا ہے، یعنی یہ جہاد دنیا کے لیے کیا جائے نہ ناموری کے لیے نہ مال غنیمت کے حصول کے لئے، صرف اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کی رضا کے حصول کے لیے جہاد کیا جائے۔

(۲) جس طرح ابتداء جہاد کیا گیا ہے اسی طرح انتہاء بھی جہاد کیا جائے کیونکہ ابتداء جو جہاد کیا جاتا ہے وہ زیادہ قوی ہوتا ہے اور اس میں مسلمان نسبتاً زیادہ ثابت قدم ہوتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تم اس طرح جہاد کرو جس طرح تم نے پہلی بار جہاد کیا تھا۔ [۱]

(۳) ابن جریجؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا تم اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرو۔ (جامع البیان: ۱۹۲۰۲)

(۴) ضحاکؒ نے کہا اس کا معنی ہے اللہ کے احکام پر عمل کرنے کا حق ادا کرو۔ [۲]

(۵) اللہ کے دین کے احیاء اور اس کی اشاعت کے لیے اور زبان اور قوت سے اس کی حدود کو قائم کرنے کے لیے اپنی مقدور کے مطابق جدوجہد کرو جہاں تک تم سے ممکن ہو سکے اور اپنے دلوں سے

۱۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 19201)

۲۔ (جامع البیان رقم الحدیث: 19203)

ناجائز خواہشوں اور اللہ سے غافل کرنے والی چیزوں کی محبت کو نکال دو۔ [1]

(۶) عبداللہ بن مبارک نے کہا جہاد کنے کا حق یہ ہے کہ اپنے نفس اور اپنی خواہشوں سے جہاد کرو، خطیب بغدادی نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک غزوہ سے آئے تو آپ نے مسلمانوں سے فرمایا تم آ گئے خوش آمدید ہو، تم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف آئے ہو۔ مسلمانوں نے کیا جہاد اکبر کی کیا تعریف ہے آپ نے فرمایا بندہ کا اپنی خواہشوں سے جہاد کرنا۔ [2]

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ : اس خطاب کے اولین مخاطب صحابہ کرامؓ ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنا دین قبول کرنے، اسے پھیلانے اور اسے نہ ماننے والوں کے ساتھ جہاد کے لیے چن لیا ہے۔ اور یہ حقیقت سب جانتے ہیں کہ یہ صحابہ ہی تھے جنھوں نے دعوت و جہاد کے ساتھ چند سالوں میں مشرق و مغرب تک اسلام پہنچا دیا۔ پھر ان کے بعد جو لوگ بھی ان کے نقش قدم پر چل کر دعوت و جہاد کے ساتھ کفر کو مغلوب اور اسلام کو غالب کرتے رہے وہ بھی اس کے مخاطب ہیں۔ یہ آیت صحابہ اور ان کے پیروکاروں کی فضیلت کی زبردست دلیل ہے۔ وہ لوگ بہت بڑی غلطی پر ہیں جو اللہ کے ان چنے ہوئے پیاروں سے بغض رکھتے ہیں اور ان پر زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ یا پوری امت اس کی مخاطب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمام امتوں میں سے چن لیا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس آیت کا اور " كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ " کا مفہوم ایک ہی ہے۔

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا : " أَيْ مِنْ قَبْلِ الْقُرْآنِ وَ فِيْ هٰذَا الْقُرْآنِ "

۱۔ (تفسیر کبیر ج ۸ ص ۲۵۵)

۲۔ (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۹۳) اس حدیث کا امام سیوطی اور امام علی متوقی ہندی نے بھی ذکر کیا ہے۔ (جمع الجوامع رقم الحدیث: ۱۵۲۳۳، کنز العمال رقم الحدیث: ۱۱۲۶۲، ۱۱۷۷۹)

عام طور اس کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ اس نے یعنی ابراہیم (علیہ السلام) نے قرآن سے پہلے اور اس قرآن میں تمہارا نام مسلمین رکھا۔ مگر امام طبری نے دو صحیح سندوں کے ساتھ نقل فرمایا ہے کہ ابن عباسؓ نے "هُوَ سَمّٰىكُمُ " کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے (تمھارا نام مسلم رکھا ہے)۔ یعنی یہ نام ابراہیم (علیہ السلام) نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ مجاہد، قتادہ، ضحاک، سدی اور مقاتل بن حیانؒ نے بھی یہی فرمایا۔ اس کے بعد ابن کثیر نے طبری سے عبدالرحمن بن زید بن اسلم کا قول نقل فرمایا کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے تمہارا نام مسلمین رکھا اور اس پر ابن جریرؒ کا تبصرہ نقل فرمایا کہ یہ کسی طرح صحیح نہیں، کیونکہ معلوم ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے قرآن میں اس امت کا نام مسلمین نہیں رکھا، جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے تمہارا نام اس سے پہلے اور اس میں مسلمین رکھا۔ مجاہدؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام مسلمین رکھا، اس سے پہلے گزشتہ کتابوں میں اور اس ذکر (قرآن) میں بھی۔ مجاہدؒ کے علاوہ بھی کئی مفسرین نے یہی فرمایا ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہی بات درست ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے فرمایا: (هُوَ اجْتَبٰىكُمْ) یعنی اس (اللہ) نے تمہیں چنا۔ پھر انھیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لائے ہوئے دین کی ترغیب یہ کہہ کر دلائی کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت ہے، پھر اس امت پر احسان جتلایا کہ اس نے پہلی تمام کتابوں میں اور اس قرآن میں تمہارا نام مسلمین رکھا ہے۔

سورہ المومنون

سورہ مومنون مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں ایک سو اٹھارہ آیتیں اور چھ رکوع ہیں۔

تعبیر

جس نے اس کو خواب میں پڑھا اس کے دل میں زیادہ دیر تک عبادت میں کھڑے رہنے کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف عاجزی کرنے کی محبت ہوگی اور ایک ایسے مرض کا خوف ہے جو بڑا خطرناک ہے۔(علامہ ابن سیرینؒ)

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام المؤمنون ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورت المؤمنون کی صفات کے ذکر سے شروع ہوتی ہے:

قدافلح المومنون: (المؤمنون:۱) بیشک ایمان والے کامیاب ہوئے۔اور حسب ذیل احادیث میں اس سورت کو المؤمنون فرمایا گیا ہے:

حضرت عبداللہ بن السائبؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مکہ میں ہمیں صبح کی نماز پڑھائی آپ نے سورہ المومنین کو شروع فرمایا حتیٰ کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کا ذکر آیا یا حضرت عیسیٰ کا ذکر آیا تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کھانسی اٹھی پھر آپ نے رکوع کرلیا۔ [1]

حضرت عمر بن خطابؓ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وحی نازل ہوتی تو آپ کے منہ سے شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ کی طرح آواز سنائی دیتی، ایک دن آپ وحی نازل ہوئی ہم تھوڑی دیر ٹھہرے رہے، پھر آپ سے وہ کیفیت دور ہوگئی آپ نے قبلہ کی طرف منہ کیا اور دونوں ہاتھ بلند کئے

۱۔(صحیح مسلم رقم الحدیث، ٤٥٥، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:٦٤٩، سنن النسائی رقم الحدیث:١٠٠٧، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:٨٢٠)

اور دعا کی کہ اللہ! ہمیں زیادہ دے، ہم سے کمی نہ کر، ہمیں عزت دے، ہمیں رسوائی نہ دے، اور ہم کو عطا فرما اور ہم کو محروم نہ کر، ہمیں ترجیح دے، ہم پر ترجیح نہ دے اور ہم سے راضی ہو اور ہم کو راضی کر دے، پھر آپ نے فرمایا مجھ پر دس آیتیں نازل ہوئی ہیں جس نے ان دس آیتوں کے احکام پر عمل کیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا پھر آپ نے المؤمنون کی ابتدائی دس آیتیں پڑھیں۔ [1]

حضرت انس بن مالک ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت عدن کو پیدا کیا اور اس میں اپنے دست قدرت سے درخت اگائے، پھر جنت کے درخت سے فرمایا تم کلام کرو تو اس نے کہا قد افلح المؤمنون۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ [2]

زمانہ نزول

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے، اعلان نبوت کے بعد نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں تیرہ سال رہے تھے اور حضرت عمر ؓ اعلان نبوت کے چھٹے سال میں اسلام لائے تھے اور ہم نے سنن الترمذی اور متعدد کتب حدیث کے حوالوں سے حدیث نقل کی ہے جس میں حضرت عمر نے نزول وحی کی کیفیت بیان کی ہے اور اس میں سورہ المؤمنون کے نازل ہونے کا بیان کیا ہے اس سے متعین ہو جاتا ہے کہ یہ سورت مکی دور کے وسط میں نازل ہوئی ہے۔

۱۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۷۳، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۶۰۳۸ مسند احمد ج ۱ ص ۴۳ مسند البزار رقم الحدیث: ۳۰۱ السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۳۴۸)

۲۔ (المستدرک رقم الحدیث: ۳۵۳۲، الکامل لابن عدی ج ۵ ص ۳ طبع جدید علامہ ذہبی نے کہا اس حدیث کی سند ضعیف ہے، حاکم نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے)

مضامین کا خلاصہ

رکوع ۱:۔رکوع کے شروع میں مومنوں کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔اس کے بعد تخلیق انسان کے مراحل اور آسمانوں کی تخلیق کا بیان ہے آخر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کے انعامات مذکور ہیں۔

رکوع ۲: حضرت نوح (علیہ السلام) کی قوم کی حالت اور طوفان نوح کا بیان ہے۔

رکوع ۳: قوم عاد یا ثمود کا واقعہ، دیگر امم سابقہ کا ذکر اور آخر میں موسیٰ و ہارون اور ابن مریم (علیہم السلام) کے واقعات مذکور ہیں۔

رکوع ۴: اکل حلال اور عمل صالح کی تاکید کے بعد مومنوں کی صفات کا ذکر ہے۔پھر آخرت سے غفلت کا انجام اور متکبرین کی جہالت و گمراہی کا بیان ہے۔

رکوع ۵: اللہ کے انعامات اور اس کی حاکمیت کے بیان کے بعد توحید کے دلائل مذکور ہیں۔

رکوع ۶: آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دعا کی تلقین، قیامت کا حال اور کفار کا اعتراف گناہ مذکور ہے۔پھر کفار کی عذاب جہنم سے نجات پانے کی تمام امیدیں ٹوٹ جانے کا ذکر ہے۔دنیا کی زندگی کی حقیقت اور کافروں کے باطل گمان کا بیان ہے۔

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ
فٰعِلُوْنَ ۙ﴿۴﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰٓى

أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝٦
فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝٧

بیشک ایمان والے کامیاب ہو گئے۔(۱) جو اپنی نماز میں عاجزی اختیار کرتے ہیں ۔(۲) اور جو لغو باتوں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔(۳) اور جو زکوۃ ادا کرتے ہیں۔ (۴) اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔(۵) مگر اپنی بیویوں یا کنیزوں سے (مباشرت کرنے میں) پس یقیناً (اس میں) وہ قابل ملامت نہیں ہیں۔(٦) اور جس نے ان کے علاوہ کسی اور کو طلب کیا تو وہی لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔(۷)

شان نزول: (آیت) "۔الذین ھم فی صلاتھم خشعون"۔(الخ)

امام حاکمؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس وقت نماز پڑھتے تو اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھاتے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی یعنی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں، اس کے نزول کے بعد سے آپ نے اپنا سر مبارک جھکا لیا اور اسی روایت کو ابن مردویہؒ نے انھیں الفاظ میں روایت کیا ہے کہ آپ اپنی نماز میں التفات فرماتے تھے اور سعید بن منصورؒ نے ابن سیرین سے اسی کو بایں طور روایت کیا ہے کہ آپ اپنی نظر گھمایا کرتے تھے، اس پر یہ

آیت نازل ہوئی اور ابن ابی حاتمؒ نے ابن سیرین سے مرسلا روایت کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ حالت نماز میں اپنی نگاہوں کو آسمان کی طرف اٹھایا کرتے تھے تب یہ آیت نازل ہوئی۔

اس سورت کی ابتدائی آیات میں مومنوں کی سات صفات کا ذکر کیا گیا ہے جن پر عمل کرنے سے ان کو فلاح اور جنت الفردوس حاصل ہوگی۔ان میں سے پہلی صفت خشوع ہے۔

" قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ " میں یہ بتایا ہے کہ بعد میں ذکر کردہ صفات والے مومن یقیناً کامیاب ہوگئے،مگر یہ نہیں بتایا کہ کس چیز میں کامیاب ہوگئے۔یہ بات ان آیات کے آخر میں بیان فرمائی ہے، فرمایا:(اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ)[المؤمنون:۱۰،۱۱] "یہی لوگ ہیں جو وارث ہیں۔جو فردوس کے وارث ہونگے۔" یعنی کامیابی سے مراد آخرت کی کامیابی ہے، کیونکہ حقیقی زندگی وہی ہے،فرمایا:(وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ)[العنکبوت:٦٤] "اور بیشک آخری گھر،یقیناً وہی اصل زندگی ہے،اگر وہ جانتے ہوتے۔" دنیا کی زندگی نہ حقیقی زندگی ہے اور نہ اس کی کامیابی حقیقی کامیابی،فرمایا:(فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ)[آل عمران:۱۸۵] "پھر جو شخص آگ سے دور کردیا گیا اور جنت میں داخل کردیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہوگیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں۔"

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ : "خٰشِعُوْنَ "اس کے معنی ہیں ڈرنے والے اور سکون اختیار کرنے والے۔نماز میں خشوع اسے حاصل ہوسکتا ہے جس کا دل نماز کے لیے فارغ ہو چکا ہو،ماسوا سے منقطع ہوکر نماز ہی میں مشغول ہوگیا ہو اور نماز کو دوسرے کاموں پر ترجیح دیتا ہو،ارشاد فرمایا:(حٰفِظُوْا

عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ)[البقرۃ:۲۳۸]"سب نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی اور اللہ کے لیے فرماں بردار ہو کر کھڑے رہو۔"

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب نماز پڑھتے تھے تو اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھا لیا کرتے تھے، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی: (الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ)[المؤمنون:۲] تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (نماز میں) اپنا سر جھکا لیا۔[۱]

سیدنا ابو ہریرہؓ سے ایک لمبی حدیث مروی ہے کہ سیدنا جبرائیل (علیہ السلام) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا: "احسان کیا ہے؟" رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یہ خیال رہے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔"[۲]

سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا، نماز میں ادھر ادھر دیکھنا کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا: "یہ تو ڈاکا ہے جو شیطان بندے کی نماز پر ڈالتا ہے۔"[۳]

سیدنا انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ وہ نماز میں اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں۔" آپ نے اس سلسلہ میں بہت سخت الفاظ ارشاد فرمائے، یہاں تک کہ آپ نے فرمایا: "ان کو اس سے باز آجانا چاہیے، ورنہ ان کی آنکھیں اچک لی

۱۔[مستدرک حاکم:۲/۳۹۳، ح:۳۴۸۳]

۲۔[بخاری، کتاب الإیمان، باب سؤال جبرائیل النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عن الإیمان۔۔الخ:۵۰۔ مسلم، کتاب الإیمان، باب الإیمان ماھو؟ وبیان خصالہ:۹]

۳۔[بخاری، کتاب الصلوۃ، باب الالتفات فی الصلوۃ:۷۵۱]

جائیں گی۔"[1]

سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک ایسی چادر میں نماز ادا فرمائی جس میں نقش ونگار تھے۔آپ نے اس کے نقش ونگار پر ایک نظر ڈالی اور جب نماز پڑھ چکے تو فرمایا: "میری یہ چادر جا کر ابوجہم کو دے آؤ اور ان کی سیاہ چادر لے آؤ، اس چادر نے ابھی مجھے میری نماز سے غافل کر دیا تھا۔"[2]

سیدنا زید بن ارقمؓ بیان کرتے ہیں کہ پہلے ہم نماز پڑھتے وقت بات کر لیا کرتے تھے، ہم میں سے کسی کو اپنے بھائی سے بات کرنے کی ضرورت ہوتی تو وہ (نماز ہی میں) بات کر لیتا، یہاں تک کہ یہ آیت اتری: (حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ)[البقرۃ:۲۳۸] "سب نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی اور اللہ کے لیے فرماں بردار ہو کر کھڑے رہو" اس کے بعد ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔[3]

سیدنا رفاعہ بن رافعؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک دن مسجد میں تشریف فرما تھے اور ہم بھی آپ کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی، جو دیہاتی محسوس ہوتا تھا، وہ (مسجد میں) داخل ہوا اور اس نے نماز پڑھنا شروع کی، اس نے اپنی نماز میں جلدی کی، پھر وہ نماز ادا کر چکا تو نبی

۱۔[بخاری، کتاب الصلوۃ، باب رفع البصر إلی السماء فی الصلوۃ:۷۵۰۔مسلم، کتاب الصلوۃ، باب النھی عن رفع البصر إلی السماء فی الصلوۃ:۴۲۹، عن أبی ہریرہؓ]

۲۔[بخاری، کتاب الصلوۃ، باب إذا صلی فی ثوب لہ أعلام۔۔الخ:۳۷۳۔مسلم، کتاب المساجد، باب کراہیۃ الصلوۃ فی ثوب لہ أعلام:۵۵۶/۶۲]

۳۔[بخاری، کتاب التفسیر، باب (وقوموا للہ قنتین):۴۵۳۴۔مسلم، کتاب المساجد، باب تحریم الکلام فی الصلوۃ۔۔الخ:۵۳۹]

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (کے پاس آیا اور آپ) کو سلام کہا، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تجھ پر بھی سلامتی ہو، جاؤ پھر سے نماز پڑھو کہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔" سو وہ گیا اور پھر (پہلے جیسی) نماز پڑھی، پھر آیا اور آپ کو سلام کہا۔ تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تجھ پر بھی سلامتی ہو، جاؤ نماز پڑھو کہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔" (اس طرح اس نے دو یا تین مرتبہ نماز دہرائی اور ہر مرتبہ آ کر آپ کو سلام کیا اور آپ نے وہی جواب دیا، پھر جب اس نے وجہ پوچھی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسے تفصیلاً نماز کا طریقہ سکھایا کہ ہر رکن میں اعتدال واطمینان ہونا چاہیے)۔ [1]

اہل ایمان کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ لغو سے اجتناب کرتے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "آدمی کے اسلام کے اچھا ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ بے مقصد چیزیں چھوڑ دے۔" [2]

اہل ایمان کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ زکوۃ ادا کرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔" [3]

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "مجھے حکم ہوا ہے کہ لوگوں سے (یعنی کافروں سے) اس وقت تک لڑوں جب تک وہ یہ گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی

۱۔ [ترمذی، کتاب الصلوۃ، باب ماجاء فی وصف الصلوۃ: ۳۰۲]

۲۔ [ترمذی، کتاب الزہد، باب [حدیث: من حسن إسلام المرء۔۔الخ]: ۲۳۱۷]

۳۔ [بخاری، کتاب الإیمان، باب دعائکم إیمانکم۔۔الخ: ۸۔ مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان أرکان الإسلام ودعائمہ العظام: ۱۶]

معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے رسول ہیں، نماز ادا کریں، زکوۃ دیں اور جب وہ یہ کام کرنے لگیں تو انھوں نے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو مجھ سے بچا لیا مگر اسلام کا حق (ان سے لیا جائے گا) اور ان (کے دل کی باتوں) کا حساب اللہ کے ذمے ہوگا۔"[1]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دیہاتی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور کہنے لگا، مجھے کوئی ایسا کام بتایئے کہ جب میں وہ کرلوں تو جنت میں چلا جاؤں۔ آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہو اور اس کے ساتھ ذرا سا بھی شرک نہ کرو، فرض نماز ادا کرتے رہو، فرض زکوۃ ادا کرتے رہو اور رمضان کے روزے رکھتے رہو۔" دیہاتی کہنے لگا، اس ذات کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں ان کاموں پر میں کوئی اضافہ نہیں کروں گا۔ جب وہ پیٹھ موڑ کر چلا تو آپ نے فرمایا: "اگر کسی کو جنتی آدمی دیکھنا اچھا لگتا ہو تو وہ اس شخص کو دیکھ لے۔"[2]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ جس کو مال دے اور وہ اس کی زکوۃ ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اس کا مال ایک گنجے سانپ کی شکل بن کر، جس کی آنکھوں پر دو کالے داغ ہونگے، اس کے گلے کا طوق بن جائے گا، پھر اس کی دونوں باچھیں پکڑ کر کہے گا، میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔" اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی: (وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ) [آل عمران: ۱۸۰] "اور وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے

---

[1] [بخاری، کتاب الإیمان، باب (فإن تابوا وأقاموا الصلوۃ وآتوا الزکوۃ فخلوا سبیلھم): ۲۵۔ مسلم، کتاب الإیمان، باب الأمر بقتال الناس حتی یقولوا لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ۔۔الخ: ۲۲]

[2] [بخاری، کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکوۃ: ۱۳۹۷]

انھیں اپنے فضل سے دیا ہے، ہرگز گمان نہ کریں کہ وہ ان کے لیے اچھا ہے، بلکہ وہ ان کے لیے برا ہے، عنقریب قیامت کے دن انھیں اس چیز کا طوق پہنایا جائے گا۔"[1]

اہل ایمان کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی پاکدامنی کی حفاظت کرتے ہیں سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا: "تم کسی کو اللہ کا شریک ٹھہراؤ، حالانکہ تم کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔" میں نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! پھر کونسا گناہ؟ آپ نے فرمایا: "تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تیرے ساتھ کھائے گی۔" میں نے عرض کی، پھر کونسا گناہ؟ آپ نے فرمایا: "یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرو۔"[2]

سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "انسان کی تقدیر میں اس کے زنا کا حصہ لکھ دیا گیا ہے، جسے وہ لامحالہ (ضرور) کر کے رہے گا۔ تو آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، کانوں کا زنا سننا ہے، زبان کا زنا بات کرنا ہے، ہاتھ کا زنا پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا چلنا ہے، جبکہ دل خواہش اور تمنا کرتا ہے اور شرم گاہ اس (خواہش) کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب۔"[3]

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۱ ﴾

۱۔ [بخاری، کتاب الزکوۃ، باب إثم مانع الزکوۃ۔۔الخ: ۱۴۰۳]

۲۔ [بخاری، کتاب الحدود، باب إثم الزناۃ۔۔الخ: ۶۸۱۱۔ مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان کون الشرک أقبح الذنوب۔۔الخ: ۸۶]

۳۔ [مسلم، کتاب القدر، باب قدر علی ابن آدم حظہ من الزنا وغیرہ: ۲۶۵۷]

اور جو لوگ اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی رعایت کرنے والے ہیں۔(۸) اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔(۹) یہی لوگ (جنت کے) وارث ہونے والے ہیں۔(۱۰) جو جنت الفردوس کے وارث ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔(۱۱)

اہل ایمان کی پانچویں صفت یہ ہے کہ مومن جس طرح اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح ان میں یہ بھی اوصاف پائے جاتے ہیں کہ وہ امانت کی حفاظت اور عہد کی پاسداری کرتے ہیں۔امانت سے مراد صرف سونا چاندی اور کرنسی کی حفاظت نہیں بلکہ اس سے مراد ہر قسم کی امانت ہے۔ بیشک وہ کسی منصب کے حوالے سے اس پر عائد ہونے والی ذمہ داری ہو۔

سیدنا ابوسعید خدری ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "قیامت کے دن (جن امانتوں کے سلسلہ میں باز پرس کی جائے گی ان میں) اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑی امانت یہ ہے کہ میاں بیوی آپس میں صحبت کریں، پھر خاوند اپنی بیوی کی راز کی باتوں کو (دوست احباب کے سامنے) ظاہر کرے۔"[1]

اہل ایمان کی چھٹی صفت یہ ہے کہ جس طرح ہر قسم کی امانت کا خیال رکھنا فرض اور مومن کی صفت ہے اسی طرح جائز کاموں پر کیے گئے عہد کی ذمہ داری بھی پوری کرنی چاہیے۔عہد سے پہلی مراد عقیدہ توحید کے حوالے سے کیا ہوا وہ عہد ہے جو ہر انسان نے عالم ارواح میں اپنے رب کے ساتھ کیا تھا (الاعراف:

۱۔[مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم إفشاء سر المرأۃ: ۱۴۳۷/۱۲٤]

(۱۷۲

اس میں وہ عہد و قیود بھی شامل ہیں جو ایک انسان دوسرے کے ساتھ اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے۔ لوگوں کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی پاسداری کرنا۔ نا صرف آدمی کا ایمان اور اس کی صفت ہے اس کا آخرت میں اجر ملے گا بلکہ دنیا میں بھی اسے اچھی شہرت اور لوگوں کا اعتماد حاصل ہونے پر اسے سیاست، تجارت اور معاملات میں فائدہ پہنچتا ہے۔

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "منافق کی تین نشانیاں ہیں: 1 جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ 2 جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔ 3 اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔"[1]

اہل ایمان کی ساتویں صفت یہ ہے کہ وہ نماز کی پابندی کرتے ہیں یعنی سستی نہیں کرتے اور نماز کو اپنے وقت میں پڑھتے ہیں یعنی بلا وجہ تاخیر یا قضا نہیں کرتے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں عرض کی، یا رسول اللہ! کونسا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہے؟ آپ نے فرمایا: "نماز وقت پر ادا کرنا۔" میں نے عرض کی، پھر کونسا؟ فرمایا: "پھر والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔" میں نے عرض کی، پھر کونسا؟ فرمایا: "اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔"[2]

سیدنا ثوبانؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "سیدھے راستے پر قائم رہو اور تم (کما حقہ) قائم نہیں رہ سکو گے اور خوب جان لو کہ تمہارے اعمال میں سے سب سے بہتر نماز

۱۔ [بخاری، کتاب الإیمان، باب علامات المنافق: ۳۳۔ مسلم، کتاب الإیمان، باب خصال المنافق: ۵۹]

۲۔ [بخاری، کتاب الأدب، باب البر والصلۃ: ۵۹۷۰۔ مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان کون الإیمان باللہ تعالیٰ أفضل الأعمال: ۸۵]

ہے اور وضو کی حفاظت صرف مومن ہی کر سکتا ہے۔"[1]

سیدنا ابو ہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، نماز قائم کرے اور رمضان کے روزے رکھے تو اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے، خواہ اس نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی ہو یا وہیں رہا ہو جہاں پیدا ہوا۔" صحابہ نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! کیا ہم لوگوں کو یہ بات بتا نہ دیں؟ آپ نے فرمایا: "جنت میں سو درجے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کر رکھے ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا فاصلہ آسمان اور زمین کے درمیان ہے، سو جب تم اللہ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگو، وہ جنت کا درمیانی اور سب سے بلند درجہ ہے اور اس کے اوپر رحمن کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی سب نہریں نکلتی ہیں۔"[2]

سیدنا انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ربیع بنت براءؓ کا بیٹا حارثہ بن سراقہؓ بدر کے دن ایک نامعلوم تیر سے شہید ہو گیا تو وہ آپ کے پاس آ کر کہنے لگیں، مجھے حارثہ کا حال بتایئے، اگر وہ جنت میں ہے تو میں (ثواب کی امید رکھوں اور) صبر کروں اور اگر کہیں اور ہے تو اس کے لیے رو (رو کر اپنا غم ہلکا کر) لوں۔ آپ نے فرمایا: "ام حارثہ! جنت میں بہت سے درجے ہیں اور تیرا بیٹا تو فردوس بریں میں داخل ہوا ہے، جو سب سے اعلیٰ جنت ہے۔"[3]

---

[1]۔ [ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ وسننہا، باب المحافظۃ علی الوضوء: ۲۷۷۔ مسند أحمد: ۵/ ۲۸۲، ح: ۲۲۴۹۵]

[2]۔ [بخاری، کتاب التوحید، باب (وکان عرشہ علی الماء)۔۔ الخ: ۷۴۲۳]

[3]۔ [بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب من أتاہ سہم غرب فقتلہ: ۲۸۰۹]

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ
نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۖ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا
الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ
لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ
الْخٰلِقِيْنَ ؕ﴿۱۴﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ؕ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾ ﴾

بیشک ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ (غذا اور سیل) سے پیدا کیا۔(۱۲) پھر ہم نے اس کو نطفہ بنا کر ایک محفوظ جگہ (رحم مادر) میں رکھ دیا۔(۱۳) پھر ہم نے نطفہ کو جما ہوا خون بنا دیا پھر ہم نے اس جمے ہوئے خون کو گوشت کا لوتھڑا بنا دیا، پھر ہم نے اس لوتھڑے کو گوشت کی بوٹی بنا دیا، پھر اس بوٹی سے ہڈیاں پیدا کر دیں، پھر اس کے بعد دوسری تخلیق میں انسان پیدا کر دیا، پس اللہ بڑا ہی بابرکت ہے جو سب سے حسین پیدا کرنے والا ہے۔(۱۴) پھر اس کے بعد یقیناً تم سب مرنے والے ہو۔(۱۵) پھر یقیناً تم قیامت کے روز اٹھا کھڑے کیے جاؤ گے۔(۱۶)

روایت ہے کہ جب حضرت عمر نے المؤمنون: ۱۵ کو یہاں تک سنا پھر اس کے بعد دوسری تخلیق میں انسان کو پیدا کر دیا تو ان کے منہ سے بے اختیار نکلا فتبارک اللہ احسن الخالقین تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ آیت اسی رحنا زل ہوئی ہے، حافظ ابن کثیر نے اس تفسیر کو امام ابن ابی حاتمؒ سے روایت کیا ہے۔ (۱)

علامہ قرطبی مالکیؒ نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن ابی سرح نے اس طرح کہا تھا اس نے کہا فتبارک اللہ احسن اخالقین تو یہ آیت اسی طرح نازل ہوگئی وہ مرتد ہوگیا اس نے کہا مجھ پر بھی قرآن اسی طرح نازل ہوتا ہے جس طرح سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے رد میں یہ آیت نازل فرمائی:

(الانعام: ۹۳) اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ افتراء باندھتا ہے اور جو کہتا ہے کہ مجھ پر وحی کی گئی ہے حالانکہ اس پر کچھ وحی کی گئی اور جو کہتا ہے میں عنقریب اس طرح نازل کروں گا جس طرح اللہ نے نازل کیا ہے۔ (۲)

سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا کیا، جسے اس نے تمام زمین سے جمع فرمایا تھا۔ چنانچہ آدم کی اولاد اس مٹی کے لحاظ سے (مختلف) ہوئی ہے، کئی سرخ ہیں اور کئی سفید، کئی سیاہ ہیں اور کئی ان کے بین بین، کئی نرم خو ہیں اور کئی سخت طبیعت، کئی بری طبیعت کے مالک ہوتے ہیں اور کئی اچھی اور عمدہ طبیعت

۱۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۶۹ مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۹ھ)

۲۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۴ ص ۱۰۳ مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

والے۔"[1]

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تم میں سے ہر ایک (بطور نطفہ) اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دن جمع کیا جاتا ہے، پھر چالیس دن تک وہ جمے ہوئے خون کی شکل میں رہتا ہے، پھر چالیس دن تک گوشت کا لوتھڑا، پھر اللہ تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتے کو بھیجتا ہے اور اسے چار باتیں لکھنے کا حکم دیتا ہے، یعنی اس کے اعمال، اس کی روزی، اس کی عمر اور اس کا نیک بخت یا بد بخت ہونا، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے، پھر تم میں سے کوئی ایسا ہوتا ہے جو ساری عمر نیک کام کرتا رہتا ہے اور جنت اس سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر رہ جاتی ہے، پھر تقدیر کا لکھا غالب آجاتا ہے اور وہ دوزخیوں کا کام کر بیٹھتا ہے (اور دوزخ میں جاتا ہے) اور کوئی بندہ ساری عمر برے کام کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ دوزخ اس سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر رہ جاتی ہے کہ پھر تقدیر کا لکھا غالب آجاتا ہے اور وہ جنتیوں کے کام کرتا ہے (اور جنت میں جاتا ہے)۔"[2]

سیدنا حذیفہ بن اسیدؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جب نطفے کو رحم میں چالیس یا پینتالیس دن گزر جاتے ہیں تو ایک فرشتہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے رب! یہ نیک ہوگا یا بد؟ (تو ان دونوں کے بارے میں جو جواب ملتا ہے) وہ لکھ لیا جاتا ہے، پھر پوچھتا ہے، اے میرے رب! یہ مرد ہوگا یا عورت؟ (تو ان دونوں کے بارے میں جو پروردگار کہتا ہے) وہ لکھ لیا جاتا ہے، پھر اس کا عمل، اس کی عمر، اس کی موت اور اس کا رزق لکھ دیا جاتا ہے، پھر وہ کتاب لپیٹ دی جاتی

۱۔ [أبوداؤد، کتاب السنۃ، باب فی القدر: ۴۶۹۳۔ ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب من سورہ البقرۃ: ۲۹۵۵۔ مسند أحمد: ۴/ ۴۰۰، ح: ۱۹۶۰۱]

۲۔ [بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ: ۳۲۰۸۔ مسلم، کتاب القدر، باب کیفیۃ خلق ال آدمی فی بطن أمہ۔۔ الخ: ۲۶۴۳]

ہے، تو اس کے بعد اس میں نہ کسی چیز کا اضافہ کیا جاتا ہے اور نہ کمی کی جاتی ہے۔"[1]

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ
غٰفِلِيْنَ ﴿١٧﴾ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي
الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿١٨﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ
جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۖ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا
تَاْكُلُوْنَ ﴿١٩﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ
وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُسْقِيْكُمْ
مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٢١﴾
وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿٢٢﴾ ﴾

اور بلاشبہ ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنا دیئے اور ہم مخلوق سے بے خبر نہیں ہیں۔(۱۷) اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا ایک اندازے کے مطابق اور پھر ہم نے اس کو زمین میں ٹھہرا دیا۔ اور یقیناً ہم اس (پانی) کے لے جانے پر بھی

۱۔[مسلم، کتاب القدر، باب کیفیۃ خلق ال آدمی فی بطن أمہ۔۔الخ:۲٦٤٤]

پوری طرح قادر ہیں۔(۱۸) پھر اس پانی سے ہم تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغات پیدا کرتے ہیں، تمہارے لیے ان (باغوں) میں بہت سے پھل (پیدا ہوتے) ہیں اور ان سے تم کھاتے ہو۔(۱۹) اور وہ درخت (زیتون کا) جو طور سینا سے نکلتا ہے اور کھانے والوں کے لیے تیل اور سالن لے کر اگتا ہے۔ (۲۰) اور بیشک تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے ہم تمہیں ان کے پیٹوں میں سے دودھ پلاتے ہیں اور تمہارے لیے ان میں (اور بھی) بہت سے دوسرے فائدے ہیں اور ان میں سے (بعض) کو تم کھاتے ہو۔(۲۱) اور ان پر اور کشتیوں پر تم سواری بھی کرتے ہو۔(۲۲)

اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کی تخلیق کا ذکر فرما کر اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ ہم نے جو کچھ پیدا کیا ہے اس سے غافل نہیں ہیں اس فرمان میں آسمانوں کی بجائے "طرائق" کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے بارے میں اہل علم نے تین آراء کا اظہار فرمایا ہے۔[1] "سبع طرائق" کا معنیٰ ہے اوپر نیچے سات آسمان[2] "سبع طرائق" سے مراد سات قرأتیں ہیں۔[3] "سبع طرائق" سے مراد آسمان کے وہ دروازے ہیں جن کے ذریعے ملائکہ زمین پر آتے ہیں اور پھر آسمان پر چڑھتے ہیں۔ بہرحال ان سے مراد آسمان ہوں یا کوئی دوسری چیز اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نا صرف اپنی مخلوق سے پوری طرح باخبر ہے بلکہ وہ اپنی مخلوقات کی ہر قسم کی ضروریات کو جانتا ہے اور کما حقہ ان کی ضروریات پوری کرنے والا ہے۔

بعض مفسرین نے غافلین کا معنیٰ کیا ہے کہ اس نے آسمانوں اور کسی چیز کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔
فرمایا کہ ہم نے اس پانی کے ذریعے سے تمہارے لیے پھلوں کے باغات پیدا کیے، جن میں مختلف ذائقے اور رنگ کے پھل ہوتے ہیں اور انھی پھلوں میں سے لوگ کھاتے ہیں۔ آگے فرمایا کہ ہم نے ایک اور درخت پیدا کیا ہے جو طور سینا کے اردگرد کے علاقوں میں کثرت سے ہوتا ہے، یعنی زیتون کا درخت، جس سے تیل نکلتا ہے اور جسے کھانے والے سالن کے طور پر استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ○ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ) [والتین: ۱، ۲] "قسم ہے انجیر کی! اور زیتون کی! اور طور سینین کی!" سیدنا عمر بن خطاب ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "زیتون کو سالن بناؤ اور بطور تیل استعمال کرو کیونکہ یہ مبارک درخت سے نکلتا ہے۔"[1]
نباتات کی طرح حیوانات بھی انسان ہی کی خدمت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں انہیں اپنا معبود یا مخدوم سمجھ لینا انسان کی انتہائی پستی پر دلالت کرتا ہے لیکن جب کوئی قوم من حیث القوم کسی گھٹیا سے گھٹیا کام کو بھی کرنے لگ جائے اور اس کو پوری قوم یا کثیر تعداد میں لوگوں کی حمایت حاصل ہو جائے تو اس کی کمزوری اور گھٹیا پن کی طرف بہت کم دھیان جاتا ہے۔ ذرا غور کرو کہ موشیوں کے شکم میں کیا بھرا ہے؟ گوبر، پیشاب اور اسی طرح کا بہت سارا گند ہی تو ہے پھر یہ کسی کی جلوہ نمائی ہے کہ اس میں تمہارے پینے کے لیے وہ ایک ایسی چیز نکالتا ہے جو اپنے رنگ، ذائقہ، بو اور تاثیر میں اپنی مثال آپ ہے دنیا میں جتنے مشروبات استعمال ہوتے ہیں سب میں سے پہلا نمبر یقیناً اس کو حاصل ہے کہ وہ غذا کی غذا، دوا کی دوا اور مشروب کا مشروب ہے کہ اس سے صرف پیاس ہی نہیں بجھتی بلکہ اس میں ایسی غذائیت رکھی دی گئی

---

[1] [ابن ماجہ، کتاب الأطعمۃ، باب الزیت: ۳۳۱۹۔ ترمذی، کتاب الأطعمۃ، باب ماجاء فی أکل الزیت: ۱۸۵۱]

ہے جو کسی دوسری غذا میں شاید ہی رکھی گئی ہو پھر ان مویشیوں میں صرف یہی فائدہ نہیں کہ وہ دودھ دیتے ہیں علاوہ ازیں بھی بیشمار فوائد ہیں جیسے سواری کے جانوروں کو سواری کے لیے اور بوجھ لادنے کے لیے استعمال کرنا' حلال جانوروں کو بطور غذا کھانا' ان کے بالوں سے طرح طرح کا لباس تیار کرنا' ان کے چمڑوں سے اپنے استعمال کی سینکڑوں چیزیں تیار کر لینا وغیرہ وغیرہ۔

خشکی کے جہازوں کی مناسبت سے بحری جہازوں کی نعمت کا ذکر بھی فرما دیا ہے۔ "سوار ہوتے ہو" کے بجائے "سوار کیے جاتے ہو" کا مطلب یہ ہے کہ اونٹ (اور ہاتھی) جیسے عظیم الجثّہ جانوروں پر سوار ہونا اور انھیں اپنا تابع فرمان بنانا تمہارے بس کی بات نہیں، بلکہ ان پر سوار کرنا اور انھیں تمہارے تابع فرمان بنا دینا ہمارا کام ہے، یقین نہ ہو تو ان سے بدرجہا چھوٹے جانوروں، مثلاً ہرن، بھیڑیے، لومڑی، گیدڑ اور چیتے وغیرہ کو ان کی طرح مانوس کر کے دکھاؤ۔ اسی طرح ہماری عظیم الشان مخلوق سمندر کہ جس کے مقابلے میں تم اتنے بھی نہیں جتنا صحرا کے مقابلے میں ریت کا ذرہ، اس پر سوار ہونا اور اس کا تمہیں اپنے سینے پر اٹھائے رکھنا تمہارے بس کی بات نہیں، یہ تو ہم ہیں جو تمہیں کشتیوں میں سوار کر کے اسے تمہارے تابع کر دیتے ہیں، اگر یقین نہ ہو تو ان طوفانوں کو یاد کرو جن کی بلاخیزی سے پہاڑوں جیسے جہاز آنکھ جھپکنے میں اس کی آغوش میں ڈوب جاتے ہیں۔

﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ

يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۖ مَّا سَمِعْنَا
بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا
بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾

اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو انہوں نے ان سے کہا اے میری قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں کیا تم اس سے ڈرتے نہیں۔ (۲۳) تو اس کی قوم کے سرداروں نے جنہوں نے کفر کیا تھا کہنے لگے یہ شخص تو بس تمہارے ہی جیسا بشر ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ تم پر برتری حاصل کر لے۔ اگر اللہ (رسول بھیجنا) چاہتا تو فرشتوں کو اتار دیتا۔ ایسی بات تو ہم نے اپنے اگلے باپ دادا سے کبھی سنی ہی نہیں۔ (۲۴) بس یہ ایک (ایسا) آدمی ہے جس کو جنون ہو گیا ہے سو ایک وقت تک اس کا انتظار کرو۔ (۲۵)

زیر نظر آیت سے گزشتہ دعوتوں سے استدلال کر کے حوادث ماضیہ سے حال میں عبرت پکڑنے کے لیے سیدنا نوح (علیہ السلام) کی دعوت کا ذکر شروع کیا ہے اور سب سے پہلے درس توحید ہی کا ذکر کیا جو سارے انبیاء کرام (علیہ السلام) کا مشترک درس تھا اور سب نے اولیت اس پیغام کو دی اور یہی وہ چیز ہے جو ساری مذہبی بیماریوں کی اصل اور جڑ ہے۔ سیدنا نوح (علیہ السلام) کی قوم کے جواب کو بھی بیان

کیا گیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ آج مکہ کے لوگ جو جواب اے پیغمبر اسلام! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دے رہے ہیں یہ کوئی نیا نہیں بلکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے تقریبا سارے نبیوں کو اسی طرح جواب سنایا گیا تھا پھر آپ کی قوم کا انجام بھی بتایا گیا تا کہ خود نبی اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی یہ بات سمجھ لیں کہ اگر سیدنا نوح (علیہ السلام) کی قوم کا یہ حال ہوا تھا تو یقینا اس امت کی مخالفت کا نتیجہ بھی وہی رہے گا جو سیدنا نوح (علیہ السلام) کی امت کا ہوا یہ سرگزشت قبل ازیں سورہ الاعراف آیات ۵۹ تا ٦٤ ' سورہ یونس ۷۱ تا ۷۲ ' سورہ ہود آیات ۲۵ تا ۴۸ ' سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۳ اور سورہ الانبیاء آیات ٧٦ تا ۷۷ میں بیان ہو چکی ہیں۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ: معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کے واضح طور پر الگ الگ قبیلے تھے اور نوح (علیہ السلام) کا اپنا قبیلہ انکار میں پیش پیش تھا۔ اس لیے انکار اور اعتراض کے اپنوں کی طرف سے ہونے کی شناعت کو واضح کرنے کے لیے "مِنْ قَوْمِهٖ" فرمایا۔ (بقاعی)

"مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ: مفسر رازی نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے پانچ شبہات ذکر فرمائے، مگر جواب کسی کا نہیں دیا، کیونکہ معمولی سے غور کے ساتھ ان کا بے کار ہونا سمجھ میں آجاتا ہے۔" ان کا پہلا شبہ یہ تھا کہ یہ تو تمہارے جیسا بشر ہے۔ بقاعی نے فرمایا: "انھوں نے کسی انسان کا نبی ہونا نہیں مانا تو لازم تھا کہ کسی مٹی کا انسان ہونا بھی نہ مانتے، پانی کے کسی قطرے کا علقہ ہونا اور خون کی کسی پھٹکی کا مضغہ ہونا بھی نہ مانتے۔" ابن جزیؒ نے التسہیل میں فرمایا: "کس قدر تعجب ہے کہ انھوں نے بشر کے رسول ہونے کو نہیں مانا، مگر پتھر کے رب ہونے کو مان لیا۔" مشرک کی عقل ایسی ہی ہوتی ہے، ہمارے زمانے کے بعض لوگ جو جدّی پشتی مسلمان ہیں، آبا و اجداد سے سن کر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نبی

مانتے ہیں مگر بشر نہیں مانتے۔ پہلے لوگوں کا کہنا تھا کہ بشر رسول نہیں ہوسکتا اور ان کا کہنا ہے کہ رسول بشر نہیں ہوسکتا۔ نتیجہ دونوں باتوں کا ایک ہی ہے۔ قرآن نے بشر کے رسول نہ ہونے یا رسول کے بشر نہ ہونے کا بار بار رد فرمایا ہے۔ دیکھیے سورہ اعراف (٦٣ تا ٦٩)، یونس (٢)، ہود (٢٧ تا ٣١)، یوسف (١٠٩)، رعد (٣٧)، ابراہیم (١٠، ١١)، نحل (٤٣)، بنی اسرائیل (٩٤، ٩٥)، کہف (١١٠)، انبیاء (٣)، مومنون (٣٣، ٣٤، ٤٧)، فرقان (٧ تا ٢٠)، شعراء (١٥٤، ١٨٦) اور سورہ یٰس (١٥)۔

يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ : یہ دوسرا شبہ ہے جو کافر سرداروں نے انبیاء کو عوام میں بے وقعت بنانے کے لیے پیش کیا کہ یہ تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اکثر کفار نے اپنے اپنے انبیاء کے بارے میں یہی بات کہی کہ یہ اقتدار کے بھوکے ہیں۔ فرعون اور اس کے سرداروں نے موسیٰ اور ہارون (علیہ السلام) کو یہ طعنہ دیا تھا: (قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ)[يونس: ٧٨] ”انھوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اس سرزمین میں تم دونوں ہی کو بڑائی مل جائے؟“ گویا سرداری اور برتری ان مشرکوں ہی کا مادری و پدری ورثہ ہے، یہ کسی اور کا حق نہیں۔ جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ اگر رسول اپنے منصب کی وجہ سے برتری چاہتے ہیں تو برتری کا حامل ہونا ان کا حق ہے، تاکہ کسی کو ان کے اتباع میں عار نہ ہو اور اگر وہ تکبر اور فخر و غرور کے لیے برتری چاہتے ہیں تو یہ ان پر بہتان ہے، کیونکہ ان سے بڑھ کر کوئی متواضع نہیں ہوتا۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً: یہ تیسرا اعتراض ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ اللہ کو مانتے تھے، مگر اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے۔ نوح (علیہ السلام) کی طرف سے ایک اللہ کی عبادت کا حکم سن کر بہانہ گھڑا کہ اگر اللہ چاہتا کہ کوئی رسول

بھیجے تو وہ انسان کے بجائے کوئی فرشتے بھیج دیتا۔ یہ بھی درحقیقت بشر کی نبوت سے انکار ہے۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ مالک مرضی والا ہے، وہ جسے چاہے، جس کام کے لیے چاہے چن لیتا ہے۔ وہ مالک ہی کیا ہوا جو تمہارے چاہنے کا پابند ہو۔ مَّا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِىۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِيۡنَ : یہ چوتھا اعتراض ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح (علیہ السلام) سے پہلے جاہلیت کا طویل عرصہ گزرا تھا۔ پہلی تینوں باتوں میں نوح (علیہ السلام) کے رسول ہونے کا انکار تھا اور یہ اس دعوت کا انکار ہے جو نوح (علیہ السلام) لے کر آئے تھے۔ یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنے کی بات ہم نے نہیں سنی اور نہ یہ سنا ہے کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے یا سفارشی بنانے کے لیے بھی کسی کی عبادت نہ کی جائے۔ کفار کے سرداروں کی یہ بات بھی اس لیے جواب کے قابل نہیں کہ اس کی بنیاد تقلید ہے، جب کہ تقلید سراسر جہل ہے اور جاہلوں کا جواب خاموشی اور سلام متارکہ ہے، جیسا کہ فرمایا: (وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الۡجٰهِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا)[الفرقان: ۶۳] ”اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہے۔“ (دیکھیے بقرہ: ۱۷۰) بھلا بتاؤ اس سے بڑی جہالت کیا ہوگی کہ جو چیز ہم نے سنی نہیں وہ ہے ہی نہیں؟

اِنۡ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ : ”جِنَّة“ جنون، دیوانگی۔ ان کی پانچویں بات یہ بہتان ہے جو انھوں نے لگایا، یعنی اس کا یہ کہنا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے رسول بنایا ہے، پھر وہ بات کہنا جو ہم نے کبھی سنی ہی نہیں کہ بتوں کی عبادت مت کرو، صرف اللہ کی عبادت کرو اور دن رات اسی کی تبلیغ میں لگے رہنا، نہ کاروبار کا خیال، نہ پوری قوم کی مخالفت کی پروا، درحقیقت اسے ایک جنون لاحق ہے، دیوانگی ہے جو اس سے یہ سب کچھ کرواتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کی نظر میں کافر جو کچھ کرتا ہے سراسر دیوانگی ہے کہ ساری جد

وجہد چند روزہ زندگی کے لیے کرتا ہے، ہمیشہ کی زندگی کی اسے فکر ہی نہیں اور پیدا کرنے والے کے ساتھ ان لوگوں کو پکارتا اور ان کی عبادت کرتا ہے جنھوں نے نہ کچھ پیدا کیا اور نہ وہ کچھ اختیار رکھتے ہیں۔ اسی طرح کافر کی نظر میں مومن کے کام دیوانگی ہیں کہ نقد کو چھوڑ کر ادھار کے پیچھے پڑا ہے، نظر نہ آنے والے رب سے ڈر کر اپنی محبوب خواہشیں ترک کیے ہوئے ہے۔ "جِنَّۢ" میں تنوین تنکیر کی ہے، یعنی اسے ایک قسم کا جنون لاحق ہے۔ مکمل پاگل کہنے کے بجائے کچھ جنون کہا، تاکہ ہر شخص انھیں جھٹلا نہ دے کہ بھلا اتنا کامل عقل والا شخص دیوانہ ہوسکتا ہے؟ ابن جزی فرماتے ہیں: "ان کی باتوں کا باہمی تضاد دیکھیے، ابھی کہہ رہے تھے کہ یہ شخص (اتنی صلاحیتوں کا مالک ہے کہ) تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے اور ابھی کہتے ہیں کچھ دیوانگی میں مبتلا ہے۔" فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ: یعنی اس کے متعلق کچھ مدت انتظار کرو، حتیٰ کہ یہ زمانے کے کسی چکر کی لپیٹ میں آجائے، یا فوت ہوجائے اور تمہاری جان چھوٹ جائے۔

﴿ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿٢٦﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ
الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ
فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ
عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ
مُّغْرَقُوْنَ ﴿٢٧﴾ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ

فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ
رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ
لَاٰیٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ ﴿۳۰﴾

نوح (علیہ السلام) نے دعا کی کہ اے میرے رب! تو میری مدد فرما اس پر کہ انھوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔(۲۶) پس ہم نے اس کی طرف وحی بھیجی کہ تم ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بناؤ، پھر جب ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچے اور تنور ابل پڑے تو ہر جنس میں سے ایک ایک جوڑا اس کشتی میں سوار کر لو، اور اپنے گھر والوں کو بھی سوائے ان کے جن (کو غرق کرنے) کا فیصلہ ہو چکا ہے اور ان لوگوں کے بارے میں مجھ سے کچھ عرض نہ کرنا جنھوں نے ظلم کیا، بیشک وہ ضرور غرق کیے جائیں گے۔(۲۷) پھر جب تم اور تمہارے ساتھی کشتی پر سوار ہو جائیں تو (اللہ کا شکر کرتے ہوئے) کہنا سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں ظالموں سے نجات دی۔(۲۸) اور یہ دعا بھی کرنا کہ اے میرے رب مجھے بابرکت منزل پر اتار کہ تو ہی سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔(۲۹)

بیشک اس قصہ میں بہت سی نشانیاں ہیں اور بیشک ہم (اپنے بندوں کی) آزمائش کرنے والے ہیں۔(۳۰)

نوح (علیہ السلام) ساڑھے نوسو سال تک تبلیغ کرتے رہے اور اس راہ کی ہر اذیت برداشت کرتے رہے، لیکن ان کی قوم کی سرکشی بڑھتی گئی۔ بالآخر انھوں نے اپنے رب سے دعا مانگی اور کہا، اے میرے رب! اب تو میری مدد کر اور ان کی جانب سے میری مسلسل تکذیب کی وجہ سے انھیں ہلاک کر دے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ آپ میری نگرانی میں اور میری تعلیمات کے مطابق کشتی بنایئے اور جب تنور سے پانی ابلنے لگے تو تمام حیوانات کے مذکر و مونث جوڑے کشتی میں ڈال لیجیے، سوائے ان کے جن کا ہلاک ہوجانا مقدر ہو چکا ہے (جیسے ان کا بیٹا اور ان کی بیوی) اور عذاب دیکھنے کے بعد آپ کو ان ظالموں پر رحم نہ آجائے اور یہ نہ سوچیے کہ اب اگر عذاب ٹل جائے تو شاید یہ لوگ ایمان لے آئیں۔ اس لیے کہ میرا یہ فیصلہ ہے کہ انھیں کفر و سرکشی کی حالت ہی میں ڈوب جانا ہے۔ جب آپ اور دیگر اہل ایمان کشتی پر سوار ہوجائیں تو اللہ کا شکر بجالایئے کہ اس نے آپ لوگوں کو ظالموں سے نجات دے دی اور گریہ وزاری کے ساتھ دعا کیجیے کہ اے میرے رب! مجھے کسی مبارک جگہ اتار دے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مومنوں کی نجات اور کافروں کی ہلاکت میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور ہم اپنے بندوں کو خیر و شر کے ذریعے سے اس لیے آزماتے ہیں کہ کافر و مومن اور عاصی و مطیع کا فرق واضح ہوجائے۔

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ۔۔: کشتی پر سوار ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد کا حکم دیا اور اس کے الفاظ خود بتائے، جیسے آدم (علیہ السلام) کو خود دعا سکھائی اور جیسے قیامت کے دن ہمارے نبی

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حمد سکھائیں گے۔ دوسری جگہ چوپاؤں اور کشتیوں کے متعلق فرمایا: (وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۱۲ ○ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۱۳ ○ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ) [الزخرف: ۱۲ تا ۱۴] "اور تمہارے لیے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ تاکہ تم ان کی پیٹھوں پر جم کر بیٹھو، پھر اپنے رب کی نعمت یاد کرو، جب ان پر جم کر بیٹھ جاؤ اور کہو پاک ہے وہ جس نے اسے ہمارے لیے تابع کر دیا، حالانکہ ہم اسے قابو میں لانے والے نہیں تھے۔ اور بیشک ہم اپنے رب کی طرف ضرور لوٹ کر جانے والے ہیں۔" رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سواری پر سوار ہو کر یہ دعا پڑھتے تھے: (اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، سُبْحَانَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِيْنَ وَإِنَّا إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ، اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْءَلُكَ فِيْ سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى وَ مِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰى، اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰذَا وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَهُ، اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْأَهْلِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَعْثَآءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ وَ سُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَالْأَهْلِ) "اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، پاک ہے وہ جس نے اسے ہمارے لیے مسخر کر دیا، حالانکہ ہم اسے ملنے والے نہیں تھے اور یقیناً ہم اپنے رب کی طرف پلٹنے والے ہیں۔ اے اللہ! ہم اپنے اس سفر میں تجھ سے نیکی اور تقویٰ کا سوال کرتے ہیں اور اس عمل کا جسے تو پسند کرے سوال کرتے ہیں۔ اے اللہ! ہمارا یہ سفر ہم پر آسان فرما دے اور ہم سے اس کی دوری کم کر دے۔ اے اللہ! تو ہی سفر میں ساتھی اور گھر والوں میں نائب ہے۔ اے اللہ! میں تجھ سے سفر کی

مشقت سے اور مال اور اہل میں منظر کے غم سے اور ناکام لوٹنے کی برائی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔" اور جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سفر سے واپس آتے تو یہی دعا پڑھتے، البتہ یہ الفاظ زیادہ کہتے :(آٰئِبُوْنَ، تَآئِبُوْنَ، عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ)[1] "ہم واپس لوٹنے والے، توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے اور اپنے رب ہی کی حمد کرنے والے ہیں۔" نوح (علیہ السلام) کو سوار ہو کر یہ دعا پڑھنے کا حکم ہوا: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ)[المؤمنون: ۲۸] "سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات دی۔" اور انھوں نے یہ کہہ کر ساتھیوں کو کشتی میں سوار ہونے کا حکم دیا: (بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ)[ھود: ٤١] "اللہ کے نام کے ساتھ اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا ہے۔ بیشک میرا رب یقیناً بیحد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔" فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا --: "الظّٰلِمِيْنَ" سے مراد مشرک ہیں، کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے۔ ظلم کا معنیٰ "وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهِ" (کسی چیز کو اس کی جگہ کے علاوہ کہیں رکھنا) ہے اور ظلم کا معنیٰ اندھیرا بھی ہے، گویا ظالم اندھیرے میں چیزوں کو ان کے اصل محل کے بجائے ادھر ادھر رکھ دیتا ہے۔ سب سے بڑا حق اللہ کا ہے، وہ غیر کو دیا تو یہ سب سے بڑا ظلم ٹھہرا۔ (ابن عاشور) ظالم لوگوں سے نجات پر اللہ کی حمد کا حکم اس لیے دیا کہ وہ نوح (علیہ السلام) اور ان کے ساتھیوں کو بیشمار اذیتوں کا نشانہ بناتے تھے، اس کے علاوہ نوح (علیہ السلام) اور ان کے ساتھیوں کا ان میں رہنا، ان کے کفر و شرک اور گندے اور غلیظ کاموں کو دیکھنا بجائے خود شدید تکلیف دہ تھا۔ اب ان سے نجات ملی، دشمن غرق ہوئے، الگ رہنے کی جگہ ملی، اپنا ماحول اور اپنی مجلس بنی، تو اس پر شکر ادا کرنے کا حکم ہوا۔[3] اسی

---

[1] [مسلم، الحج، باب استحباب الذکر إذا رکب --: ١٣٤٢]

لیے مسلمان کو دعوت یا جہاد کے مقصد کے بغیر کفار میں رہائش رکھنا حرام ہے، کیونکہ مسلسل کفر وشرک اور بدکاری و بے حیائی کا ارتکاب دیکھ دیکھ کر یا تو ہمیشہ شدید تکلیف میں رہے گا، یا اس کی اپنی غیرت وحمیت بھی ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ اگر ایسی جگہ رہتا ہے تو وہاں سے ہجرت کا حکم ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: (أَنَا بَرِيءٌ مِنْ كُلِّ مُسْلِمٍ يُقِيمُ بَيْنَ أَظْهُرِ الْمُشْرِكِينَ) "میں ہر اس مسلم سے بری ہوں جو مشرکوں کے درمیان رہتا ہے۔"[1]

وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا: یہ نوح (علیہ السلام) کو سکھائی گئی دعا کا دوسرا حصہ ہے۔ "مُنْزَلًا" باب افعال میں سے مصدر میمی بھی ہے اور ظرف بھی، اتارنا اور اتارنے کی جگہ، یعنی اے میرے پروردگار! تو مجھے اتار، ایسا اتارنا جو بابرکت ہو اور ایسی جگہ اتار جو بہت برکت والی ہو۔ بابرکت اتارنے سے مراد یہ ہے کہ سوار ہوتے وقت کوئی تکلیف نہ ہو اور جہاں اتریں وہاں کوئی آفت نہ آئے، ہر حال میں اور ہر جگہ بڑی رحمت و برکت شامل رہے۔ ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھائی: (وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا) [بنی إسرائیل: ۸۰] "اور کہہ اے میرے رب! داخل کر مجھے سچا داخل کرنا اور نکال مجھے سچا نکالنا اور میرے لیے اپنی طرف سے ایسا غلبہ بنا جو مددگار ہو۔" یہ دونوں دعائیں خود اللہ تعالیٰ کی سکھائی ہوئی ہیں جنھیں "قل" کہہ کر پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ ان کی قبولیت میں کوئی شک نہیں، ان دونوں دعاؤں کو ورد زبان رکھنا چاہیے، خصوصاً گھر جاتے اور گھر سے نکلتے وقت اور یہ دعائیں کرتے ہوئے دنیا کی باعزت اور بابرکت منزل کے ساتھ ہماری اصل منزل جنت کی نیت بھی

---

[1] [أبوداؤد، الجهاد، باب النهي عن قتل ... : ٢٦٤٥]

رکھنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں وہ باعزت اور بابرکت مقام عطا فرمائے۔ (آمین) وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ: اس کا ایک مطلب تو وہ ہے جو اوپر ترجمے میں ہے اور ایک وہ ہے جو یوسف (علیہ السلام) نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا: (وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ) [یوسف: ۵۹] "اور میں بہترین مہمان ٹھہرانے والا (میزبان) ہوں۔" یعنی کشتی سے اترنے کے بعد تو ہی ہماری مہمان نوازی اور ہماری ضروریات کا بندوبست کرنے والا ہے اور تجھ سے بہتر مہمان نواز کوئی نہیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ: نوح (علیہ السلام) کا قصہ بیان کرنے کے بعد اس سے حاصل ہونے والی عبرتوں کی طرف توجہ دلائی کہ یقیناً اس واقعہ میں بہت سی نشانیاں ہیں، مثلاً اس میں نوح (علیہ السلام) کے اولوالعزم پیغمبر ہونے کی کئی نشانیاں ہیں، یعنی مدت دراز تک ان کا بے مثال صبر، قوم کے ایمان نہ لانے کی اطلاع پر ان پر بددعا کا قبول ہونا، ان کے دشمنوں کا غرق ہونا، اللہ تعالیٰ کا ان کی رسالت کی تصدیق کرنا اور ان کی تعریف کرنا وغیرہ۔ نوح (علیہ السلام) کی قوم جیسی رسولوں کو جھٹلانے والی دیگر قوموں کے لیے بھی کئی نشانیاں ہیں۔ اسی طرح اللہ کی عظیم قدرت کی بھی بہت سی نشانیاں ہیں، مثلاً اتنا عظیم طوفان جس سے پہاڑ بھی نہ بچا سکیں اور اس میں نوح (علیہ السلام) اور ان کے ساتھیوں کو محفوظ رکھ کر بابرکت طریقے سے اتار کر بابرکت جگہ دینا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کامل علم و حکمت کی بھی بہت سی نشانیاں ہیں کہ اس نے کس طرح زمین کو مکمل طور پر شرک سے پاک کرنا طے کر رکھا تھا اور اتنے تباہ کن طوفان میں بھی اس نے انسانی ضروریات اور جانوروں کی بقا کا انتظام طے کر رکھا تھا اور کیا۔ (ابن عاشور)

﴿ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۳۱ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ

رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾

پھران کے بعد ہم نے ایک اور قوم کو پیدا کر دیا۔(۳۱) پھر ہم نے انہی میں سے ایک رسول ان میں بھیجا (جس کی دعوت یہ تھی کہ لوگو) اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ کیا تم اس سے ڈرتے نہیں ہو۔(۳۲)

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ: اس سے مراد اکثر مفسرین نے قوم عاد لی ہے، کیونکہ قوم نوح کے جانشین یہی لوگ بنے تھے۔ ہود (علیہ السلام) نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: (وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ)[الاعراف:٦٩] "اور یاد کرو جب اللہ نے تمہیں قوم نوح کا جانشین بنایا۔" مگر بہت سے مفسرین نے اس سے مراد صالح (علیہ السلام) کی قوم ثمود لی ہے، کیونکہ یہاں "اَلصَّيْحَةُ" (چیخ) کا ذکر ہے اور "صیحہ" یعنی چیخ سے ہلاک ہونے والے ثمود تھے۔ اس کے علاوہ اہل عرب کی نصیحت کے لیے قوم ثمود کا تذکرہ زیادہ موزوں تھا، کیونکہ پہاڑوں کو تراش کر ان کے بنائے ہوئے مکانات مقام حجر میں ان کے سامنے موجود تھے۔ امام طبری، ابن عاشور اور مفسر سعدی وغیرہم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں کسی قوم کا نام نہیں لیا، کیونکہ مراد تاریخ کا بیان یا قصہ گوئی نہیں بلکہ عبرت ہے کہ بعد میں آنے والوں نے بھی پہلوں کے انجام سے کوئی سبق حاصل نہ کیا، آخر اللہ کی گرفت کا نشانہ بنے۔

﴿ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ
الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾
وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ ۙ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾
اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَ كُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ
مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا
حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنْ
هُوَ اِلَّا رَجُلٌ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾ ﴾

اس کی قوم کے سرداروں نے جنہوں نے کفر کیا تھا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا تھا اور جنہیں ہم نے دنیا کی زندگی میں خوشحالی دے رکھی تھی کہنے لگے یہ تو تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہے۔ وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ (۳۳) اور اگر تم اپنے جیسے بشر کی پیروی کرنے لگے تو تم بہت نقصان اٹھانے

والے ہوجاؤ گے۔(۳۴) کیا وہ تمہیں یہ کہتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جاؤ گے تو تم (دوبارہ زندہ کر کے قبروں سے) نکالے جاؤ گے۔(۳۵) بہت ہی بعید اور بہت ہی بعید ہے جس کا تمہیں وعدہ دیا جارہا ہے۔(۳۶) زندگی تو بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے جس میں ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہم ہرگز دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں۔(۳۷) یہ تو محض ایسا شخص ہے جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا ہے، لہٰذا ہم اس پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔(۳۸)

رسول کا اپنی قوم کی طرف پیغام پہنچانا اور قوم کا سرکشی سے رد کرنا

اکثر مفسرین کے نزدیک قوم نوح کے بعد جس قوم کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور ان میں رسول کو مبعوث فرمایا وہ قوم عاد ہے، کیونکہ قرآن مجید کی اکثر سورتوں میں قوم نوح کے بعد عاد ہی کا ذکر کیا گیا ہے، ایک قول یہ ہے کہ یہ قوم ثمود ہے کیونکہ ان آیات میں آگے چل کر المومنون: ۴۱ میں فرمایا ہے کہ ایک زبردست چنگھاڑ نے ان کو پکڑ لیا اور یہ عذاب قوم ثمود پر آیا تھا اور ایک قول یہ ہے کہ اس قوم کا مصداق حضرت شعب (علیہ السلام) کی قوم مدین ہے کیونکہ ان کی ہلاکت بھی ایک زبردست چنگھاڑ کی وجہ سے ہوئی تھی۔

اس قوم کی طرف جس رسول کے بھیجنے کا ذکر ہے وہ رسول بھی اللہ تعالیٰ نے اس قوم میں سے ہی بھیجا تھا جن کی نشو ونما ان ہی کے درمیان ہوئی تھی، جن کو وہ اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے، ان کے خاندان

مکان، مولد اور ان کی سیرت اور کردار سے اچھی طرح واقف تھے، اکثریت کے قول کے مطابق یہ رسول حضرت ھود (علیہ السلام) تھے، ان کا تفصیلی تعارف ہم الاعراف : ٦٥ میں بیان کر چکے ہیں۔ حضرت ھود (علیہ السلام) نے بعثت کے بعد سب سے پہلے وہ پیغام پہنچایا اور اسی دین کی دعوت دی جو ہر نبی کا اولین نصب العین اور ان کے مشن کا سرنامہ رہا ہے۔

ان کی قوم کے سرداروں نے اس طرح ان کے پیغام کو مسترد کر دیا جس طرح ہر نبی کی قوم کے کافر سردار اپنے اپنے نبیوں کے لائے ہوئے پیغام کو رد کرتے رہے ہیں اور انکی اکثریت ایمان لانے سے محروم رہتی ہے، کیونکہ یہ لوگ بہت مالدار تھے ایک تو ان کا آخرت کے عقیدے پر ایمان نہیں تھا اور دوسرا سبب یہ تھا کہ ان کے پاس دنیاوی مال و دولت اور سامان عیش وعشرت کی فراوانی تھی چنانچہ انہوں نے یہ کہہ کر اپنے رسول کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ شخص تو ہماری طرح کھاتا پیتا ہے یہ اللہ کا رسول کس طرح ہوسکتا ہے، انہوں نے صرف اپنے رسول کی بشریت اور ظاہر حال کو سامنے رکھا اور اس کے دیگر فضائل اور مناقب اور اس کے باطن کی روشنی کی طرف دیکھنے سے آنکھیں بند کر لیں جس طرح آج بھی ان کے طریقہ پر چلتے ہوئے بہت سے گمراہ فرقے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بشریت کو سامنے رکھتے ہیں اور آپ کے بشری تقاضوں کا ذکر کرتے ہیں اور توحید کے پرچار کے نام پر کمالات نبوت اور آپ کے تمام فضائل ومناقب سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور آپ کی خصوصیات اور شرف ومرتبہ اور آپ کی عزت ووجاہت کا بالکل تذکرہ نہیں کرتے وہ نبی کو ایک عام آدمی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ سوا شرعی مسائل کے آپ کو اور کسی چیز کا علم تھا اور نہ کسی مال کے اظہار کی قدرت تھی اور وہ آپ کے کمالات کے باب میں ذاتی اور عطائی کے فرق کو بھی تسلیم نہیں

کرتے۔

ان کافر سرداروں نے اپنے متبعین سے کہا اگر تم نے اپنے جیسے انسان کے دعویٰ نبوت کو تسلیم کر لیا اور اس کی فضیلت اور برتری کو مان لیا تو تم زبردست نقصان اٹھاؤ گے کیونکہ ایک بشر دور سے بشر سے کیوں کر افضل ہوسکتا ہے یہی وہ مغالطہ ہے جس کی وجہ سے ان کافر سرداروں نے اپنے رسول کی رسالت کو نہیں مانا حالانکہ اللہ تعالیٰ جس بشر کو اپنا پیغام پہنچانے کے لیے چن لیتا ہے تو وہ اس وحی اور رسالت کی وجہ سے تمام غیر نبی اور غیر رسول انسانوں سے شرف اور مرتبہ میں بہت بلند اور فاضل اور اعلیٰ ہو جاتا ہے۔

ھیہات اس کا معنی ہے دوری ہو اور اس کو تاکید کی وجہ سے دوبارہ ذکر کیا گیا ہے، انہوں نے دوبارہ زندہ کئے جانے کا انکار کیا اور کہا صرف اسی دنیا کی زندگی ہے جس میں ہم جیتے اور مرتے ہیں اور دوبارہ زندہ کئے جانے کا وعدہ محض ایک افتراء اور بہتان ہے جو یہ شخص اللہ تعالیٰ پر باندھ رہا ہے۔

هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ: "هَيْهَاتَ" اسم مبنی جامد غیر مشتق ہے۔ اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ فعل ماضی "بَعُدَ" (دور ہوا) کے معنی میں ہے۔ "مَا تُوعَدُونَ" اس کا فاعل ہے اور لام فاعل کے بیان اور وضاحت کے لیے ہے۔ معنی ہوگا: "دور ہے، دور ہے وہ جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو۔" زجاج نے اپنی تفسیر میں فرمایا اور زمخشری نے بھی اسی بات کو پسند کرنے کا اشارہ فرمایا ہے کہ یہ مصدر "بُعْدٌ" (دوری) کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ "دوری ہے، دوری ہے اس کے لیے جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو۔" اس صورت میں لام کا معنی سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آتی، میں نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ مطلب یہ کہ مٹی اور ہڈیاں ہونے کے بعد دوبارہ قبروں سے زندہ نکالے جانے کی بات میں بہت بعد ہے۔

اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا: "هِيَ" سے مراد "حَيَاةٌ" ہے، جو "حَيَاتُنَا الدُّنْيَا" سے واضح ہو

رہی ہے، یعنی مرنے کے بعد زندگی کہاں؟ زندگی ہے تو صرف یہ دنیا کی زندگی، باقی سب خیال ومحال ہے۔

نَمُوْتُ وَنَحْيَا: "ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں" اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مرنے کے بعد جینے کے قائل ہو گئے تھے، کیونکہ وہ اس دنیا کے سوا کسی زندگی کو مانتے ہی نہ تھے۔ اس لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہیں ہم مرتے جاتے ہیں اور پچھلے پیدا ہوتے رہتے ہیں، دنیا کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔

﴿ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿٣٩﴾ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴿٤٠﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤١﴾ ﴾

پیغمبر (علیہ السلام) نے دعا کی اے میرے رب! تو میری مدد فرما اس چیز سے جس میں انھوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔ (۳۹) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عنقریب وہ اپنے کیے پر نادم ہو جائیں گے۔ (۴۰) پس ان کو ایک چنگھاڑ نے آ پکڑا وعدہ برحق کے مطابق تو ہم نے ان کو کوڑا کرکٹ بنا دیا پس ظالموں کے لیے (اللہ کی رحمت سے) دوری ہے۔ (۴۱)

حضرت ھود (علیہ السلام) نے قوم کے مظالم سے تنگ آ کر اپنے رب کے حضور یہ کہہ کر مدد کی درخواست

کی کہ میرے رب مجھے میری قوم نے جھٹلا دیا ہے اس لیے میری مدد فرما۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ھود (علیہ السلام) کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ عنقریب تیری قوم کے لوگ پچھتائیں گے اور پھر یہی ہوا کہ ان کو ایک دھماکہ خیز چٹخارے نے آلیا۔ جس نے انہیں خس و خاشاک کی طرح ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ اس طرح اس قوم پر اللہ کی پھٹکار ہوئی۔ یہ لوگ جسمانی اعتبار سے دراز قامت، کڑیل جوان اور قوی ہیکل تھے۔ دنیا میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ انھوں نے پہاڑ تراش، تراش کر مضبوط اور خوبصورت محلات تعمیر کر رکھے تھے۔ ان کی سرزمین نہایت سرسبز تھی جس میں ہر قسم کے باغات آراستہ تھے۔ انھیں قرآن مجید میں "احقاف والے" کہا گیا ہے۔ احقاف ریت کے بڑے بڑے ٹیلوں کو بھی کہا جاتا ہے جو عرب کے جنوب مغربی حصہ میں واقع تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی علاقہ میں حضرت ھود (علیہ السلام) کو مبعوث فرمایا جو خوش اندام، کڑیل جوان اور بہترین صورت و سیرت کے حامل تھے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ : یعنی ان کے کفر اور سرکشی کی وجہ سے چنگھاڑ نے انھیں آ پکڑا، ارشاد فرمایا: (اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ)[القمر:۳۱] "بیشک ہم نے ان پر ایک ہی چیخ بھیجی تو وہ باڑ لگانے والے کی کچلی، روندی ہوئی باڑ کی طرح ہو گئے۔" اور فرمایا: (وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۸۰ وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝۸۱ وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ۝۸۲ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ)[الحجر: ۸۰ تا ۸۳] "اور بلاشبہ یقیناً "حجر" والوں نے رسولوں کو جھٹلا دیا۔ اور ہم نے انھیں اپنی نشانیاں دیں تو وہ ان سے منہ پھیرنے والے تھے۔ اور وہ پہاڑوں سے مکان تراشتے تھے، اس حال میں کہ

بے خوف تھے۔ پس انھیں صبح ہوتے ہی چیخ نے پکڑ لیا۔" اور فرمایا: (وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۶۷ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ) [ھود: ۶۷، ۶۸] "اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انھیں چیخ نے پکڑ لیا، تو انھوں نے اپنے گھروں میں اس حال میں صبح کی کہ گرے پڑے تھے۔ جیسے وہ ان میں رہے ہی نہ تھے۔ سن لو! بیشک ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سن لو! ثمود کے لیے ہلاکت ہے۔"

﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۴۲ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝۴۳ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۭ كُلَّمَا جَاۗءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۴۴ ﴾

پھر ان کے بعد ہم نے اور قومیں پیدا کیں۔ (۴۲) کوئی قوم نہ اپنے وقت سے آگے جا سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔ (۴۳) پھر ہم پے در پے رسول بھیجتے رہے۔ جب کسی قوم کے پاس اس کا رسول آیا انہوں نے اس کو جھٹلایا، تو ہم نے بھی (ہلاک کرنے میں) ایک کے پیچھے دوسرے کو لگا دیا اور ان کو قصے کہانیاں بنا کر رکھ دیا۔ پس پھٹکار ہو ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔ (۴۴)

پیغمبروں کے بعد ہمیشہ ان کی امتوں میں بگاڑ آتا رہا۔ ان کی اصلاح کے لیے بار بار پیغمبر بھیجے گئے۔ امت آدم میں حضرت نوح آئے۔ اس کے بعد امت نوح (عاد) میں حضرت ہود آئے۔ پھر امت ہود (ثمود) میں حضرت صالح آئے، وغیرہ۔ مگر ہر بار یہ ہوا کہ وہی لوگ جو ماضی کے پیغمبر کو بلا بحث مانے ہوئے تھے وہ حال کے پیغمبر کو کسی طرح ماننے پر تیار نہ ہوئے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی کا پیغمبر طویل روایات کے نتیجے میں قومی فخر کا نشان بن جاتا ہے۔ وہ قوموں کے لیے ان کے قومی تشخص کی علامت ہوتا ہے وہ ان کے لیے قومی ہیرو کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کو مان کر آدمی کے احساس برتری کو تسکین ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے پیغمبر کو کون مانے گا۔

مگر حال کے پیغمبر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ حال کے پیغمبر کے ساتھ اس کی تاریخ وابستہ نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ عظمت اور تقدس کی روایت شامل نہیں ہوتی۔ اس کو ماننا صرف ایک معنوی حقیقت کے اعتراف کے ہم معنی ہوتا ہے۔ نہ کہ کسی مالیائی عظمت سے اپنے آپ کو وابستہ کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کے پیغمبر کو ماننے والے ہمیشہ حال کے پیغمبر کا انکار کرتے رہے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۔۔: یعنی "مُتَوَاتِرِیْنَ" یعنی پھر ہم نے اپنے کئی رسول پے در پے بھیجے، مگر ان کی قوموں نے پہلی امتوں کے انجام سے کوئی عبرت حاصل نہ کی اور ہر امت اپنے رسول کے آنے پر اسے جھٹلاتی رہی، تو ہم نے بھی یکے بعد دیگرے ان کی ہلاکت کا تانتا باندھ دیا اور انھیں ایسا نیست و نابود کیا کہ قصے کہانیوں کے سوا ان کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

﴿ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ

مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا
عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا
عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا
مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

پھر ہم نے موسیٰ اوران کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیاں اور واضح دلیل دے کر بھیجا ۔(۴۵) فرعون اوراس کے سرداروں کی طرف پس انھوں نے تکبر کیا اور وہ بڑے سرکش لوگ تھے۔(۴۶) کہنے لگے کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں اوران کی قوم کے لوگ تو ہمارے خدمت گار ہیں۔(۴۷) پس انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا پھر وہ ہلاک ہونے والوں میں (شامل) ہو گئے۔(۴۸) اور بیشک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی تا کہ وہ لوگ ہدایت پائیں۔(۴۹)

تکذیب اور تکبر کا انجام

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح (علیہ السلام) کے بعد مختلف اقوام کی طرف پے در پے انبیائے کرام (علیہ السلام) مبعوث فرمائے تا آنکہ حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر پیغمبر اوران کے بھائی حضرت ہارون (علیہ السلام) کو بیک وقت عظیم معجزات اور ٹھوس دلائل کے ساتھ بھیجا گیا۔ جب دونوں بھائی فرعون اوراس

کے وزیروں مشیروں کے پاس پہنچے تو انہیں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ مگر فرعون اور اس کے وزیروں اور مشیروں نے بڑے غرور اور تکبر کے ساتھ ان کی دعوت کو مسترد کر دیا۔ جن کی سرشت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ بڑے ہی سرکش اور متکبر لوگ تھے۔ جس طرح فرعون اپنے آپ کو "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" کہتا تھا اسی طرح ہی اس کے وزیر مشیر اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے اعلیٰ سمجھتے تھے۔ خاص طور پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور آپ کی قوم کے بارے میں ان کی سوچ اور کردار یہ تھا کہ انہوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم کو صدیوں سے غلام بنا رکھا تھا۔ اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ غلام قوم کے نمائندوں پر ہم کیونکر ایمان لائیں اس بناء پر انہوں نے پراپیگنڈہ کیا کہ موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون (علیہ السلام) ہمارے جیسے انسان ہیں اور ان کی قوم ہماری غلام ہے۔ انہوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت ہارون (علیہ السلام) کو جھٹلایا اور ہلاک ہونے والوں میں شامل ہوئے۔

فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ: جو لوگ ایمان لا کر سرکشی کرتے رہے ان پر بھی آسمان سے عذاب نازل ہوا، ارشاد فرمایا: (فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ)[الاعراف:١٦٢] "تو ان میں سے جنھوں نے ظلم کیا، انھوں نے بات کو اس کے خلاف بدل دیا جو ان سے کہی گئی تھی، تو ہم نے ان پر آسمان سے ایک عذاب بھیجا، اس وجہ سے کہ وہ ظلم کرتے تھے۔" کبھی وہ بندر بنا دیے گئے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ)[الاعراف: ١٦٦] "پھر جب وہ اس بات میں حد سے بڑھ گئے جس سے انھیں منع کیا گیا تھا تو ہم نے ان سے کہہ دیا کہ ذلیل بندر بن جاؤ۔" کبھی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ذریعے سے ان پر عذاب بھیجا، جیسا کہ

ارشاد فرمایا: (وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا، فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا)[بنی اِسرائیل:٤، ٥] "اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں فیصلہ سنا دیا تھا کہ بیشک تم زمین میں ضرور دو بار فساد کرو گے اور بیشک تم ضرور سرکشی کرو گے، بہت بڑی سرکشی۔ پھر جب ان دونوں میں سے پہلی کا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے سخت لڑائی والے کچھ بندے بھیجے، پس وہ گھروں کے اندر گھس گئے اور یہ ایسا وعدہ تھا جو (پورا) کیا ہوا تھا۔"

﴿ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ۝۵۰ ﴾

اور ہم نے ابن مریم (علیہما السلام) اور ان کی والدہ کو اپنی قدرت کی نشانی بنایا اور ہم نے ان کو بلند ہموار زمین کی طرف پناہ دی جو سکون کی جگہ تھی اور اس میں چشمے جاری تھے۔

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً: "اٰيَةً" میں تنوین تعظیم کی ہے "عظیم نشانی۔" یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے ابن مریم کو نشانی بنایا، نہ یہ فرمایا کہ ہم نے ابن مریم اور اس کی ماں کو دو نشانیاں بنایا، بلکہ دونوں کو ملا کر ایک عظیم نشانی قرار دیا، کیونکہ ان دونوں کا وجود اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عظیم نشان تھا کہ اس نے آدم (علیہ السلام) کو ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا فرمایا، حوا کو صرف مرد سے پیدا فرمایا اور مریم کے بطن سے عیسیٰ (علیہ السلام) کو بغیر باپ کے پیدا فرمایا۔ جب کہ عام پیدائش ماں باپ دونوں سے ہوتی ہے اور وہ بھی

اللہ کی قدرت کا نشان ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ (علیہ السلام) کا نام لینے کے بجائے "ابن مریم" فرمایا کہ انھیں خدا قرار دینے والوں کو توجہ دلائی جائے کہ وہ ایک خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، سو خدا کیسے ہو گئے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام)

یعنی قدرت الٰہیہ کی نشانی ہے کہ تنہا ماں سے بدون باپ کے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو پیدا کر دیا۔ جیسا کہ "آل عمران" اور سورہ "مریم" میں اس کی تقریر کی جا چکی ہے

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی پیدائش

شاید وہی ٹیلہ یا اونچی زمین ہو جہاں وضع حمل کے وقت حضرت مریم تشریف رکھتی تھیں۔ چنانچہ سورہ مریم کی آیات "فنادھا من تحتہا الاتحزنی قد جعل ربک تحتک سریا، وھزی الیک بجذع النخلۃ تسقط علیک رطبا جنیا"۔ دلالت کرتی ہیں کہ وہ جگہ بلند تھی، نیچے چشمہ یا نہر بہہ رہی تھی اور کھجور کا درخت نزدیک تھا

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے بادشاہ کی دشمنی:

لیکن عموماً مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ حضرت مسیح کے بچپن کا واقعہ ہے۔ ایک ظالم بادشاہ ہیرودس نامی نجومیوں سے سنکر کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو سرداری ملے گی۔

لڑکپن ہی میں ان کا دشمن ہو گیا تھا اور قتل کے درپے تھا۔ حضرت مریم الہام ربانی سے ان کو لے کر مصر چلی گئیں اور اس ظالم کے مرنے کے بعد پھر شام واپس چلی آئیں۔ چنانچہ "انجیل متی" میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے اور مصر کا اونچا ہونا باعتبار رود نیل کے ہے ورنہ غرق ہو جاتا اور "ماء معین" رود نیل ہے بعض نے۔

ربوہ کا مطلب

"ربوہ" (اونچی جگہ) سے مراد شام یا فلسطین لیا ہے۔ اور کچھ بعید نہیں کہ جس ٹیلہ پر ولادت کے وقت موجود تھیں وہیں اس خطرہ کے وقت بھی پناہ دی گئی ہو۔ واللہ اعلم۔

اس ربوہ (ٹیلا) سے کیا مراد ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد سرزمین مصر لی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں ملک شام (جہاں عیسیٰ (علیہ السلام) پیدا ہوئے) کا حاکم ہیروڈس تھا، وہ نجومیوں سے سن کر کہ عیسیٰ (علیہ السلام) کو سرداری ملے گی، بچپن ہی سے ان کا دشمن ہو گیا تھا اور ان کے قتل کے درپے تھا۔ مریم علیہا السلام انھیں لے کر مصر چلی گئیں اور جب تک ہیروڈس زندہ رہا واپس نہ آئیں۔ انجیل متیؔ میں یہ واقعہ اسی طرح مذکور ہے۔

صحابہ و تابعین کے اقوال:

"ربوہ" زمین میں اونچی جگہ۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا یہ دمشق تھا، سعید بن مسیب اور مقاتل کا بھی یہی قول ہے۔

ضحاکؒ نے کہا غوطہ دمشق مراد ہے۔ سیدنا حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا "ربوہ" سے رملہ مراد ہے عطا کی روایت میں سیدنا حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ ربوہ سے مراد بیت المقدس ہے۔ یہی قول قتادہ اور ابوالعالیہؒ نے کہا یہ بیت القدس کی سرزمین ہے جس کو ایلیا کہتے ہیں اور حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا یہ رملہ (فلسطین) ہے، کلبی اور ابن زیدؒ نے کہا یہ مصر ہے اور زیادہ مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ دمشق ہے، قتادہؒ نے کہا اس جگہ پانی کے چشمے تھے اور پھل تھے۔

لیکن حافظ ابن کثیرؒ نے فرمایا: "زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ اس سے مراد بیت المقدس کے قریب کھجور والی

وہ بلند جگہ ہے جہاں عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت ہوئی اور مریم (علیہا السلام) کو نیچے سے آواز دی گئی کہ غم نہ کر، تیرے نیچے تیرے رب نے ایک ندی جاری کر دی ہے اور کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا تو وہ تجھ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں گرائے گی، پس کھا، پی اور ٹھنڈی آنکھ سے رہ۔ (دیکھیے مریم: ۲۳ تا ۲۶) کیونکہ قرآن کی سب سے صحیح تفسیر وہ ہے جو قرآن کی کسی آیت سے ہو، پھر صحیح احادیث سے اور پھر آثار سے۔" (ابن کثیر) اسرائیلی روایات کو جب ہم نہ سچا کہہ سکتے نہ جھوٹا تو ان سے کوئی بات کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟۔

﴿ يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ۖ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٥١﴾ ﴾

اے رسولو!! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور عمل صالح کرو۔ بیشک جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں واقف ہوں۔

ایک روز نبی رحمت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، اے لوگو! اللہ پاک ہے اور پاکیزہ چیز کو ہی پسند فرماتا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اسی بات کا حکم دیا ہے جس کا حکم اس نے اپنے رسولوں کو دیا تھا۔ اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی۔ یاایھا الذین امنوا کلوا من طیبت ما رزقنکم۔ اے ایمان والو! پاکیزہ طیب چیزیں کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہیں۔ پھر ارشاد فرمایا ایک آدمی دور دراز کا سفر کرتا ہے، اس کے بال پراگندہ اور غبار آلود ہیں، وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتا ہے۔ یارب! یارب کہتا ہے۔ حالانکہ اس نے جو کھایا ہے وہ بھی حرام ہے، جو اس نے پیا ہے وہ بھی حرام، جو اس نے پہنا ہوا ہے وہ بھی

حرام، اور اس کی خوراک بھی حرام مال سے ہے۔ فانی یستجاب ذلک؟ (تو ایسے حرام خور آدمی کی دعا کیسے قبول ہوگی؟ رواہ بخاری عن ابی ہریرہ۔ اس ارشاد گرامی سے معلوم ہوا کہ قبولیت دعا کے لیے رزق حلال ایک بنیادی شرط ہے۔ کاملین امت نے فرمایا ہے کہ اکل حلال (حلال روزی) اور صدق مقال (سچی بات) کا نام ہی ولایت ہے۔

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اے لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے اور صرف پاک مال ہی قبول فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو وہی حکم دیا جو رسولوں کو دیا، فرمایا: (يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ) [المؤمنون:۵۱] "اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو، یقیناً میں اسے جو تم کرتے ہو، خوب جاننے والا ہوں" اور فرمایا: (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ) [البقرۃ:۱۷۲] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہیں۔" پھر آپ نے ایک ایسے آدمی کا ذکر کیا جو لمبا سفر کرتا ہے، اس کے بال بکھرے ہوئے اور غبار آلود ہیں، (آپ نے فرمایا): "وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے اور کہتا ہے اے میرے رب! اے میرے رب! حالانکہ کھانا اس کا حرام ہے، پینا اس کا حرام ہے، لباس اس کا حرام ہے اور حرام غذا سے اس کی پرورش ہوئی ہے، تو ایسی حالت میں اس کی دعا کیسے قبول ہوگی؟"[1]

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ کا کوئی نبی ایسا نہیں جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔" لوگوں نے پوچھا، کیا آپ نے بھی؟ آپ نے فرمایا: "ہاں! میں

۱۔ [مسلم، کتاب الزکوۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتربیتہا: ۱۰۱۵]

بھی چند قیراط پر اہل مکہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔"[1]

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ کے ہاں سب سے پسندیدہ روزہ داؤد (علیہ السلام) کا روزہ ہے اور سب سے زیادہ پسندیدہ قیام بھی داؤد (علیہ السلام) کا قیام ہے، وہ آدھی رات سوتے تھے اور تہائی رات نماز تہجد پڑھتے اور پھر چھٹا حصہ سو جاتے تھے اور وہ ایک دن روزہ رکھتے اور اگلے دن نہیں رکھتے تھے اور آپ میدان جنگ سے کبھی پیٹھ نہ دکھاتے۔"[2]

انبیاء کرام (علیہ السلام) حلال ہی کھاتے ہیں

ام عبداللہ بنت شدادؓ فرماتی ہیں میں نے حضور اقدس سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں دودھ کا ایک پیالہ شام کے وقت بھیجا تا کہ آپ اس سے اپنا روزہ افطار کریں دن کا آخری حصہ تھا اور دھوپ کی تیزی تھی تو آپ نے قاصد کو واپس کر دیا کہ اگر تیری بکری کا ہوتا تو خیر اور بات تھی، انھوں نے کہلوایا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں نے یہ دودھ اپنے مال سے خرید کیا ہے، پھر آپ نے پی لیا۔ دوسرے دن مائی صاحبہ حاضر خدمت ہو کر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ اس گرمی میں میں نے دودھ بھیجا بہت دیر سے بھیجا تھا۔ آپ نے میرے قاصد کو واپس کیا۔ آپ نے فرمایا ہاں مجھے یہی فرمایا گیا ہے انبیاء کرام (علیہ السلام) صرف حلال کھاتے ہیں اور صرف نیک عمل کرتے ہیں۔[3]

---

[1]۔[بخاری، کتاب ال إجارة، باب رعی الغنم علی قراریط: ۲۲۶۲]

[2]۔[مسلم، کتاب الصیام، باب النھی عن صوم الدھر۔۔الخ: ۱۸۷، ۱۸۹/ ۱۱۵۹۔ بخاری، کتاب التھجد، باب من نام عند السحر: ۱۱۳۱]

[3]۔(مستدرک حاکم حدیث ۶۷۱۰، قال حاکم صحیح)

طیبات فقط حلال چیزیں ہیں:

(آیت) "یایھا الرسل کلوا من الطیبت واعملوا صالحا"۔ لفظ طیبات کے لغوی معنی ہیں پاکیزہ نفیس چیزیں، اور چونکہ شریعت اسلام میں جو چیزیں حرام کردی گئی ہیں نہ وہ پاکیزہ ہیں نہ اہل عقل کے لیے نفیس و مرغوب، اس لیے طیبات سے مراد حلال چیزیں ہیں جو ظاہری اور باطنی ہر اعتبار سے پاکیزہ و نفیس ہیں۔ سیدنا مقدامؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "انسان کے لیے بہترین اور پاک کھانا وہی ہے جو وہ اپنے ہاتھ کی (حلال) کمائی سے کھائے اور اللہ کے نبی داؤد (علیہ السلام) اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔"[1]

﴿ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾
فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ
فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۴﴾ ﴾

اور بلاشبہ تمہاری جماعت (حقیقت میں) ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس تم مجھ ہی سے ڈرو۔ (۵۲) مگر ان لوگوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں خوش ہے۔ (۵۳) پس (اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ ان کو ایک وقت مقرر تک ان کی غفلت

---

[1] {بخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ: ۲۰۷۲}

میں رہنے دیں۔(۵۴)

اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام سے یہ بھی کہا کہ آپ سب کا دین ایک ہی ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں کو ایک اللہ کی عبادت کی طرف بلایئے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ) [آل عمران: ۱۹] "بیشک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔" اور فرمایا کہ تمام بنی نوع انسان کا رب بھی صرف میں ہوں، اس لیے اگر انھوں نے میری وحدانیت کا انکار کر کے میرے ساتھ غیروں کو عبادت میں شریک بنایا، تو پھر انھیں میرے عقاب وعذاب کا انتظار کرنا چاہیے۔ آگے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تو تمام انبیاء کو ایک ہی دین دے کر بھیجا، لیکن انبیاء کے گزر جانے کے بعد لوگ مختلف جماعتوں اور فرقوں میں بٹ گئے۔ پہلے تو یہود و نصاریٰ بنے، پھر ہر ایک کے بیسیوں فرقے بن گئے۔ اسی طرح جن لوگوں نے شرک کی راہ اختیار کی، ان کی بھی مختلف جماعتیں بنتی چلی گئیں۔ ہر جماعت بزعم خود خوش ہوتی رہی کہ وہی حق پر ہے اور دوسری جماعتیں گمراہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ انھیں ضلالت وگمراہی میں یونہی غلطاں وپیچاں چھوڑ دیجیے۔ ان کے اندر حق قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اور اگر ان پر عذاب نازل نہیں ہوتا تو تنگ دل نہ ہوئیے، کیونکہ اللہ کے یہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا) [الطارق: ۱۷] "سو کافروں کو مہلت دے، مہلت دے انھیں تھوڑی سی مہلت" اور فرمایا: (ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ) [الحجر: ۳] "انھیں چھوڑ دے، وہ کھائیں اور فائدہ اٹھائیں اور انھیں امید غافل رکھے، پھر جلدی جان لیں گے۔"

یاد رہے کہ دین میں فرقہ واریت اور گروہ بندی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی مسئلہ میں غلوّ کیا جائے یا

اس میں اپنی طرف سے رخصت نکالی جائے۔ جب کسی عالم کی یہ سوچ اور کردار ہوجائے تو پھر فرقہ واریت معرض وجود میں آتی ہے۔فرقہ واریت میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے وہ کسی عالم یاامام کی سوچ پر حد سے زیادہ اعتماداوراس پر فخر کرنا ہے۔اسی بنیاد پر پہلی امتیں گروہ بندی کا شکار ہوئیں اوراسی وجہ سے امت محمدیہ میں انتشاراور گروہ بندی پائی جاتی ہے۔ایسے لوگوں کوقرآن وسنت کی دعوت دی جائے۔اسے تسلیم کرنا تو درکنارایسے لوگ اپنی فقہ پرلڑنے مرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔

حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اورفرمایا سنوتم سے پہلے جواہل کتاب تھے وہ بہتر فرقوں میں متفرق ہوگئے اور یہ امت تہتر فرقوں میں متفرق ہوگی،اس میں سے بہتر دوزخ میں ہوں گے اورایک جنت میں ہوگا،اور یہ وہ فرقہ ہے جوسب سے بڑی جماعت ہے،ابن یحییٰ اورعمرو بن عثمان نے اپنی اپنی روایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ عنقریب میری امت میں ایسے لوگ نکلیں گے کہ گمراہی ان میں اس طرح گزیدہ کے جسم میں زہر داخل ہوجاتا ہے کہ کوئی رگ اورکوئی جوڑ اس زہر کے اثر سے نہیں بچتا۔[1]

حضرت عریاض بن ساریہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صبح کی نماز کے بعد ہم کو بہت موثر نصیحت فرمائی جس سے ہرآنکھ سے آنسوجاری ہوگئے اور ہردل خوف سے لرز گیا،ایک شخص نے کہا یہ تواس شخص کی نصیحت ہے جوالوداع ہورہا ہوتو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معلوم کروکہ آپ ہم سے کیا عہد لیتے ہیں،رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں تم کواللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اوراگرتمہارا حاکم حبشی غلام بھی مقرر کردیا جائے تواس کے احکام سننا اور

۱۔(سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۴۵۸۷،مطوبعہ دارالفکر بیروت،۱۴۱۴ھ)

اس کی اطاعت کرنا اور بیشک جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت اختلاف دیکھے گا اور تم بدعات سے دور رہنا کیونکہ بدعات (سیہ) گمراہی میں پس تم میں سے جو شخص ان بدعات کو پائے تو وہ میری سنت اور خلفاء راشدین مہدیین کی سنت کو لازم کرلے اور اس کو داڑھوں سے پکڑ لے۔ [1]

علامہ حمد بن محمد خطابی متوفی ۳۸۸ھ حضرت معاویہ کی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے اس میں یہ دلیل ہے کہ یہ تمام فرقے اسلام سے خارج نہیں ہیں، کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سب کو اپنی امت قرار دیا ہے اور اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ تاویل کرنے سے کوئی شخص ملت سے خارج نہیں ہوتا خواہ اس کی تاویل خطا پر مبنی ہو۔ [2]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری امت میں ایسا وقت ضرور آئے گا کہ وہ بنی اسرائیل کے ساتھ بالکل اس طرح مل جائے گی جس طرح جوتا ایک دوسرے کے ساتھ ملا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں سے اعلانیہ زنا کیا ہوگا تو میری امت میں بھی ایسا ضرور ہوگا۔ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئی جبکہ میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ایک گروہ کے علاوہ سارے کے سارے جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ نے استفسار کیا اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! وہ کونسا گروہ ہے؟ آپ نے فرمایا جو میرے اور میرے

۱۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۶۷۶ سنن ابوداؤد رقم الحدیث، ۴۶۰۷ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث، ۴۳ مسند احمد ج ۴ ص ۱۲۶ سنن دارمی رقم الحدیث: ۹۶ صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۱۵ المعجم الکبیر ج ۱۸ رقم الحدیث: ۲۱۷ مسند الشامیین رقم الحدیث، ۱۱۸۰ المستدرک ج ۱ ص ۱۹۵ الآجری فی الشریعہ رقم الحدیث: ۴۷)

۲۔ (معالم السنن مع مختصر سنن ابوداؤد ج ۷ ص ۴، مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت)

صحابہ کرامؓ کے طریقے پر عمل کرنے والا ہوگا۔ [1]

﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝۵۵ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۵۶ ﴾

کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم مال واولاد سے ان کی امداد کر رہے ہیں ۔(۵۵) ہم ان کے لیے بھلائی میں جلدی کر رہے ہیں، (نہیں) بلکہ وہ (حقیقت کی) سمجھ نہیں رکھتے ۔(۵۶)

عبد بن حمید وابن المنذر والبیہقی نے حسن بصریؒ سے روایت کیا کہ عمر بن خطابؓ کے پاس کسری (بادشاہ) کے سامان کا تھیلہ لایا گیا۔ اور عمر کے سامنے رکھ دیا گیا لوگوں میں سراقہ بن مالک بھی تھے عمرؓ نے اس کے کنگنوں کو لے کر سراقہ کی طرف پھینک دیا انہوں نے ان کو لے کر اپنے ہاتھوں میں ڈال لیا۔ تو وہ ان کے کندھوں تک جا پہنچے (یہ دیکھا) عمر نے فرمایا ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں کہ کسری بن ہرمز کے کنگن سراقہ بن مالک ابن جعشمؓ کے ہاتھوں میں ہیں جو ایک دیہاتی ہے بنو مدلج میں سے پھر فرمایا اے اللہ بلاشبہ میں نے جان لیا ہے کہ تیرا رسول اس بات پر حریص تھا کہ مال پہنچ جائے تو اس کو تیرے راستے میں اور تیرے بندوں پر خرچ کر دے۔ پھر تو نے اسے روکے رکھا یہ محض تیرا کرم اور احسان تھا۔ اے اللہ بلاشبہ میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں کہ یہ عمر کے ساتھ تیری خفیہ تدبیر ہو۔ پھر دونوں آیت آیت "ایحسبون انما نمدہم بہ من مال وبنین، نسارع لہم فی الخیرا، بل لایشعرون" تلاوت کی۔

---

[1] ۔[رواہ الترمذی: باب ماجاء فی افتراق ہذہ الامۃ]

بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ: یعنی ان کا یہ گمان درست نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھیں شعور ہی نہیں کہ مال واولاد کی یہ فراوانی انھیں مہلت دینے کے لیے اوران پر حجت تمام کرنے کے لیے ہے کہ جس قدر انھیں ڈھیل ملے اسی قدران کے گناہوں کا پیمانہ اورلبریز ہواور پھر بھرپور طریقے سے ان پر گرفت کی جائے۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کی نافرمانی کرے اوراللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں کمی محسوس نہ کرے وہ فکر کرلے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی رسی دراز کی جارہی ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۙ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ
بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۵۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ۙ﴿۵۹﴾
وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ
رٰجِعُوْنَ ۙ﴿۶۰﴾ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا
سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾ ﴾

بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈرتے ہیں۔(۵۷) اور وہ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں۔(۵۸) اور وہ لوگ جو اپنے رب کے ساتھ (کسی کو) شریک نہیں کرتے۔(۵۹) اور وہ لوگ جو دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل اس بات سے ڈرتے رہتے ہیں کہ ان کو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا

ہے۔(۶۰) یہی وہ لوگ ہیں جو نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں وہ ان کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں۔(۶۱)

مومنوں کی تحسین کی پانچ وجوہات

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی مذمت فرمائی تھی اور ان آیتوں میں حسب ذیل پانچ وجوہ سے مومنین کی تحسین فرمائی ہے:

(۱) مومنین اپنے رب سے ڈرتے ہیں، مقاتل اور کلبی وغیرہ نے کہا وہ اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور بعض مفسرین نے کہا وہ اپنے رب کے ڈر سے دائما اس کی اطاعت کرتے ہیں اور تحقیق یہ ہے کہ جس شخص کے دل میں اپنے رب کا خوف کامل درجہ کا ہوگا، وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے ناراض ہونے سے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذب سے بے حد خوف زدہ ہوگا اور جس شخص کا یہ حال ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بہت دور رہے گا۔

(۲) اور جو لوگ اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہی، اس کا معنی یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی ذات اور صفات پر نشانیاں بکھری ہوئی ہیں جو لوگ ان نشانیں میں غور اور فکر کر کے صاحب نشان تک پہنچتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان لاتے ہیں۔

(۳) اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ شرک نہیں کرتے، اس سے مراد شرک جلی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی ذات اور صفات پر نشانیاں بکھری ہوئی ہیں جو لوگان نشانیوں میں غور اور فکر کے صاحب نشان تک پہنچتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان لاتے ہیں۔

اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ شرک نہیں کرتے، اس سے مراد شرک جلی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اس کو مستلزم ہے کہ اس کے ساتھ شرک نہ کیا جائے بلکہ اس سے مراد شرک خفی ہے یعنی وہ ریا کاری نہیں کرتے اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت صرف اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں کسی کو دکھانے اور سنانے کے لیے اللہ کی عبادت نہیں کرتے۔

(۴) اور جو لوگ (اللہ کی راہ) جو کچھ دیتے ہیں وہ خوف زدہ دلوں کے ساتھ دیتے ہیں، اس سے مراد وہ تمام کام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر لازم کر دیئے ہیں خواہ ان کا تعلق حقوق اللہ سے ہو، جیسے نماز اور زکوۃ وغیرہ یا انکا تعلق حقوق العباد سے ہو جیسے لوگوں کی امانتیں ادا کرنا اور ان کے قرض ادا کرنا اور ان کے معاملات میں عدل وانصاف کرنا۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے اس آیت کے متعلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا: والذین یوتون ما اتوا وقلوبھم وجلۃ (المومنون: ٦٠) کیا اس آیت کا مصداق وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں اے صدیق کی بیٹی اس کا مصداق وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور صدقہ کرتے ہیں اس کے باوجود وہ اس سے ڈرتے ہیں کہ ان کی یہ عبادتیں قبول نہ کی جائیں۔ [1]

(۵) وہ لوگ نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں، اس کا معنی یہ ہے کہ وہ بہت رغبت اور اہتمام سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور انہیں یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کہیں یہ عبادت اپنے وقت سے موخر نہ ہو جائے اور کہیں اس عبادت کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ ہو جائے اور فرمایا وہی نیکیوں میں سبقت

۱۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۷۵ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث، ٤١٩٨ مسند حمیدی رقم الدیث، ۲۷۵ المستدرک ج ۲ ص ۳۹۳ شرح السنۃ ج ٦ ص ۲۵)

کرنے والے ہیں، یعنی وہ دوسرے لوگوں سے پہلے نیکی کرنا چاہتے ہیں یا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ عبادت کے اجر میں سبقت کرنے والے ہیں ان کو انکی نیکیوں کا اجر آخرت سے پہلے دنیا میں بھی مل جاتا ہے۔

﴿ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾ بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿٦٣﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿٦٤﴾ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ ۖ قف اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿٦٥﴾ ﴾

اور ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو بالکل ٹھیک ٹھیک بتادے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (۶۲) بلکہ ان کے دل ان باتوں کی طرف سے غفلت میں ہیں اور اس کے علاوہ ان لوگوں کے اور بھی اعمال (بد) ہیں جن کو یہ کر رہے ہیں۔ (۶۳) یہاں تک کہ جب ہم نے ان کے آسودہ حال لوگوں کو عذاب میں پکڑا تو اس وقت وہ فریاد کرنے لگے۔ (۶۴) آج فریاد نہ کرو بلاشبہ تم کو ہماری طرف سے مدد نہ دی جائے گی

(۶۵)۔

انسان کو اس کی طاقت کے مطابق مکلف بنایا گیا ہے

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔۔: یعنی ہم نے اپنے مومن بندوں کی جو صفات بیان کی ہیں، یہ ایسی نہیں ہیں کہ انسان کی وسعت اور گنجائش سے باہر ہوں اور وہ ان پر عمل نہ کر سکتا ہو۔ کیونکہ یہ ہمارا دستور ہی نہیں کہ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف دیں۔ اسی لیے جہاں عذر آتا ہے رخصت دے دی جاتی ہے۔ پانی نہیں تو تیمم کر لو، سفر ہے تو نماز قصر کر لو اور روزہ افطار کر لو، بیمار ہو تو بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھ لو، خوف ہے تو پیدل یا سوار ہی پڑھ لو، بھوک سے بے بس ہو تو بقدر ضرورت حرام کھا لو، اگر نفس کی سرکشی سے نافرمانی ہو جائے تو توبہ کر کے پلٹ آؤ۔ پھر اتنی آسانیوں کے بعد بھی بے رخی اور سرکشی کی روش اپناؤ، تو یاد رکھو کہ ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو حق کے ساتھ بولتی ہے، جس میں تمہارا چھوٹا، بڑا، ظاہر اور مخفی ہر عمل محفوظ ہے۔ رازی نے فرمایا: "کتاب کو انسان کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو بولتا ہے، کیونکہ کتاب تو بولتی نہیں، بلکہ جو اس میں لکھا ہوتا ہے اس کا اظہار کرتی ہے۔" مگر اب وڈیو کیمرے کے ذریعے سے کسی بھی شخص کے عمل کی تصویر بھی محفوظ ہوتی ہے اور آواز بھی۔ اس لیے اس تاویل کی ضرورت نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تو ہمارے خیال سے بھی کہیں بلند ہے، جس کے حکم سے چمڑے اور ہاتھ پاؤں بول کر سب کچھ بتائیں گے، اس کے حکم سے کتاب کا بولنا کونسا بعید ہے۔

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا : سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "بیشک دین آسان ہے اور دین میں جو کوئی سختی اختیار کرے گا تو دین اس پر غالب آجائے گا (اس کی سختی نہ چل سکے گی)، اس لیے اپنے عمل میں پختگی اختیار کرو اور (جہاں تک ممکن ہو)

میانہ روی کی چال چلو (اور ثواب کی امید رکھو) اور خوش رہو اور صبح کی عبادت، شام کی عبادت اور آخر رات کی عبادت سے مدد حاصل کرو۔"[1]

انسان کے دل سے اپنے رب کا خوف اور آخرت کی جواب دہی کا تصور ختم ہو جائے تو وہ غفلت کا شکار ہو جاتا ہے۔ غفلت کا شکار شخص نیک کاموں میں دلچسپی نہیں لیتا۔ غفلت کا بنیادی سبب دنیا کی عیش و عشرت اور مال کی ہوس ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے خوف سے عاری اور فکر آخرت سے لاپرواہ طبقہ معاشرے میں ترقی اور فیشن کے نام پر ہر قسم کی برائی پھیلانے کا موجب بنتا ہے۔ اکثر اوقات یہ طبقہ اس وقت تک ہوش کے ناخن نہیں لیتا جب تک ان پر عذاب نہیں آتا یا کسی سخت مصیبت میں مبتلا نہیں ہوتا۔ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے یا یہ لوگ کسی سخت مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو پھر آہ وزاری اور چیخ و پکار کرتے ہیں۔ اس وقت زبان حال انہیں پکار پکار کر کہتی ہے۔ اب چیخو، چلاؤ لیکن اللہ تعالیٰ تمہاری مدد نہیں کرے گا اور یہی صورت حال ان کی موت کے وقت ہوتی ہے یہ دل ہی دل میں آہ وزاری کر رہے ہوتے ہیں تو موت کے فرشتے انہیں جھڑکیاں دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج جس طرح چاہو آہ وزاریاں کرو تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔ یہاں لوگوں کی غفلت کو ان کے اعمال نہ کرنے کی وجہ قرار دیا گیا۔ غفلت کرنے والوں میں سب سے پیش پیش ہمیشہ مال دار طبقہ ہوا کرتا ہے کیونکہ عوام میں انہی کے ذریعے عیاشی اور فحاشی اور شریعت سے دوری پیدا ہوتی ہے۔ عذاب تو سب پر آتا ہے لیکن مال دار طبقہ کو احساس دلانے کے لیے ارشاد ہوا ہے کہ ہم ان کے سرمایہ داروں کو پکڑتے ہیں۔

وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ : یعنی کچھ دیگر اعمال بھی ان کے مقدر میں لکھ

---

[1]۔ [بخاری، کتاب الایمان، باب الدین یسر: ۳۹]

دیے گئے ہیں، جنھیں یہ اپنی موت سے پہلے ضرور انجام دیں گے، تاکہ عذاب کے مستحق قرار پاسکیں، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! ایک شخص اہل جنت کے سے عمل کرتا رہتا ہے، حتیٰ کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، مگر کتاب اس سے سبقت لے جاتی ہے اور وہ اہل دوزخ کا سا کوئی عمل کر کے جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔"[1]

﴿ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ۝۶۶ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ۝۶۷ ﴾

بیشک میری آیتیں تم کو پڑھ کر سنائی جاتی تھیں تو تم ایڑیوں کے بل الٹے پاؤں بھاگ جایا کرتے تھے۔ (٦٦) غرور و تکبر کرتے ہوئے، رات کو باتیں کرتے ہوئے اسی کے بارے میں بے ہودہ بکواس کرتے تھے۔ (٦٧)

شانِ نزول: (آیت) "۔مستکبرین بہ"۔ (الخ)

اب ابی حاتمؒ نے سعید بن جبیرؓ سے روایت کیا ہے کہ قریش قوم بیت اللہ کے گرد قصے کہانیاں کہا کرتی تھی اور طواف نہیں کرتی تھی اور پھر اس پر فخر کرتے چنانچہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

---

[1]۔[مسلم، کتاب القدر، باب کیفیۃ خلق ال آدمی فی بطن أمہ۔۔الخ: ٢٦٤٣۔ بخاری، کتاب القدر، باب: ٦٥٩٤]

(بے شک ہماری) قرآنی (آیتیں پڑھی جاتی تھیں تم پر' تو تم) اسے سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے اور (الٹے پاؤں لوٹتے تھے اپنی بڑائی مارتے) کہ ہم حرم کے رہنے والے ہیں' دوسروں سے برتر و بہتر ہیں۔۔ یا یہ کہ۔۔قرآن کریم کی تکذیب کر کے اپنے کو بڑا ظاہر کرنے والے (اس کی کہانیاں بناتے بیہودہ بکتے تھے)' یعنی قرآن کریم کو افسانہ کہہ کر بکواس کرتے تھے۔(تو کیا غور نہیں کیا بات میں؟) کہ لفظ کے اعجاز اور معنی کے واضح ہونے سے جان لیتے کہ یہ کلام حق ہے۔(یا) ان کے انکاری کی وجہ یہ ہے کہ' (آ گیا ان کے پاس جو نہیں آیا تھا ان کے اگلے باپ دادوں کے پاس)' یعنی پیغمبر کا ان کے پاس آنا' یہ کوئی خلاف عادت اور غیر معمولی کام نہیں ہے' اس سے پہلے بھی 'حضرت' نوح اور 'حضرت' ابراہیم (علیہ السلام) وغیرہ پیغمبر آئے تا کہ کوئی عذر نہ کر سکے' کہ ہمیں کتاب اور پیغمبر کی کچھ خبر ہی نہیں۔۔ اے محبوب! جس طرح حضرت نوح و ابراہیم (علیہما السلام) کو ان کے باپ دادا کی طرف ہم نے بھیجا تھا' اسی طرح آپ کو بھی ان کے واسطے پیدا کیا' تا کہ عذر نہ کریں اور آپ ان کو ڈرائیں' جیسے کہ ان کے آباء و اجداد کو پیغمبروں کے ذریعے ڈرایا گیا۔۔

﴿ اَفَلَمۡ يَدَّبَّرُوا الۡقَوۡلَ اَمۡ جَآءَهُمۡ مَّا لَمۡ يَاۡتِ اٰبَآءَهُمُ
الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۶۸﴾ اَمۡ لَمۡ يَعۡرِفُوۡا رَسُوۡلَهُمۡ فَهُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ ﴿۶۹﴾ اَمۡ
يَقُوۡلُوۡنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلۡ جَآءَهُمۡ بِالۡحَقِّ وَاَكۡثَرُهُمۡ لِلۡحَقِّ
كٰرِهُوۡنَ ﴿۷۰﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الۡحَقُّ اَهۡوَآءَهُمۡ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ

وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۷۲﴾

تو کیا ان لوگوں نے کبھی اس کلام پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس کوئی ایسی انوکھی چیز آ گئی ہے، جو ان کے اگلے باپ دادوں کے پاس نہیں آئی تھی۔(۶۸) یا انہوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں اس لیے اس کے منکر ہو گئے۔(۶۹) یا یہ کہتے ہیں کہ اسے جنون ہو گیا ہے بلکہ وہ تو ان کے پاس حقلے کر آیا ہے (یعنی قرآن) اور ان میں اکثر لوگوں کو حق برا لگتا ہے۔(۷۰) اور اگر حق ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو آسمان اور زمین اور جو ان کے درمیان ہے سب تباہ ہو جاتے بلکہ ہم تو ان کے پاس ان کی نصیحت لے کر آئے ہیں، پس وہ اپنی نصیحت سے منہ پھیر رہے ہیں۔(۷۱) کیا آپ ان سے کوئی معاوضہ طلب کر رہے ہیں! سو آپ کے رب کا اجر ہی سب سے بہتر ہے اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔(۷۲)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے پانچ چیزیں بیان فرمائی ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی بھی سبب ہوتا تو کفار کا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن پر ایمان نہ لانا معقول تھا، مگر جب ان میں سے کوئی بات

بھی نہیں تو ان کے پاس انکار، تکبر اور مذاق اڑانے کا کوئی عذر نہیں۔

اَفَلَمۡ یَدَّبَّرُوا الۡقَوۡلَ : یعنی کیا ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کلام کو انھوں نے سمجھا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ وجہ نہیں، قرآن کوئی پہیلی نہیں، کسی ایسی زبان میں نہیں جو ان کی سمجھ سے باہر ہو۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو آدمی کی سمجھ سے بالا ہو، وہ اس کی ایک ایک بات کو سمجھتے ہیں۔ مخالفت اس لیے نہیں کر رہے کہ انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی اور انھیں سمجھ نہیں آیا، بلکہ اس لیے مخالفت کر رہے ہیں کہ وہ ماننا نہیں چاہتے۔

اَمۡ جَآءَهُمۡ مَّا لَمۡ یَاۡتِ اٰبَآءَهُمُ الۡاَوَّلِیۡنَ : یعنی یا ان کے انکار کی یہ وجہ ہے کہ اس نے کوئی نرالی بات پیش کی ہے جو کبھی کسی کے سننے ہی میں نہیں آئی؟ ظاہر ہے یہ بات بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء ہمیشہ آتے رہے ہیں، یہ کوئی پہلا رسول نہیں۔ فرمایا: (قُلۡ مَا کُنۡتُ بِدۡعًا مِّنَ الرُّسُلِ)[الاحقاف:۹] ”کہہ دیجیے میں رسولوں میں سے کوئی انوکھا نہیں ہوں۔“ ان کے گرد و پیش عراق، شام اور مصر میں کئی انبیاء آئے ہیں، ان کی اپنی سرزمین میں ابراہیم اور اسماعیل (علیہ السلام) آئے، ہود، صالح اور شعیب (علیہ السلام) آئے۔ یہ خود ان کو سچے رسول مانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ مشرک نہ تھے، بلکہ توحید کی دعوت لے کر آئے تھے۔ غرض ان کے انکار کی وجہ یہ بھی نہیں کہ ان کے پاس نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آمد کوئی انوکھی بات ہے۔

تنبیہ: قرآن میں جہاں یہ ذکر ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان لوگوں کی طرف بھیجا گیا جن کے آباء کی طرف کوئی رسول نہیں آیا، وہاں مراد قریب زمانے میں رسول کا نہ آنا ہے اور یہاں مراد بعید زمانے میں رسول کا آنا ہے، جو ان کے بھی علم میں ہے، کیونکہ ابراہیم، اسماعیل، ہود، صالح اور شعیب

(علیہ السلام) کو وہ لوگ بھی رسول مانتے تھے۔

اَمۡ لَمۡ یَعۡرِفُوۡا رَسُوۡلَہُمۡ فَہُمۡ لَہٗ مُنۡکِرُوۡنَ: تیسری وجہ ان کے ایمان نہ لانے کی یہ ہوسکتی ہے کہ ایک بالکل اجنبی آدمی ان میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا ہو کہ مجھے رسول مانو، جس کے حسب نسب، صدق و امانت اور حسن اخلاق کو وہ نہ جانتے ہوں، سو یہ وجہ بھی نہیں، کیونکہ وہ ان میں سے سب سے عالی خاندان کا فرد اور عالی اخلاق کا مالک ہے۔

چوتھی وجہ ان کے انکار کی یہ ہوسکتی ہے کہ وہ کہتے ہوں کہ اسے کسی قسم کا جنون ہے اور واقعی وہ آپ کو کسی قسم کا دیوانہ یا پاگل سمجھتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی اصل وجہ نہیں ہے، کیونکہ وہ ہٹ دھرمی سے اپنی زبان سے جو چاہیں کہتے رہیں، مگر دل سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کمال دانائی کے قائل ہیں، کیونکہ خود انھوں نے صادق اور امین کا لقب دیا ہے۔ بھلا پاگلوں کو یہ لقب دیا جاتا ہے، پھر وہ کیسا دیوانہ ہے (یا مستشرقین کی ہرزہ سرائی کے مطابق مرگی کے دورے کا مریض ہے) کہ دیوانگی یا مرگی کے دورے کے وقت اس کی زبان سے قرآن جیسا کلام نکلتا ہے، جس کی سب سے چھوٹی سورت کا جواب پیش کرنے سے پوری کائنات قاصر ہے اور جس نے تیئیس (۲۳) برس کے مختصر عرصے میں ساری دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔

بَلۡ جَآءَہُمۡ بِالۡحَقِّ وَ اَکۡثَرُہُمۡ لِلۡحَقِّ کٰرِہُوۡنَ: جب یہ بات بھی نہیں تو نتیجہ یہی ہے کہ جو دعوت اس رسول نے پیش کی ہے وہ حق ہے، جب کہ ان کے اکثر حق بات کو ناپسند کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان کی شتر بے مہار خواہشات اور حیوانی خصلتوں کے خلاف ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ سچی بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ فرمایا: "ان میں سے اکثر حق کو ناپسند کرتے ہیں۔" کیونکہ

جو حق پسند تھے وہ ایمان لے آئے۔

اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ خَرۡجًا ۔۔: ”خَرۡج“ اور ”خَرَاج“ کسی شخص کو ادا کیا جانے والا روزانہ، ماہانہ یا سالانہ عطیہ۔ یہ ان کے انکار کی پانچویں وجہ ہے، جو ممکن ہو سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، یا پھر یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ آپ ان سے روزانہ، ماہانہ یا سالانہ کسی تنخواہ کا سوال کرتے ہوں، جسے وہ بوجھ محسوس کرتے ہوں، تو ان سے کہہ دیجیے کہ مجھے تم سے کسی اجرت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان کا دیا ہوا تو ختم ہو جائے گا مگر دنیا اور آخرت میں آپ کے رب کی طرف سے عطا کیا جانے والا رزق کبھی ختم ہونے والا نہیں اور اس سے بہتر روزی دینے والا کوئی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب آپ دعوت حق کا یہ کام بالکل بے لوث ہو کر کر رہے ہیں اور ان سے کوئی حق الخدمت طلب نہیں کرتے تو ان کا آپ کی دعوت کو ٹھکرانا سراسر حماقت اور عاقبت نااندیشی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کئی جگہ صاف اعلان کرنے کا حکم دیا ہے کہ میں تم سے کسی اجرت یا بدلے کا مطالبہ نہیں کرتا۔

﴿ وَاِنَّكَ لَتَدۡعُوۡهُمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۷۳﴾ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوۡنَ ﴿۷۴﴾ وَلَوۡ رَحِمۡنٰهُمۡ وَكَشَفۡنَا مَا بِهِمۡ مِّنۡ ضُرٍّ لَّلَجُّوۡا فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۷۵﴾ وَلَقَدۡ اَخَذۡنٰهُمۡ بِالۡعَذَابِ فَمَا اسۡتَكَانُوۡا لِرَبِّهِمۡ وَمَا يَتَضَرَّعُوۡنَ ﴿۷۶﴾ حَتّٰٓى اِذَا فَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيۡدٍ

إِذَا هُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ﴿٧٧﴾

اور بلاشبہ تم تو انہیں سیدھی راہ کی طرف بلاتے ہو۔(۷۳)اور بیشک جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ سیدھے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں۔(۷۴)اور اگر ہم ان پر رحم فرمائیں اور جو تکلیف انہیں لاحق ہے اس کو دور کر دیں، پھر بھی وہ لوگ ضرور اپنی سرکشی میں بھٹکنے پر اصرار کرتے رہیں گے۔(۷۵)ان کا حال یہ ہے کہ ہم نے انہیں عذاب میں پکڑا تھا پھر بھی نہ انہوں نے اپنے رب کے آگے عاجزی کی اور نہ ہی وہ گڑگڑائے۔(۷۶)یہاں تک کہ جب ہم ان پر ایک سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے تو وہ اس میں بالکل مایوس ہو کر رہ جائیں گے۔(۷۷)

پیغمبر تو صراط مستقیم کی طرف بلاتا ہے

یعنی آپ کے صدق و امانت کا حال سب کو معلوم ہے جو کلام آپ لائے اس کی خوبیاں اظہر من الشمس ہیں، معاذ اللہ آپ کو خلل دماغ نہیں، ان سے کسی معاوضہ کے طالب نہیں، جس راستہ کی طرف آپ بلاتے ہیں بالکل سیدھا اور صاف راستہ ہے جس کو ہر سیدھی عقل والا بسہولت سمجھ سکتا ہے کوئی اینچ پینچ نہیں ٹیڑھا ترچھا نہیں۔ ہاں اس پر چلنا ان ہی کا حصہ ہے جو موت کے بعد دوسری زندگی مانتے ہوں اور اپنی بدانجامی سے ڈرتے ہوں، جسے انجام کا ڈر اور عاقبت کی فکر ہی نہیں وہ کب سیدھے راستہ پر چلے گا، یقیناً ٹیڑھا رہے گا، اور سیدھی سی بات کو بھی اپنی کجروی سے کج بنا لے گا۔

اس آیت کریمہ میں بھی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دی گئی ہے کہ نہ آپ کی دعوت میں کوئی کجی ہے اور نہ دعوتی جدوجہد میں کوئی کوتاہی ہے بلکہ آپ کی دعوت تو زندگی کی صحیح شاہراہ پر چلنے کی دعوت ہے اور اسی شاہراہ پر چل کر ہی انسان منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ قریش کی مخالفت کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ اس شاہراہ کے مسافر نہیں جس کی آپ دعوت دے رہے ہیں اور جس منزل کی طرف آپ انھیں لے جانا چاہتے ہیں وہ سرے سے اس منزل کو تسلیم ہی نہیں کرتے یعنی انھیں آخرت کے وجود ہی سے انکار ہے۔ اور یہ بالکل ایک سیدھی سی بات ہے کہ جو شخص آخرت پر یقین نہیں رکھتا اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد اور نتیجہ نہیں اور اسے کسی کے سامنے اپنی زندگی کے اعمال کی جوابدہی نہیں کرنی۔ تو اسے آخر اس بات کی کیا فکر ہوسکتی ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ اس کے سامنے تو صرف جسمانی ضروریات اور خواہشاتِ نفس کی تکمیل کے سوا کچھ نہیں۔ اگر پیٹ کا جہنم بھرتا رہے اور نفسانی خواہشات کو غذا مہیا ہوتی رہے تو اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ صراط مستقیم کتنا دور نکل گیا ہے۔ اس کے لیے حقوق اللہ بھی بے معنی ہیں اور حقوق العباد بھی لایعنی باتیں ہیں۔ اچھائی برائی کا تصور اور اخلاقی پابندیاں محض توہمات کا ایک پھندا ہیں جسے لوگوں نے اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے۔ جب تک اس بنیادی تصور میں تبدیلی نہیں آتی اس وقت تک آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت اور توحید اور آخرت کی باتیں قریش اور دیگر مخالفین کے لیے بے وقت کی راگنی ہیں جسے ان کی سماعتیں برداشت نہیں کرسکتیں۔

اہل قریش کے کفر وطغیان پر مزید نکیر کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا کہ ان کا باطن اس قدر سیاہ ہو چکا ہے کہ اگر ہم ان کے حال پر رحم کرتے ہوئے بھوک اور قحط سالی کی تکلیف کو دور بھی کر دیں، تو بھٹکتے پھریں گے

اور ایمان نہیں لائیں گے۔اس کا عملی تجربہ بھی ہو چکا ہے کہ ہم نے انھیں بھوک اور قحط سالی میں مبتلا کیا اور میدان بدر میں ان میں سے بہت سے قتل کیے گئے اور جو باقی رہے وہ پابند سلاسل کر لیے گئے، لیکن انھیں اس کی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اپنے رب کے سامنے جھکتے اور گریہ وزاری کرتے، بلکہ اپنے کفر پر اکڑے رہے۔ چنانچہ جب ان کی سرکشی حد سے بڑھ گئی، تو ہم نے ان کے سامنے شدید عذاب کا ایک دروازہ کھول دیا جس کی سختیوں نے انھیں بھیانک یاس و ناامیدی میں مبتلا کر دیا۔

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ ۔۔:"اَخَذْنٰهُمْ "(ہم نے انھیں پکڑا) میں"هُمْ "(اُن) سے مراد موجودہ کفار و منکرین نہیں بلکہ اس سے مراد ان جیسے وہ منکرین ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور جو اپنے اپنے دور میں اسی طرح کے کفر و انکار پر اڑے ہوئے تھے۔موجودہ دور کے منکرین کو تاریخ کے اس سبق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کے لیے آنے والے عذابوں سے سبق نہیں لیتے، یہاں تک کہ وہ اپنے آخری ہولناک انجام کو پہنچ کر رہتے ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ پہلے کمتر درجے کا عذاب بھیجتا ہے، تاکہ لوگ سنبھل جائیں، فرمایا: (وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ)[السجدۃ:۲۱] "اور یقیناً ہم انھیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے۔" پھر جب لوگ اس عذاب سے عبرت نہیں پکڑتے تو ان کی رسی دراز کر دی جاتی ہے اور انھیں نافرمانی کے باوجود خوش حالی عطا کر دی جاتی ہے، تاکہ ان پر حجت تمام ہو جائے۔قرآن مجید میں یہ مضمون کثرت سے بیان ہوا ہے۔

شان نزول: (آیت)"۔ولقد اخذنھم بالعذاب"۔(الخ)

بیہقیؒ نے دلائل میں بیان کیا ہے کہ ابن اثال حنفی جب گرفتار ہو کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضور اقدس سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے وعدہ لیکر چھوڑ دیا پھر وہ مکہ کو چلا گیا اور مسلمان ہو گیا (قریش نے اس کو گرفتار کرنا چاہا وہ بھاگ کر) مکہ اور یمامہ کے درمیان آ کر بیٹھا اور یمامہ سے جو غلے کی رسد مکہ کو آیا کرتی تھی اس کو روک دیا، قریش بھوکے مرنے لگے ، یہاں تک کہ جانوروں کا اون کھانے لگے، مجبور ہو کر ابوسفیان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ کیا آپ کا یہ دعوی نہیں ہے کہ آپ کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ حضور اقدس سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بیشک یہی بات ہے۔ ابوسفیان نے کہا تو (یہ کیسی رحمت ہے کہ) آپ نے آباو اجداد کو تو تلوار سے قتل کر دیا اور ان کی اولاد کو قحط سالی سے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اس آیت میں (گویا) شہادت ہے اس بات کی کہ اگر ہم نے دوسرا عذاب بھی ان سے دور کر دیا تو یہ اللہ کے سامنے زاری نہیں کریں گے جیسے پہلے عذاب میں گرفتار ہونے کے بعد اللہ کی طرف انھوں نے رجوع نہیں کیا اور زاری نہیں کی۔

بعض مفسرین نے اس عذاب سے مراد وہ قحط لیا ہے جو ہجرت سے پہلے مکہ والوں پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بددعا سے مسلط ہوا اور سخت عذاب والے دروازے سے مراد یوم بدر لیا ہے، جبکہ بعض نے اس عذاب سے مراد بدر اور سخت عذاب والے دروازے سے مراد ہجرت کے بعد ثمامہ بن اثال ؓ کے گندم روک لینے سے واقع ہونے والا قحط لیا ہے۔ ابن جزی "التسہیل" میں فرماتے ہیں: "زیادہ راجح یہ ہے کہ پہلے عذاب سے مراد دنیا کا عذاب ہے اور شدید عذاب سے مراد موت اور آخرت کا عذاب ہے۔ کیونکہ شدید عذاب وہی ہے، دنیا کا عذاب اس کے مقابلے میں ادنیٰ ہے۔" اور فرمایا: (اِذَا

هُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ) یعنی ہر خیر سے ناامید ہونگے۔ کفار کو یہ ناامیدی آخرت کے دن ہوگی، جیسا کہ فرمایا: (وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ) [الروم: ۱۲] "اور جس دن قیامت قائم ہوگی مجرم ناامید ہو جائیں گے۔" بدر اور قحط کے بعد تو وہ بار بار حملہ آور ہوتے رہے تھے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دیکھا کہ قریش (کسی طرح بھی) آپ کی بات نہیں سنتے تو آپ نے یہ دعا کی: (اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلَيْهِمْ بِسَبْعٍ كَسَبْعِ يُوْسُفَ) "اے اللہ! یوسف کے زمانے کے سات سالہ قحط کی طرح ان پر سات سال کا قحط بھیج کر میری مدد فرما۔" اس پر وہ قحط میں مبتلا ہو گئے اور قحط نے ہر چیز کو تباہ کر دیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ ہڈیاں، مردار اور چمڑے تک کھا گئے۔ (بھوک اور نقاہت کی وجہ سے انھیں محسوس ہوتا کہ) دھویں کے مثل کوئی چیز زمین سے نکلنے لگی ہے۔ چنانچہ ابوسفیان آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے، اے محمد! آپ کی قوم ہلاک ہو رہی ہے، آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ ان سے یہ قحط ختم کر دے۔ آپ نے درخواست منظور فرما لی اور دعا فرمائی (تو قحط ختم ہو گیا)، لیکن وہ اس کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹ گئے۔۔۔۔[1]

﴿ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸ وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۷۹ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ

---

[1] ۔[بخاری، کتاب التفسیر، باب (ثم تولوا عنہ وقالوا معلم مجنون): ۴۸۲۴]

وَالنَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۸۰﴾

اور اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے (مگر) تم لوگ کم شکر ادا کرتے ہو۔(۷۸) اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا اور اسی کی طرف تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے۔(۷۹) اور وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے اور وہی رات اور دن کا بدلنے والا ہے، پس کیا تم عقل نہیں رکھتے (۸۰)۔

اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے انسان کو کان، آنکھیں اور دل عطا کیا تا کہ حقائق دیکھ اور جان کر اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن جائے۔ اسی نے انسان کو زمین سے پیدا کر کے زمین پر پھیلایا اور بسایا اور اسی کی طرف سب نے اکٹھا ہونا ہے وہی ذات موت وحیات پر اختیار رکھتی ہے اسی کے حکم کے مطابق دن اور رات ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں لیکن پھر بھی لوگ عقل وفکر نہیں کرتے۔ ان آیات میں انسان کی تخلیق، زمین میں انسان کا رہنا سہنا، زندگی گزارنا، اور مرنا رات اور دن کے اختلاف کا حوالہ دے کر انسان کو دو باتوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے پہلی بات یہ ہے کہ انسان اپنے آپ اور کائنات کی ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی تخلیق سمجھے اور یہ حقیقت جاننے کی کوشش کرے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے فنا اور بقا بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ یہاں تک کہ میرے اعضاء اور جوارح بھی اس کی عطا کا نتیجہ ہیں اس لیے میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس کا شکر ادا کروں۔ انسان اس وقت تک اپنے رب کی نعمتوں پر شکر گزار نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے رب کی عنایات پر توجہ اور غور نہیں

کرتا۔ جسے غور وفکر کی توفیق مل جائے وہ بالیقین اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

حضرت صہیب ؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مومن کا معاملہ عجب ہے بیشک اس کے تمام کاموں میں بہتری ہے جو مومن کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ مومن کو خوش کر دینے والی چیز ملتی ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے یہ بھی اس کے لیے بہتر ہے۔"[1]

"حضرت معاذ بن جبل ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا اے معاذ! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے عرض کی اللہ کے رسول میں بھی آپ سے محبت کرتا ہوں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا نماز کے بعد یہ دعا پڑھتے رہو۔ اسے کبھی نہ چھوڑنا اے میرے پروردگار! ذکر، شکر اور اچھی عبادت کرنے پر میری مدد فرما۔"[2]

﴿ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾ ﴾

"بلکہ یہ لوگ وہی کچھ کہتے ہیں جو ان سے پہلے لوگ کہا کرتے تھے۔ (۸۱) یہ کہتے ہیں کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو کر رہ جائیں گے تو کیا ہم

۱۔ [رواہ مسلم: کتاب الزہد والرقائق، باب المؤمن امرہ کلہ خیر]

۲۔ [سنن النسائی: باب نوع آخر من الدعاء، اسنادہ صحیح]

دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔(۸۲) بیشک یہ ہم سے اور ہمارے پہلے باپ دادا سے بھی وعدہ کیا گیا تھا، یہ تو محض پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔(۸۳)

اللہ تعالیٰ کی ان بے پناہ قدرتوں اور کائنات کے اس دقیق اور حکیمانہ نظم ونسق کو دیکھ کر چاہیے تو یہ تھا کہ وہ یہ کہتے کہ یہ کائنات جس ذات عظیم کی شاہکار ہے وہ یقینا تمام صفات کمال سے متصف ہے۔اس کی قدرت کاملہ کے سامنے مردوں کو زندہ کرنا اور ایک نئی دنیا بسانا اور تمام اگلوں اور پچھلوں کو حساب کتاب کے لیے ایک جگہ جمع کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔لیکن ان عقل کے دشمنوں کا حال یہ ہے کہ بجائے اس سامنے کی بات کو تسلیم کرنے کے انھوں نے ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے جو ان کے آباؤ اجداد نے لگا رکھی تھی کہ ہم جب مرنے کے بعد متفرق ہڈیوں میں تبدیل ہو جائیں گے، آخر ہماری ہڈیاں بھی بوسیدگی کی نذر ہو جائیں گی اور مٹی کے ڈھیر کے سوا کوئی چیز باقی نہیں بچے گی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمیں از سر نو زندہ کر کے اٹھا کھڑا کیا جائے۔یہ ایک ایسی انہونی بات ہے جس سے ہمارے اگلوں کو بھی ڈرایا گیا اور ہمیں بھی اس کی دھمکی دی جا رہی ہے لیکن نہ اس سے پہلے قیامت آئی اور نہ آج آ رہی ہے۔یہ سب پرانے افسانے ہیں، قصے کہانیاں ہیں جنھیں بار بار دہرایا جا رہا ہے، ہم ان دھمکیوں میں آنے والے نہیں۔صدیاں گزر گئیں اگر قیامت کو آنا ہوتا تو وہ کبھی کی آ چکی ہوتی۔ایسی بے سروپا باتوں پر ہم یقین لانے سے قاصر ہیں اور ایسی انہونی بات کو قبول کر کے ہم اپنی زندگیوں کے عیش وآرام کو داؤ پر لگانے کے لیے تیار نہیں۔

اسی فکر کی بنیاد پر ایک آدمی نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے آ کر ہاتھ میں لیے ہوئے ایک بوسیدہ ہڈی مسلتے ہوئے کہتا ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! تم کہتے ہو کہ مردے زندہ ہوں گے بتاؤ اس ہڈی سے کس طرح انسان زندہ ہو سکتا ہے؟ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

(وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيْمُ)[یٰسٓ:۷۸-۸۱]

"اور ہمارے بارے میں مثالیں بیان کرنے لگا اور اپنی پیدائش کو بھول گیا۔ کہنے لگا کہ جب ہڈیاں بوسیدہ ہوجائیں گی تو ان کو کون زندہ کرے گا۔ کہہ دو کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ وہ سب کچھ پیدا کرنا جانتا ہے۔ وہی ہے جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی پھر تم اس (کی شاخوں کو رگڑ کر اُن) سے آگ نکالتے ہو۔ بھلا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ ان کو پھر ویسے ہی پیدا کر دے کیوں نہیں اور وہ تو بڑا پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔"

﴿ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٤﴾
سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٨٥﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ
السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿٨٦﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا
تَتَّقُوْنَ ﴿٨٧﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ
عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٨﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى

تُسۡحَرُوۡنَ ﴿۸۹﴾ بَلۡ اَتَیۡنٰہُمۡ بِالۡحَقِّ وَ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ﴿۹۰﴾

(اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ ان سے پوچھئے! تو بتاؤ کہ زمین اور اس کی تمام چیزیں کس کی ہیں؟ اگر تم جانتے ہو۔(۸۴) وہ فوراً جواب دیں گے یہ سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، تو آپ فرمایئے! تو کیا تم اس پر غور نہیں کرتے ۔(۸۵) آپ ان سے پوچھئے کہ: سات آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ ۔(۸۶) وہ فوراً جواب دیں گے یہ سب اللہ ہی کے لیے ہیں (آپ فرمایئے!) پھر تم ڈرتے کیوں نہیں؟۔(۸۷) آپ ان سے پوچھئے کہ: وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے، اور وہ بچا لیتا ہے، اور اس سے کوئی بچا نہیں سکتا بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟۔(۸۸) وہ فوراً جواب دیں گے یہ سب (صفتیں) اللہ ہی کے لیے ہیں (آپ فرمایئے!) پھر تم پر جادو کہاں سے پڑ جاتا ہے۔(۸۹) بلکہ بات یہ ہے کہ ہم نے ان کے پاس حق پہنچا دیا ہے اور بلاشبہ وہ جھوٹے ہیں۔(۹۰)

اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! جو لوگ قیامت کا انکار کرتے ہیں ان سے استفسار فرمائیں کہ جس زمین پر تم رہ رہے ہو اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کی تخلیق اور ملکیت ہے اس کا یہی جواب دیں گے کہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب کچھ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اب فرمائیں کیا پھر تم حقیقت قبول کرنے کے

لیے تیار نہیں؟ ان سے پھر استفسار فرمائیں کہ سات آسمانوں اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ ان کا جواب یہی ہوگا کہ سب کا سب اللہ ہی کا ہے۔ آپ فرمائیں پھر تم اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے سے کیوں نہیں ڈرتے۔ یہاں اہل مکہ کا عقیدہ بتلایا جا رہا ہے کہ اہل مکہ اس بات کے قائل تھے کہ زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے وہ اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے اور وہی اس کا مالک ہے۔ اہل مکہ کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا عرش سات آسمانوں کے اوپر ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر اس طرح جلوہ افروز ہے جس طرح اس کی شان ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستویٰ ہونے کے بارے میں کسی قسم کی قیل وقال نہیں کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کے عرش پر کوئی چیز متمکن نہیں اور نہ ہی اس کے عرش میں کوئی دخیل ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ قبل از اسلام عربوں کا یہی عقیدہ تھا جس بناء پر وہ کھلے الفاظ میں ان حقائق کا اعتراف کرتے تھے کہ عرش، فرش اور آسمانوں کا ایک ہی رب ہے جس کا نام "اللہ" ہے۔

"حضرت انس بن مالک ؓ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں منع کیا گیا تھا کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے غیر متعلق چیزوں کے بارے میں سوال کریں۔ ہمیں یہ بات بڑی اچھی لگتی تھی کہ دیہات میں سے کوئی سمجھ دار آدمی آئے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کرے اور ہم سنیں ایک دن ایک بدوی آیا۔ اس نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہمارے پاس آپ کا قاصد آیا اور اس نے یہ بتلایا ہے کہ آپ اپنے آپ کو اللہ کا رسول کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اس نے سچ کہا ہے دیہاتی نے سوال کیا کہ آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ نے۔ اس نے عرض کی زمین کو کس نے پیدا کیا اور اس پر پہاڑوں کو کس نے نصب کیا؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ نے۔ اس نے کہا

کیا آپ کو اللہ نے مبعوث کیا ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہاں! دیہاتی نے کہا آپ کے قاصد نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ ہم پر ایک دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں؟ آپ نے فرمایا اس نے ٹھیک بتلایا۔ دیہاتی نے کہا کہ اس کا یہ بھی کہنا ہے ہم پر سال میں رمضان کے ایک مہینہ کے روزے فرض ہیں؟ آپ نے فرمایا اس نے سچ کہا۔ اس دیہاتی نے کہا جس ذات نے آپ کو نبی مبعوث فرمایا ہے کیا ان باتوں کا اس نے آپ کو حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں! اس نے کہا آپ کے قاصد کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ہم میں سے صاحب استطاعت پر بیت اللہ کا حج فرض ہے؟ آپ نے فرمایا اس نے سچ کہا۔ پھر وہ واپس پلٹا اور کہنے لگا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا نہ میں ان میں کمی کروں گا اور نہ زیادتی۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اگر اس نے سچ کہا ہے تو یہ جنت میں ضرور داخل ہوگا۔"[1]

عرش عظیم کی قدرت

یاد رہے عرش عظیم سات آسمانوں سے اوپر ایک مقام ہے جس کی وسعت وعظمت اللہ ہی جانتا ہے بخاری میں ہے کہ فردوس جنت کا بلند تر مقام ہے اور اسکے اوپر رحمن کا عرش ہے (بخاری کتاب التوحید باب 22) حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا حاملین عرش فرشتے اس قدر عظیم ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کندھے سے اس کے کان تک کا فاصلہ سات سو برس کا ہے (ابوداؤد کتاب السنۃ باب 18) جب ان کے کندھے اتنے بڑے ہیں تو سارا جسم کتنا بڑا ہوگا اور جب عرش کو اٹھانے والے فرشتے اتنے بڑے ہی تو خود عرش کتنا بڑا ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے وہ تو لاکھوں کروڑوں سال کی

---

[1]۔[رواہ مسلم: باب فی بَیَانِ الإِیمَان باللّٰہِ وشَرَاءِ عِ الدِّینِ]

مسافت پر مشتمل ہوگا۔

قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ: "مُلْك" اور "مِلْك" دونوں کے مفہوم میں مبالغہ پیدا کرنے کے لیے لفظ "مَلَكُوْتُ" استعمال کیا گیا ہے، یعنی ایسی کامل ملکیت اور کامل بادشاہی جس میں کوئی نقص نہ ہو۔ "بِيَدِهٖ" کو پہلے لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "کہہ کون ہے وہ کہ صرف اس کے ہاتھ میں ہر چیز کی مکمل بادشاہی ہے۔" وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ: "أَجَارَ يُجِيْرُ" (افعال) پناہ دینا، کسی کو ہر ایک سے بچا کر اپنی حفاظت میں لے لینا۔ ابن کثیر فرماتے ہیں: "عرب کا دستور تھا کہ ان کا سردار کسی کو پناہ دے دیتا تو اس کی پناہ کی خلاف ورزی نہیں کی جاتی تھی اور کسی کو اس کے مقابلے میں پناہ دینے کا اختیار نہیں ہوتا تھا۔"[3] جب ان سے نیچے اور اوپر کے دونوں جہانوں کے مالک ہونے کا اقرار کروالیا تو حکم دیا گیا کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے ہر چیز کے رب ہونے کا اعتراف کرواؤ، تاکہ اس میں وہ چیزیں آجائیں جن کا ذکر ہوا ہے اور وہ بھی جن کا ذکر نہیں ہوا۔ چنانچہ فرمایا، کہہ دے وہ کون ہے کہ صرف اس کے ہاتھ میں ہر چیز کی مکمل ملکیت اور کامل بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے (یعنی جسے وہ پناہ دے دے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا) اور اس کے مقابلے میں پناہ نہیں دی جاتی (یعنی جسے وہ پکڑ لے اسے کوئی اپنی پناہ میں نہیں لے سکتا، نہ اس سے چھڑا سکتا ہے)۔

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ: یعنی وہ کہیں گے اس کا مالک بھی اللہ ہی ہے۔ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ: "تُسْحَرُوْنَ" کا لفظی معنی ہے "جادو کیے جاتے ہو۔" جادو کا اثر دماغ پر ہوتا ہے، آدمی دھوکا کھا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ پھر تمہاری مت کہاں سے ماری جا رہی ہے اور تمہارے ہوش و حواس کیسے گم ہو گئے کہ ایسی موٹی بات نہیں سمجھ سکتے۔ جب زمین و آسمان اور عرش عظیم کا مالک وہی ہوا اور ہر چیز اسی کے قبضہ و اختیار میں ہوئی

تو عبادت میں اس کا شریک کہاں سے نکل آیا اور تمہارے بدن کی ہڈیاں اور ریزے اس کی قدرت و اختیار سے نکل کر کہاں چلے جائیں گے کہ وہ انھیں زندہ نہیں کر سکے گا۔ 3 اس آیت سے معلوم ہوا کہ مشرکین عرب کا عقیدہ یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ جسے پکڑ لے اسے کوئی پناہ دے کر چھڑا نہیں سکتا اور جسے اپنی پناہ میں لے لے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ مگر افسوس کہ بعض مسلمان کہلانے والے شرک میں اس حد تک بڑھ گئے کہ مخلوق کو خالق سے بھی زیادہ اختیار رکھنے والا بنا دیا، چنانچہ ایسے ہی ایک تک باندھنے والے نے کہا ہے ؎ خدا جس کو پکڑے چھڑا لے محمد محمد کا پکڑا چھڑا کوئی نہیں سکتا عجیب بات یہ ہے کہ اس صریح شرک اور اللہ تعالیٰ کی شدید گستاخی کے باوجود انھیں اصرار ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے مسلمان ہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: (لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَى ابْنَ مَرْيَمَ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللهِ وَرَسُوْلُهُ) "مجھے حد سے مت بڑھاؤ، جیسے نصاریٰ نے مسیح ابن مریم کو حد سے بڑھا دیا، میں تو صرف اس کا بندہ ہوں، چنانچہ یہی کہو کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔" (1)

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو قول برحق کی خبر دے دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اس حقیقت کے اثبات کے لیے اس نے قطعی اور واضح دلائل پیش کر دیے ہیں۔ اس لیے کفار مکہ جو اللہ کے ساتھ غیروں کو شریک بناتے ہیں، تو یہ محض ان کی افترا پردازی ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ) [المؤمنون: ۱۱۷] "اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے، جس کی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں تو اس کا

1۔ [بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالىٰ: (واذكر في الكتاب مريم۔۔): ۳۴۴۵]

حساب صرف اس کے رب کے پاس ہے۔ بیشک حقیقت یہ ہے کہ کافر زیاں پائیں گے۔"

﴿ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾

اللہ نے نہ تو کسی کو اپنی اولاد بنایا ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ دوسرا کوئی خدا ہے، ایسا ہوتو ہر معبود اپنی اپنی مخلوقات کو لے کر چل دیتا اور ایک دوسرے پر غالب آجاتا۔ یہ لوگ جو کچھ اللہ کے بارے میں کہتے ہیں اللہ اس سے پاک ہے۔(۹۱) وہ پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا ہے جو یہ لوگ شرک کرتے ہیں "اللہ" اس سے بلند و بالا ہے۔ (۹۲)

مشرکین اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبود بھی مانتے تھے آج بھی دنیا میں لاکھوں ایسے افراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرتے ہیں اور خاص کر نصاریٰ تو اس میں بہت آگے ہیں، یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بتاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان سب لوگوں کی تردید فرمادی جو قرآن کریم میں کئی جگہ مذکور ہے، یہاں یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا اور

یہ بھی فرمایا کہ صرف وہی معبود حقیقی ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، جو لوگ اس کے علاوہ معبود مانتے ہیں ان کو سمجھانے کے لیے فرمایا کہ اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور اس لائق ہوتا کہ اس کی عبادت کی جائے تو خالق بھی ہوتا خود کسی کی مخلوق نہ ہوتا کیونکہ جس میں خالق ہونے کی اہلیت نہیں وہ معبود ہونے کا اہل نہیں سو بالفرض اگر کوئی دوسرا معبود ہوتا تو اپنی پیدا کردہ ہر چیز کو اپنے قبضہ میں رکھتا۔ اور اپنی مخلوق کو دوسرے خالق سے علیحدہ رکھتا اور اپنی مخلوق پر کسی کا اختیار نہ چلنے دیتا اور مزید براں یہ ہوتا کہ ہر معبود دوسرے معبود پر چڑھائی کرتا اور دوسرے کی مخلوق پر بھی قبضہ کرنے کا نظام بناتا، لیکن سب جانتے ہیں جو کچھ وجود میں ہے ساری اللہ تعالیٰ ہی کی مخلوق ہے جس کا سب کو اقرار بھی ہے اور یہ بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ پورے عالم کا نظام یکسانیت کے ساتھ چل رہا ہے اس میں نہ کوئی کھینچ کھانچ ہے نہ کوئی معارضہ ہے نہ مقابلہ، اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت وارادہ کے موافق ساری مخلوق کا نظام چل رہا ہے جس کو اس نے جس طرح مسخر فرمایا ہر ایک اپنے اپنے کام میں اسی طرح لگا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ کے موافق ہے، اس کو دیکھتے ہیں پھر بھی شرک کرتے ہیں، یہ سراپا گمراہی ہے (سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ) (اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو وہ اس کی نسبت بیان کرتے ہیں) یعنی نہ اس کے اولاد ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود ہے (عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ) (ہر چھپی ہوئی اور ہر ظاہر چیز کو جانتا ہے) اس صفت میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے (فَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ) (سو اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے جو لوگ شرک کرتے ہیں) یعنی لوگوں کی شرکیہ باتوں سے پاک ہے۔

﴿ قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿٩٣﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي

الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ
لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا
يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾
وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ دعا کریں کہ اے میرے رب! اگر تو مجھے وہ (عذاب) دکھائے جس کا ان (کفار) سے وعدہ کیا جارہا ہے۔(۹۳) تو اے میرے پروردگار مجھے (اس سے محفوظ رکھنا اور) مجھے ان ظالموں میں شامل نہ کرنا۔(۹۴) اور بیشک ہم اس بات پر قدرت رکھتے ہیں کہ جس عذاب کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ تم کو دکھادیں۔(۹۵) اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برائی کو اس طریقہ سے دفع دُور کیا کرو اس چیز سے جو بہت بہتر ہے ہم ان باتوں سے خوب واقف ہیں جو وہ بیان کرتے ہیں۔(۹۶) اور آپ یوں دعا کرتے رہئے کہ اے میرے رب میں شیطان کے وسوسوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔(۹۷) اور اے میرے رب، میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ شیاطین میرے پاس آئیں۔(۹۸)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی اس سنت کو متعدد بار بیان کیا جا چکا ہے کہ جب کسی قوم کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول آتا ہے اور وہ اس قوم کے سامنے اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت پیش کرتا ہے تو اب اس قوم کی زندگی کا دارومدار اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی دعوت کی قبولیت پر آٹھہرتا ہے۔ اگر وہ قوم اس دعوت کو قبول کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے انعامات کی مستحق ٹھہرتی ہے۔ اور اگر وہ تکذیب کر دیتی ہے تو پھر اسے ایک خاص مدت تک کے لیے مہلت عمل دی جاتی ہے۔ تبلیغ و دعوت کا کام برابر جاری رہتا ہے تا کہ اس قوم کو تکذیب کے نتیجے سے بچانے کی کوشش کی جائے لیکن جب وہ قوم کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ کے رسول کی بات کو مان کے نہیں دیتی تو پھر اسے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ اسے بھی مذاق بنا لیتی ہے تو پھر عذاب کا کوڑا اس طرح برستا ہے کہ وہ قوم بے نام و نشان ہو جاتی ہے۔ تاریخ میں عبرت کے طور پر اس کا نام باقی رہ جاتا ہے۔ مکہ کے لوگ بھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت مبارکہ کے بعد اسی صورتحال سے دوچار تھے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تبلیغی مساعی اپنی تمام تر اثر آفرینی کے باوجود ان کے دل و دماغ میں نفوذ پیدا نہیں کر رہی تھیں۔ تب انھیں سنت اللہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا گیا، لیکن جب عذاب آنے میں تاخیر ہوئی تو معذب قوموں کی روایت کے مطابق مشرکین مکہ نے بھی اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور وہ بار بار مطالبہ کرنے لگے کہ اگر یہ عذاب کی دھمکی واقعی اپنے اندر کوئی حقیقت رکھتی ہے تو پھر اس کے آنے میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مواقع پر اس کا جواب دیا ہے۔ سورہ یونس آیت ۴۶، سورہ رعد آیت ۴۰ اور سورہ غافر آیت ۷۷ اس پر شاہد ہیں جن سے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا آنا تو بالکل قطعی اور حتمی ہے۔ البتہ اس بات کو کسی حد تک مبہم رکھا گیا ہے کہ اس کے ظہور کا وقت کونسا ہوگا۔ پیش نظر آیت کریمہ میں اس ابہام کو

اس طرح دور فرمایا گیا ہے کہ ایک طرف آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مسلمانوں کے غلبہ و نصرت کی طرف اشارہ فرمایا گیا اور دوسرا اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کے غلبہ کا زمانہ جیسے جیسے قریب آتا جاتا ہے ویسے ویسے کافروں کی ہلاکت بھی قریب آتی جاتی اور یقینی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنے پیغمبر اور اصحاب ایمان کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے اور کافروں پر عذاب نازل کر دیتا ہے۔ اس عذاب کی ایک صورت تو یہ رہی ہے کہ ایسی کوئی آفت نازل کی جاتی ہے جس سے وہ کفار اور ان کی بستیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں اور کبھی ایسا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور ان کے ساتھیوں کو زمینی غلبہ عطا فرماتا ہے اور کافروں کو شکست سے دوچار کر کے نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔ صورت کوئی سی بھی ہو یقیناً اللہ تعالیٰ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کے لیے بھی یہ ایسا وقت ہوتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے دست دعا پھیلا دیتے ہیں اور اپنی حفاظت اور دشمنوں سے دور رکھے جانے کی دعا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اور بالواسطہ مسلمانوں کو یہ دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ الٰہی جب ان ظالموں پر تیری گرفت آئے تو ہمیں اپنی آغوش رحمت میں لے لینا اور اشارۃً یہ بتایا جا رہا ہے کہ اب اسلام کے غلبہ عمومی کے دن دور نہیں۔ اللہ تعالیٰ جزیرہ عرب کی سرزمین کو اس آب حیات سے سیراب کرنے والا ہے جسے اسلام کہتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ سرسبزی اور شادابی وجود میں آنے والی ہے جس سے قیامت تک دنیا فائدہ اٹھائے گی۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جانتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو میں ان میں نہیں ہوں گا۔ اس کے باوجود آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دعا کی تلقین فرمائی جا رہی

ہے تا کہ عذاب کی شدت کا احساس پیدا ہو اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے زیادہ سے زیادہ اجر وثواب کا سامان ہو۔ علامہ فرماتے ہیں کان (علیہ السلام) یعلم ان اللہ تعالیٰ لا یجعلہ فی القوم الظالمین اذا انزل بہم العذاب ومع ہذا امرہ الرب بہذا الدعاء والسوال لیعظم اجرہ ولیکون فی کل الاوقات ذاکراً لربہ تعالیٰ۔

سیدنا معاذ بن جبلؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ دعا فرمایا کرتے تھے: (وَإِذَا أَرَدْتَّ فِتْنَةً فِيْ قَوْمٍ فَتَوَفَّنِيْ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ) "اے اللہ! جب تو کسی قوم کے ساتھ فتنے کا ارادہ کرے، تو مجھے فتنہ میں ڈالنے سے پہلے اٹھا لینا۔"[1]

حضرت علیؓ سے روایت ہے ایک یہودی عالم کا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذمے کچھ دینار قرض تھا۔ اس نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کا مطالبہ کیا آپ نے اس سے فرمایا میرے پاس کچھ نہیں ہے کہ جس سے تیرا قرض ادا کروں۔ اس نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں یہاں سے نہیں جاؤں گا یہاں تک کہ آپ مجھ کو میرا قرض ادا کر دیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تک تو میرے پاس بیٹھا رہے گا اس وقت تک میں بھی یہاں بیٹھا رہوں گا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نماز پڑھائی آپ کے صحابہ نے اسے ڈرانا اور دھمکانا چاہا تو آپ ان کی اس حرکت پر ناراض نہیں ہوئے۔ صحابہ نے کہا اے اللہ کے رسول یہودی آپ کو روکے ہوئے ہے رسول اللہ نے فرمایا میرے رب نے مجھے نرمی کرنے والا بنایا ہے اور کسی پر ظلم کرنے سے منع کیا ہے۔ اگلے دن اس یہودی نے کلمہ پڑھ لیا اور کہا کہ میرا آدھا مال اللہ کے راستے میں

---

[1]۔ [مسند أحمد: ۵/ ۲۴۳، ح: ۲۲۱۷۔ ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ ص: ۳۲۳۵]

وقف ہے۔ اللہ کی قسم میں نے آپ کے ساتھ یہ رویہ آپ کو جانچنے کے لیے اختیار کیا۔ تاکہ میں ان اوصاف کو دیکھ سکوں جو اوصاف تورات میں محمد بن عبداللہ کے متعلق پائے جاتے ہیں اس کی جائے پیدائش مکہ ہوگی اور اس کی ہجرت مدینہ میں اور اس کی بادشاہت شام تک ہوگی نہ وہ سخت گو، نہ تندخو، نہ بازاروں میں شوروغل کرنے والا، نہ بے حیائی کرنے والا اور نہ بدکلامی کرنے ولا ہوگا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں میرے اس مال کے بارے میں اللہ کے حکم کے ساتھ فیصلہ کر دیجئے یہودی مالدار آدمی تھا۔"[1]

اللہ تعالیٰ نے اہل قریش سے چونکہ عذاب کا وعدہ کر رکھا تھا، اس لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیا کہ مشرکین آپ کا اور دین اسلام کا جو مذاق اڑاتے ہیں، اس پر آپ صبر کریں، درگزر کریں اور جہاد کے حکم کا انتظار کریں۔ آیت کے آخر میں کہا گیا ہے کہ مشرکین مکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کا کوئی شریک ہے، یا اس کا کوئی لڑکا ہے، یا وہ جو کچھ اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ جھوٹا ہے، یا قیامت اور بعث بعد الموت کی تکذیب کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان ساری باتوں سے واقف ہے اور ان مشرکوں کو اس کا عذاب بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

ارشاد فرمایا: (وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ. وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ) [حٰمٓ السجدة: ٣٤، ٣٥] "اور نہ نیکی برابر ہوتی ہے اور نہ برائی۔ (برائی کو) اس (طریقے) کے ساتھ ہٹا جو سب سے اچھا ہے، تو اچانک وہ شخص کہ تیرے درمیان اور اس کے درمیان دشمنی ہے،

---

[1]۔ [رواہ البیہقی فی دلائل النبوۃ]

ایسا ہوگا جیسے وہ دلی دوست ہے۔اور یہ چیز نہیں دی جاتی مگر انھی کو جو صبر کریں اور یہ نہیں دی جاتی مگر اسی کو جو بہت بڑے نصیب والا ہے۔"

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جو شخص دن بھر میں سو بار یہ کلمہ پڑھے: (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ) "اللہ اکیلے کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی بادشاہت ہے، اسی کو تعریف سجتی ہے اور وہ سب کچھ کرسکتا ہے" تو اس کو دس غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا، سو نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھی جائیں گی، سو برائیاں اس کی مٹائی جائیں گی اور وہ اس دن شام تک شیطان (کے شر) سے محفوظ رہے گا اور کوئی اس سے بہتر عمل لے کر نہیں آئے گا مگر جو اس سے بھی زیادہ تعداد میں یہ کلمہ پڑھے۔"[1]

سیدنا ابو قتادہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہے۔لہٰذا جب تم میں سے کسی کو برا خواب دکھائی دے، جس سے وہ ڈر جائے تو اسے چاہیے کہ (جاگتے ہی) اپنی بائیں طرف تھوکے اور اس کی برائی سے اللہ کی پناہ مانگے (اگر وہ ایسا کرے گا) تو شیطان اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔"[2]

سیدنا جبیر بن مطعمؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز کے شروع میں اس طرح تعوذ پڑھتے: (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ مِنْ نَفْخِهٖ وَ نَفْثِهٖ وَ هَمْزِهٖ) "میں اللہ کی پناہ چاہتا

---

[1]۔[بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة إبلیس وجنوده: ۳۲۹۳]

{9211}۔[بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة إبلیس وجنوده: ۳۲۹۲]

ہوں شیطان کے دم، پھونک اور جنون سے۔"[1]

سیدنا ابوالیسرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ دعا فرمایا کرتے تھے: (اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْهَدْمِ، وَ اَعُوْذُبِكَ مِنَ التَّرَدِّیْ، وَ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْغَرَقِ، وَالْحَرَقِ، وَالْهَرَمِ، وَ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ یَّتَخَبَّطَنِیَ الشَّیْطَانُ عِنْدَ الْمَوْتِ، وَ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اَمُوْتَ فِیْ سَبِیْلِكَ مُدْبِرًا، وَ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اَمُوْتَ لَدِیْغًا) "اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ کوئی مکان یا دیوار مجھ پر آ گرے اور اس بات سے کہ کسی بلند مقام سے گر پڑوں اور میں تیری پناہ چاہتا ہوں غرق ہونے سے، جلنے سے اور بہت زیادہ بوڑھا ہو جانے سے اور میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ شیطان مجھے موت کے وقت بدحواس کر دے اور اس بات سے کہ جہاد میں پیٹھ پھیرتے ہوئے مروں اور اس کیفیت سے کہ زہریلے جانور کے کاٹنے سے مجھے موت آئے۔"[2]

سیدنا سلیمان بن صردؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ دو آدمی ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے، ان میں سے ایک دوسرے کو گالیاں دے رہا تھا اور اس کا منہ سرخ ہو گیا تھا، گردن کی رگیں پھول گئی تھیں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "مجھے ایک دعا معلوم ہے اگر یہ شخص اس کو پڑھے تو اس کا غصہ جاتا رہے گا، یعنی اگر وہ یہ دعا پڑھے: (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ)۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اگر کوئی شخص

۱۔[أبوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب ما یستفتح بہ الصلاۃ من الدعاء:۷۶۴]

۲۔[أبوداؤد، کتاب الوتر، باب فی الاستعاذۃ:۱۵۵۲]

۳۔[بخاری، کتاب الأدب، باب الحذر من الغضب۔۔الخ:۶۱۱۵]

اپنی بیوی سے صحبت کرتے وقت یہ کہے: (بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا) "اے اللہ! ہمیں شیطان سے بچا اور اسے بھی جو تو ہمیں عطا کرے" پھر اگر اس کی اولاد ہو گی تو شیطان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اور نہ اس پر قابو پائے گا۔"[1]

سیدہ صفیہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک بار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اعتکاف میں تھے، تو میں رات کو آپ سے ملنے آئی اور کچھ باتیں کرنے کے بعد جب وہاں سے واپس آنے کے لیے کھڑی ہوئی، تو آپ بھی میرے ساتھ کھڑے ہو گئے، تاکہ آپ مجھے چھوڑ آئیں۔ (راوی کہتا ہے کہ) اس زمانہ میں سیدہ صفیہؓ سیدنا اسامہ بن زیدؓ کے مکان میں رہتی تھیں۔ اتنے میں دو انصاری آدمیوں کا وہاں سے گزر ہوا۔ انھوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا تو رفتار تیز کر دی۔ آپ نے انھیں آواز دی اور فرمایا: "ٹھہر جاؤ، یہ صفیہ بنت حیی ہیں (یعنی میری بیوی ہیں)۔" انھوں نے یہ سن کر کہا، سبحان اللہ! اے اللہ کے رسول! (بھلا ہم آپ پر بھی بدگمانی کریں گے)۔ آپ نے فرمایا: "شیطان آدمی کے بدن میں خون کی طرح دوڑتا ہے، میں ڈرا کہ کہیں تمہارے دل میں کوئی وسوسہ نہ ڈال دے۔۔۔"[2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنے متعلق دوسروں کو بدگمانی کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ اگر اپنے کسی فعل سے لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو اس فعل کی وضاحت کر دینی چاہیے، تاکہ بدگمانی پیدا نہ ہو۔

﴿ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝۹۹ لَعَلِّيْٓ

---

[1]۔ [بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفۃ إبلیس وجنودہ: ۳۲۷۱]

[2]۔ [بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفۃ إبلیس وجنودہ: ۳۲۸۱]

اَعۡمَلُ صَالِحًا فِیۡمَا تَرَکۡتُ کَلَّا ؕ اِنَّہَا کَلِمَۃٌ ہُوَ قَآئِلُہَا ؕ وَ مِنۡ وَّرَآئِہِمۡ بَرۡزَخٌ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

یہاں تک کہ جب ان کافروں میں سے کسی موت آجائے گی تو کہے گا اے میرے پرودگار مجھے پھر بھیج دے۔(۹۹) تا کہ میں جس (دنیا) کو چھوڑ کر آیا ہوں اس میں نیک عمل کروں، ہرگز نہیں! بلاشبہ یہ بات ہے کہ جس کا وہ کہنے والا ہے اور ان کے آگے اٹھائے جانے کے دن تک پردہ (برزخ) ہے۔(۱۰۰)

منکرین حق سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بار بار عذاب لانے کا مطالبہ کرتے تھے اس سے پہلے ان کے اس مطالبہ کا جواب دیا گیا بعد اب منکرین کو اس وقت کا احساس دلایا گیا ہے کہ جب ایسے لوگوں میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ اپنے رب سے آرزو کرتا ہے کہ کاش مجھے دنیا میں دوبارہ لوٹا دیا جائے اور میں جو کچھ کرتا رہا اس کی بجائے نیک اعمال کروں گا۔لیکن اس وقت اسے جواب دیا جاتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ وہ دل ہی دل میں روتا اور آہ وزاریاں کرتا ہے مگر اس کی آہ وزاریاں اور چیخ و پکار سوائے واویلا کی حیثیت نہیں ہوتی۔ مرنے والے کے لیے قیامت کے دن تک دنیا اور آخرت کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیا جاتا ہے۔ان آیات میں حق کے منکر کی کیفیت ذکر کی گئی ہے قرآن مجید اور حدیث میں کافر، مشرک، منافق اور خدا کے نافرمان کی موت کے وقت جو اس کی کیفیت ہوتی ہے اس کی بہت سی تفصیلات دی گئی ہیں۔ یہاں صرف ایک، دو احادیث پیش کی جاتی ہے۔

"حضرت براء بن عازبؓ بیان کرتے ہیں ہم نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ انصار کے کسی آدمی کے جنازہ کے لیے نکلے۔ قبرستان پہنچے تو ابھی قبر تیار نہیں ہوئی تھی۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیٹھ گئے ہم بھی آپ کے اردگرد بیٹھ گئے جیسے ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی آپ اس کے ساتھ زمین کرید رہے تھے۔ آپ نے اپنا سر اٹھاتے ہوئے دو یا تین مرتبہ فرمایا قبر کے عذاب سے پناہ مانگو پھر فرمایا جب دنیا کو چھوڑ کر کافر آخرت کی طرف جا رہا ہوتا ہے تو اس کے پاس آسمان سے کالے چہروں والے فرشتے آتے ہیں ان کے ہاتھ میں بدبودار بوری ہوتی ہے وہ حد نگاہ تک اس کے پاس بیٹھ جاتے ہیں پھر اس کے پاس ملک الموت آتا ہے۔ وہ اس کے سر کے قریب بیٹھ جاتا ہے۔ کہتا ہے اے خبیث نفس! اللہ تعالیٰ کے غصہ اور غضب کے سامنے پیش ہو۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ اس کی روح کو اس طرح نکالتے ہیں جس طرح گرم سلائی کو روئی سے نکالا جاتا ہے۔ اس کی روح کو نکال کر جس بوری میں ڈالتے ہیں اس سے اتنی بدبو نکلتی ہے جس طرح مردہ لاش سے گندی بدبو زمین پر پھیلتی ہے۔ وہ اس کو لے کر آسمانوں کی طرف بڑھتے ہیں۔ فرشتوں کے جس گروہ کے پاس سے گزرتے ہیں وہ کہتے ہیں یہ خبیث روح کون ہے؟ موت کے فرشتے کہتے ہیں یہ فلاں بن فلاں ہے برے ناموں سے اس کا ذکر کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ آسمان دنیا تک پہنچتے ہیں وہ اس کا دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں مگر کھولا نہیں جاتا، پھر نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت مبارکہ کی تلاوت فرمائی: "ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے یہاں تک کہ سوئی کے ناکے میں اونٹ داخل ہو جائے" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کے لیے زمین کی تہہ میں ٹھکانا بناؤ۔ اس کی روح کو نیچے پھینک

دیا جاتا ہے۔ نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت مبارکہ کی تلاوت فرمائی "جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے گویا کہ وہ آسمان سے گرا اور اسے پرندے اچک لیں یا اس کو ہوائیں کسی دور دراز مقام پر پھینک دیں۔" پھر اس روح کو اس کے بدن میں لوٹا دیا جاتا ہے۔ اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اس کو بٹھاتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے ہائے ہائے میں نہیں جانتا، پھر فرشتے پوچھتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے تو وہ کہتا ہے افسوس میں نہیں جانتا، پھر فرشتے کہتے ہیں کہ یہ شخص کون ہے جو تم لوگوں میں نبی مبعوث کیا گیا؟ تو وہ کہتا ہے افسوس میں یہ بھی نہیں جانتا۔ آسمانوں سے آواز دینے والا آواز دیتا ہے کہ یہ کذّاب ہے۔ اس کا بچھونا آگ بنا دو اور آگ کا دروازہ اس کی طرف کھول دو۔ اس کے پاس جہنم گرمی اور بدبو آتی ہے اس کی قبر تنگ کر دی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں اور اس کے پاس بدصورت گندے کپڑے اور بدبودار جسم کے ساتھ آدمی آتا ہے وہ کہتا ہے آج خوش ہو جا تجھے ذلیل کیا جائے گا وہ کہتا ہے کہ تم اس طرح کی شکل والے کون ہو جو اتنی بری خبر کے ساتھ آئے ہو۔ وہ کہے گا میں تیرا برا عمل ہوں۔ کافر فریاد کرتا کہ اے میرے رب قیامت نہ قائم کرنا۔"[1]

"حضرت عبادہ بن صامتؓ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو اللہ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جو اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ حضرت عائشہؓ یا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیویوں میں سے کسی نے کہا کہ ہم تو موت کو ناپسند کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا بات یہ نہیں حقیقت یہ ہے کہ جب

---

[1]۔[رواہ احمد: مسند براء بن عازب، اسنادہ صحیح]

مومن کی موت کا وقت ہوتا ہے تو اس کو اللہ کی رضا مندی اور انعام واکرام کی بشارت دی جاتی ہے۔اس بشارت کی وجہ سے موت اسے تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوتی ہے اس وجہ سے وہ اللہ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور اللہ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے۔اور جب کافر کی موت کا وقت آتا ہے تو اسے اللہ کے عذاب کی وعید سنائی جاتی ہے۔یہ وعید اسے اپنے سامنے چیزوں سے سب سے زیادہ ناپسند ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔"[1]

كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا: یعنی جو یہ سوال کر رہا ہوگا کہ اسے ایک بار پھر دنیا میں لوٹا دیا جائے، تاکہ نیک عمل کرے تو یہ محض اس کی زبان کی بات ہوگی جس کے مطابق عمل نہیں ہوگا، کیونکہ اگر اسے دنیا میں لوٹا بھی دیا جائے تو وہ پھر بھی نیک عمل نہیں کرے گا، کیونکہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ)[الانعام:۲۸] "اور اگر انھیں واپس بھیج دیا جائے تو ضرور پھر وہی کریں گے جس سے انھیں منع کیا گیا تھا اور بلاشبہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔"

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ: یعنی موت آجانے کے بعد ان کے اور اٹھائے جانے کے درمیان دنیا حائل ہوجائے گی اور وہ عالم برزخ میں رہیں گے، یہاں تک کہ جب قیامت آئے گی تو وہ اپنی قبروں سے اٹھائے جائیں گے، لیکن وہ زندگی عمل کی نہیں بلکہ حساب وجزا کی زندگی ہوگی۔درج ذیل حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، مسروقؒ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے عبداللہ بن مسعودؓ سے اس آیت کے معنی پوچھے: (وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ)[آل عمران:۱۶۹] "اور تو ان لوگوں کو جو اللہ کے راستے میں قتل کر دیے گئے، ہرگز

---

[1]۔[رواہ البخاری: کتاب الرقاق، باب، من أحب لقاء اللہ أحب اللہ لقاءہ]

مردہ گمان نہ کر، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق دیے جاتے ہیں۔"

سیدنا ابن مسعودؓ نے بتایا کہ ہم نے اس آیت کے معنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھے تھے، آپ نے فرمایا: "شہداء کی روحیں سبز پرندوں کے جسموں میں قندیلوں کے اندر رہتی ہیں، وہ قندیلیں عرش سے لٹکی ہوئی ہیں۔ وہ روحیں جنت میں جہاں چاہتی ہیں آتی جاتی ہیں اور پھر اپنی قندیلوں میں لوٹ آتی ہیں۔ ایک بار ان کے رب نے ان کو دیکھا اور کہا، تم کچھ چاہتی ہو؟ شہداء نے کہا، اب ہم کیا چاہیں گے، ہم تو جنت میں جہاں چاہتے ہیں آتے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تین مرتبہ یہی سوال کیا۔ انھوں نے جب دیکھا کہ اس سوال کا جواب ضرور دینا پڑے گا تو انھوں نے کہا، اے ہمارے رب! ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری روحوں کو ہمارے بدنوں میں لوٹا دے، تاکہ ہم ایک بار پھر تیری راہ میں شہید ہو جائیں۔ تو جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ اب ان کی اس کے علاوہ اور کوئی خواہش نہیں تو ان کو چھوڑ دیا گیا۔"[1]

برزخ کا معنی

ان کے پس پشت تک برزخ ہے جس دن تک انہیں اٹھایا جائے گا۔

برزخ کا معنی ہے دو چیزوں کے درمیان کی حد، روک، حائل، موت سے حشر تک کے عالم کو برزخ کہتے ہیں۔

علامہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ نے لکھا ہے جو وقت موت اور حشر کے درمیان حائل ہے وہ برزخ ہے یہ ضحاک، مجاہد اور ابن زید کا قول ہے، ضحاک نے کہا جو وقت دنیا اور آخرت کے درمیان ہے وہ برزخ ہے

---

[1]۔[مسلم، کتاب الإمارة، باب بیان أن أرواح الشهداء فی الجنة وأنهم أحیاء عند ربهم یرزقون: ۱۸۸۷]

حضرت ابن عباسؓ نے کہا برزخ حجاب ہے۔ ابن عیسیٰ نے کہا قیامت تک کی مہلت برزخ ہے کلبی نے کہا دو صوروں کی درمیان جو مدت ہے وہ برزخ ہے اور یہ مدت چالیس سال ہے، یہ تمام اقوال متقارب ہیں اور ہر وہ چیز جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو وہ برزخ ہے، جوہری نے کہا جو چیز دو چیزوں کے درمیان حائل ہو وہ برزخ ہے اور برزخ دنیا اور آخرت کے درمیان موت کے وقت سے لے کر حشر تک کا وقت ہے۔ سو جو شخص مر گیا وہ عالم برزخ میں دخل ہو گیا۔ [1]

﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿١٠١﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٢﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٣﴾ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴿١٠٤﴾ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٠٥﴾ ﴾

پھر جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن ان کے درمیان نہ کوئی رشتہ داری رہے گی اور نہ کوئی ایک دوسرے کو پوچھے گا۔ (۱۰۱) پس جن لوگوں (کے نیک عملوں) کے

۱۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۲ ص ۱۳۹ مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

پلڑے بھاری ہوں گے وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔(۱۰۲)اور جن لوگوں (کے نیک عملوں) کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔(۱۰۳) جہنم کی آگ ان کے چہروں کو جھلس دے گی اور ان کے منہ بگڑے ہوئے ہونگے۔(۱۰۴)ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں اور تم ان کو جھٹلایا کرتے تھے۔(۱۰۵)

قیامت کے دن رشتے ناطوں کا قائم نہ رہنا اور اپنے اپنے حقوق وصول کرنا

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: جس طرح لوگ دنیا میں اپنے اپنے نسب پر فخر کرتے ہیں آخرت میں کوئی اس طرح اپنے نسب پر فخر نہیں کرے گا اور جس طرح دنیا میں ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں کہ تم کس قبیلہ سے ہو اور تمہارا کیا نسب ہے آخرت میں کوئی کسی سے اس طرح سوال نہیں کرے گا اور اس دن کے شدید خوف اور دہشت کی وجہ سے کوئی شخص دور سے سے متعارف نہیں ہوگا اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب پہلا صور پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمینوں کی تمام مخلوق ہلاک ہوجائے گی ماسوا ان کے جن کو اللہ تعالیٰ چاہے گا اس دن ان کے درمیان کوئی نسب ہوگا اور نہ وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے، پھر ماسوا ان کے جن کو اللہ تعالیٰ چاہے گا اس دن ان کے درمیان کوئی نسب ہوگا اور نہ وہ ایک

دوسرے سے سوال کریں گے، پھر جب دوسرا صور پھونکا جائے گا تو وہ سب کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہوں گے ایک شخص نے حضرت ابن عباس ؓ سے اس آیت کے متعلق سوال کیا:
فاقبل بعضھم علی بعض یتساٰءلون۔ (الصفت: ۵۰) پھر وہ ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے سوال کریں گے۔

تو حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا پہلے صور کے وقت کوئی کسی سے سوال نہیں کرے گا کیونکہ اس وقت روئے زمین پر کوئی زندہ شخص نہیں ہوگا اور نہ ان کے درمیان کوئی رشتہ ہوگا اور نہ وہ کسی سے سوال کریں گے اور یہ آیت " پھر وہ ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے سوال کریں گے" اہل جنت کے متعلق ہے کیونکہ جب وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔ [1]

حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا رشتہ برقرار رہے گا

مسند احمد کی حدیث میں ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں، فاطمہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے جو چیز اسے ناخوش کرے وہ مجھے بھی ناخوش کرتی ہے اور جو چیز اسے خوش کرے وہ مجھے بھی خوش کرتی ہے، قیامت کے روز سب رشتے ناطے ٹوٹ جائیں گے لیکن میرا نسب میرا سبب میری رشتے داری نہ ٹوٹے گی۔

اس حدیث کی اصل بخاری و مسلم میں بھی ہے کہ حضور اقدس سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا فاطمہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے اسے ناراض کرنے والی اور اسے ستانے والی چیزیں مجھے ناراض کرنے والی اور مجھے تکلیف پہنچانے والی ہیں۔ مسند احمد میں ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے

۱۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۹۴۲۵-۱۹۴۲۳)

منبر پر فرمایا لوگوں کا کیا حال ہے کہ کہتے ہیں رسول اللہ کا رشتہ بھی آپ کی قوم کو کوئی فائدہ نہ دے گا۔ بخدا میرا رشتہ دنیا میں اور آخرت میں ملا ہوا ہے۔ اے لوگو! میں تمہارا میر سامان ہوں جب تم آؤ گے ایک شخص کہے گا یا رسول اللہ میں فلاں ابن فلاں ہوں میں جواب دوں گا کہ ہاں نسب تو میں نے پہچان لیا لیکن تم لوگوں نے میرے بعد بدعتیں ایجاد کی تھیں اور ایڑیوں کے بل مرتد ہو گئے تھے۔

سیدنا حضرت عمر بن خطابؓ کا حضرت ام کلثومؓ سے نکاح

مسند امیر المؤمنین سیدنا حضرت عمر بن خطابؓ میں ہم نے کئی سندوں سے یہ روایت وارد کی ہے کہ جب آپ نے ام کلثوم بنت علی بن ابی طالبؓ سے نکاح کیا تو فرمایا کرتے تھے واللہ مجھے اس نکاح سے صرف یہ غرض تھی کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا ہے کہ ہر سبب ونسب قیامت کے دن کٹ جائے گا مگر میرا نسب اور سبب۔

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے حضرت علیؓ کو بلایا اور ان سے چپکے چپکے کوئی بات کی پھر حضرت علی آ کر الصفہ (چبوترے) پر کھڑے ہو گئے وہاں حضرت عباس، عقیل اور حضرت حسین ملے، حضرت علی نے ان سے ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے کرنے کے متعلق مشورہ کیا، عقیل غضب ناک ہوئے اور کہا اے علی جوں جوں تمہارے عمر بڑھ رہی ہے تمہاری غیر دانش مندی میں اضافہ ہو رہا ہے، اللہ کی قسم اگر تم نے یہ نکاح کیا تو ایسی ایسی خرابیاں ہوں گی، پھر حضرت علی نے حضرت عباس سے کہا اللہ کی قسم! اس کا یہ مشورہ خیر خواہی کی وجہ سے نہیں ہے، حضرت عمر کے درہ سے گھبرا کر اس نے ایسی باتیں کی ہیں اور مجھے حضرت عمر بن خطابؓ نے یہ بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن ہر سبب (نکاح کا رشتہ) اور نسب

کا رشتہ منقطع ہوجائے گا سوا میرے سبب اور میرے نسب کے پھر حضرت عمر ہنسے اور فرمایا عقیل پر افسوس ہے وہ احمق اور جاہل ہے۔ (۱)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطابؓ سے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن ہر سبب اور نسب (نکاح کا رشتہ اور نسب کا رشتہ) منقطع ہوجائے گا سوا میرے سبب اور نسب کے۔ (۲)

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب سے سنا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ قیامت کے دن ہر نکاح کا رشتہ اور ہر نسب کا رشتہ مقنطع ہوجاءیگا سوا میرے نکاح اور میرے نسب کے رشتے کے۔ (۳)

حضرت مسور بن مخرمہؓ بیان کرتے ہیں کہ حسن بن حسن نے حضرت مسور بن مخرمہ کی بیٹی کا اپنے لیے رشتہ مانگا۔ حضرت مسور نے کہا حسن بن حسن سے کہنا کہ میں کس قوت اس کا جواب دوں گا پھر ان کی حضرت حسن سے ملاقات ہوئی، حضرت مسور نے اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے کے بعد کہا مجھے تمہارے نسب کے رشتہ اور تمہارے سسرالی رشتے سکو کوئی نکاح کا رشتہ یا کوئی نسب کا رشتہ یا کوئی سسرالی رشتہ زیادہ عزیز نہیں ہے لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا فاطمہ میری فرع (شاخ) ہے جو چیز اس کو خوش کرے وہ مجھے خوش کرتی ہے اور جو چیز اس کو رنجیدہ کرے وہ مجھے رنجیدہ کرتی ہے اور بیشک

۱۔(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۲۶۳۳ المستدرک ج ۳ ص ۱۷۲ طبع قدیم، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۰۳۵٤)

۲۔(المعجم الکبیر رقم الحدیث، ۲٦۳٤)

۳۔(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۲٦۳٥ حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کو امام طبرانی نے الاوسط اور لاکبیر میں روایت کیا ہے اس کے تمام راوی صحیح ہیں سوا الحسن بن سھل کے اور وہ بھی ثقہ ہے۔ مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۷۳ المستدرک ج ۳ ص ۱٤۲ سنن بیہقی ج ۸ ص ٤٦۳)

قیامت کے دن تمام نسب کے رشتے منقطع ہو جائیں گے سوا میرے نسب اور میرے نکاح کے رشتہ کے اور بات یہ ہے کہ حضرت فاطمہ کی بیٹی تمہارے نکاح میں ہے اگر تم اس کے اوپر میری بیٹی کو یہ طور سوکن لاؤ گے تو اس سے انکو رنج ہوگا پھر حضرت مسور معذرت کر کے چلے گئے۔ (۱)

حضرت سیدتنا فاطمہؓ کے فضائل اور مناقب کی احادیث

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی صاحب زادی حضرت سیدہ فاطمہ کو اپنے اس مرض میں بلایا جس میں آپ کی وفات ہوگئی تھی پھر ان سے چپکے چپکے کوئی بات کی تو وہ رونے لگیں پھر ان کو دوبارہ بلا کر کچھ کہا تو وہ ہنسنے لگیں، میں نے حضرت فاطمہ سے پوچھا وہ کیا بات تھی؟ انہوں نے فرمایا پہلی مرتبہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو یہ بتایا کہ اس درد اور مرض میں میری روح قبض کر لی جائے گی تو میں رونے لگی اور دوسری بار یہ بتایا کہ آپ کے اہل بیت میں سے سب سے پہلے میں آپ کے ساتھ ملوں گی تو میں ہنسنے لگی۔ (۲)

حضرت مسور بن مخرمہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بنو ہشام بن المغیرہ نے مجھ سے اس بات کی اجازت طلب کی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا علی بن ابی طالب سے نکاح کر دیں، میں اس کی اجازت نہیں دیتا، میں پھر اس کی اجازت نہیں دیتا، میں پھر

۱۔(المعجم الکبیر ج ۲۰ ص 25-26 رقم الحدیث: ۳۰ مسند احمد ج ٤ ص ۳۲۳ حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کی سند میں ام بکر بنت المسور ہیں ان پر نہ کسی نے جرح کی ہے نہ توثیق کی ہے اور اس کے باقی راویوں کی توثیق کی گئی ہے۔(مجمع الزوائد ج ۹ ص ۳۰۳) ان تمام احادیث کو حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷٤ھ نے المؤمنون: ۱۰۱ کی تفسیر میں روایت کیا ہے۔(تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۸٤ مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱٤۱۹ھ)

۲۔(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۷۱٦، ۳۷۱۵، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲٤۵۰ سنن النسائی رقم الحدیث: ۲٦۳ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث ۱٦۲ السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث: ۸۳٦۷ مسند احمد رقم الحدیث، ۲٦۹٤۵)

اس کی اجازت نہیں دیات، سوا اس صورت کے کہ علی بن ابی طالب میری بیٹی کو طلاق دے دیں اور ان کی بیٹی سے نکاح کر لیں، کیونکہ وہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے اور جو چیز اس کو غم گین کرتی ہے وہ مجھ کو غم گین کرتی ہے اور جو چیز اس کو ایذاء پہنچاتی ہے وہ مجھ کو ایذاء پہنچاتی ہے، یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (۱)

حضرت بریدہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تمام عورتوں میں سب سے زیادہ محبوب حضرت فاطمہ تھیں اور مردوں میں سب سے زیادہ محبوب حضرت علی تھے، یعنی آپ کے اہل بیت میں سے۔ (۲)

حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ خبر پہنچی کہ حضرت علیؓ ابوجہل کی بیٹی کا ذکر کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا: فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے جو چیز ان کو ایذاء پہنچاتی ہے وہ مجھے ایذاء پہنچاتی ہے اور جو چیز انہیں پریشان کرتی ہے وہ مجھے پریشان کرتی ہے۔ (۳)

حضرت زید بن ارقمؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسینؓ کے متعلق فرمایا میں ان سے جنگ کرنے والا ہوں جو ان سے جنگ کرے اور میں ان سے صلح کرنے والا ہوں جو ان سے صلح کرے۔ (۴)

۱۔(صحیح البخاری رقم الحدیث:۵۲۳۰ سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۲۰۷۱ سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۸۶۷ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۱۹۹۸ السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث:۸۳۷۰ مسند احمد ج ۴ ص ۳۲۸ صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۶۹۵۵ المعجم الکبیر ج ۲۲ رقم الحدیث:۱۰۱۲، ۱۰۱۱، حلیۃ الاولیاء ج ۷ ص ۳۲۵ سنن بیہقی ج ۷ ص ۳۰۷ شرح السنۃ رقم الحدیث:۳۹۵۸، ۳۹۵۷)

۲۔(سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۸۶۸ المعجم الاوسط رقم الحدیث، ۷۲۵۸ المستدرک ج ۳ ص ۱۵۵)

۳۔(سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۸۶۹ مسند حمد ج ۴ ص ۵، المستدرک ج ۳ ص ۱۵۹ حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۴۰)

۴۔(سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۸۷۰ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۱۴۵ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۲ ص ۱۹۷ المعجم الکبیر رقم الحدیث:۲۶۱۹ صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۶۹۷۷ المستدرک ج ۳ ص ۱۴۹)

حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت علی اور حضرت فاطمہؓ پر چادر ڈلای پھر فرمایا اے اللہ: یہ میرے اہل بیت اور میرے خواص ہیں، ان سے ناپاکی کو دور کردے اور ان کو اچھی طرح اپک کردے، حضرت ام سلمہ نے پوچھا یا رسول اللہ! میں بھی ان کے ساتھ ہوں؟ فرمایا بیشک تم خیر پر ہو۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ [1]

حضرت عائشہ ام المومنینؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اٹھنے اور بیٹھنے میں آپ کی سیرت اور آپ کی عادات اور طور طریقوں میں حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب سے زیادہ آپ کے مشابہہ تھیں، جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیمار ہوگئے تو حضرت فاطمہ آئیں اور آپ پر جھک گئیں اور آپ کو بوسہ دیا پھر رونے لگیں پھر آپ پر جھک گئیں پھر سر اٹھایا اور ہنسنے لگیں، میں نے دل میں کہا میں تو ان کو عقل مند عورت سمجھتی تھی مگر یہ تو (عام) عورتوں کی طرح ہیں، جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فوت ہوگئے تو میں نے ان سے پوچھا یہ باتیں کہ جب آپ پہلی بار نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جھکی تھیں پھر آپ نے سر اٹھایا تو آپ رو رہی تھیں اور جب آپ دوسری بار نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جھکیں اور سر اٹھایا تو آپ ہنس رہی تھیں اس چیز پر آپ کو کس نے برانگیختہ کیا تھا، انہوں نے میں اب اپنا راز افشاء کرنے والی ہوں، آپ نے مجھے یہ خبر دی تھی آپ اپنے اس درد میں فوت ہونے والے ہیں تو میں رونے لگی، پھر آپ نے مجھے یہ خبر دی کہ آپ کے اہل میں سب

۱۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۸۷۱ مسند احمد ج ۶ ص ۲۹۸ مسند ابو یعلی رقم الحدیث: ۶۹۱۲ المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۲۶۶۴)

سے پہلے میں آپ سے ملوں گی تو پھر میں ہنسنے لگی۔ [1]

پہلا نفخہ اور دوسرا نفخہ

سعید بن جبیرؒ نے سیدنا حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ صور پھونکے جانے سے مراد اس جگہ پہلا نفخہ صور ہے، یعنی نفخہ بیہوشی جس کے متعلق فرمایا ہے (آیت) "ونفخ فی الصور فصعق من فی السموت ومن فی الارض، فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتسآءلون"۔ جب صور پھونکا جائے گا تو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب بیہوش ہو جائیں گے اور اس روز ان کے درمیان (دنیا والی) رشتہ داریاں نہیں رہیں گی اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا۔

اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اس آیت سے مراد دوسرا صور ہے، نیز حضرت ابن مسعود نے فرمایا قیامت کے دن کسی بندہ یا بندی کا ہاتھ پکڑ کر اس کو تمام اولین اور آخرین کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا پھر ایک منادی منع کرے گا یہ فلاں بن فلاں ہے جس شخص نے اس سے اپنا کوئی حق لینا ہو وہ اس سے اپنا حق وصول کر لے، پھر کوئی عورت اپنے باپ سے کوئی حق لینے آئے گی یا اپنے شوہر سے اپنا حق لینے آئیگی یا اپنے بھائی سے یا اپنے بیٹے سے پھر حضرت ابن مسعودؓ نے یہ آیت پڑھی۔

فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتسآءلون (المومنون:۱۰۱) تو اس دن ان کے درمیان رشتے قائم نہیں رہیں گے اور نہ وہ ایک دوسرے سے سوال کر سکیں گے۔

---

[1]۔(سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۸۷۲ سنن ابوداؤد رقم الحدیث،۵۲۱۷ صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۶۹۵۳ المعجم الکبیر ج۲۲ رقم الدیث ۱۰۳۸ المسدرک ج۴ ص۲۸۷۲ سنن بیہقی ج۷ ص۱۰۱ مسند احمد ج۶ ص۲۸۲ مسند ابویعلی رقم الحدیث:۶۷۴۵، حلیۃ الاولیاء ج۲ ص۳۸، دلائل النبوۃ بیہقی ج۶ ص۳۶۴ الادب المفرد رقم الحدیث:۹۴۷)

پھر اس سے رب سبحانہ وتعالیٰ فرمائے گا ان لوگوں کے حقوق ادا کرو وہ شخص کہے گا اے میرے رب! دنیا فنا ہو چکی ہے اب میں انکو حق کہاں سے دوں، پھر اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا اس شخص کی نیکیوں میں سے ہر شخص کو اس کے حق کے مطابق نیکیاں دے دو، اگر وہ شخص اللہ کا ولی ہوگا اور اس کی نیکیوں میں سے رائی کے دانہ کے برابر ایک نیکی رہ جائیگی تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی اس نیکی کو بہت زیادہ بڑھا دے گا حتیٰ کہ اس نیکی کی وجہ سے اس کو جنت میں داخل کر دے گا پھر حضرت ابن مسعود نے یہ آیت پڑھی:

(النساء: ٤٠) بیشک اللہ ایک ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر کوئی ایک نیکی ہو تو اللہ اس کو دگنا چوگنا کر دے گا اور خاص اپنے پاس سے اس کو اجر عظیم عطا فرمائیگا۔

اور اگر وہ شخص شقی ہو تو فرشتے کہیں گے اے رب! اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور حقوق کے طلب کرنے والے باقی ہیں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا حق داروں کے گناہ لے کر اس کے گناہوں میں ڈال دو اور اس کو جہنم کی طرف دھکا دے دو۔[1]

آگے دونوں آیات میں قیامت کا ایک اور منظر بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے اعمال کا وزن۔ "مَوَازِيْنُ" کو جمع لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ میزان کئی قسم کے ہونگے، ہر عمل کے لیے مخصوص ترازو ہوگا۔ ان دونوں آیات میں اہل ایمان کے لیے خوش خبری ہے اور مشرکین کے لیے وعید، کیونکہ اصل وزن ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ہوگا، مشرکین کے عمل ویسے ہی باطل ہونگے، جیسا کہ فرمایا: (وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا) [الفرقان: ٢٣] "اور ہم اس کی طرف آئیں گے جو

---

[1] ۔(جامع البیان رقم الحدیث: ١٩٤٢٧-١٩٤٢٦ مطبوعہ دار الفکر بیروت، ١٤١٥ھ)

انھوں نے کوئی بھی عمل کیا ہوگا تو اسے بکھرا ہوا غبار بنا دیں گے۔" اور فرمایا: (اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا) [الکہف: ۱۰۵] "یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، تو ان کے اعمال ضائع ہو گئے، سو ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔"

عبداللہؓ بن عیاش بن ابی ربیعہ کے غلام زیاد نے انہیں حدیث بیان کی اس آدمی سے جس نے اسے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کیا تھا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ میں سے ایک آدمی آپ کے سامنے عرض کرنے لگا اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے دو غلام ہیں جو میرے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں، خیانت کرتے اور میری نافرمانی کرتے ہیں میں انہیں مارتا پیٹتا ہوں اور گالیاں دیتا ہوں یہ میرا معاملہ کیسا ہے؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس قدر تیری خیانت، تیری نافرمانی اور تیرے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں اگر تیری ڈانٹ ڈپٹ ان کے غلطیوں سے کم تر ہوئی تو تجھے اجر عطا کیا جائے گا اور اگر برابر ہوئی تو معاملہ یکساں ہے اور اگر ڈانٹ ان کی خطاؤں سے بڑھ کر ہوئی تو تیری نیکیوں میں کمی کی جائے گی یہ سن کر وہ شخص آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے رویا اور آہ وزاری کرنے لگا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا اللہ کی کتاب کو نہیں پڑھتا کہ قیامت کے دن ہم عدل وانصاف کا ترازو قائم کریں گے اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اگر نیکی اور برائی ایک رائی کے دانے کے برابر بھی ہوئی ہم اسے بھی لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں حساب لینے والے۔ وہ آدمی کہنے لگا اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں اس سے بہتر کوئی چیز نہیں پاتا

کہ ان غلاموں کو آزاد کردوں اور میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں میں نے انہیں آزاد کر دیا۔"[1]

اس کے بعد اہل جہنم کے عذاب اور ان کی بدصورتی کا تذکرہ فرمایا ارشاد ہے (تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ) (دوزخ کی آگ ان کے چہروں کو جھلستی ہوگی اور ان کے منہ بگڑے ہوئے ہونگے)۔

حضرت ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (وَ هُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ) کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دوزخی کو آگ بھون ڈالے گی جس سے اس کا اوپر کا ہونٹ سکڑ کر سر کے درمیان تک پہنچ جائے گا اور نیچے کا ہونٹ لٹک کر اس کی ناف پر پہنچ جائے گا۔ (رواہ الترمذی)

اللہ تعالیٰ دوزخیوں کو ان کے کفر، گناہ، محرمات کے ارتکاب اور ان بڑی بڑی باتوں کی وجہ سے جنھوں نے انھیں تباہ و برباد کر دیا تھا، سرزنش کرتے ہوئے فرمائے گا کہ کیا ہمارے رسول ہماری آیتیں تمہیں پڑھ کر سناتے نہیں تھے؟ لیکن تم انھیں جھٹلاتے رہے، تو ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ بطور معذرت صرف یہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر غالب آ گئی تھی کہ ہم دنیاوی لذتوں میں منہمک رہے، خواہشات نفس کی اتباع کرتے رہے اور راہ حق سے کوسوں دور رہے، جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: (تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ○ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ○ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ

---

[1] [رواہ احمد: مسند السیدۃ عائشۃ، اسنادہ حسن]

10 ○ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ) [الملک: ۸ تا ۱۱] "جب بھی کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا، اس کے نگران ان سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں؟ یقیناً ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تو ہم نے جھٹلا دیا اور ہم نے کہا اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری، تم تو ایک بڑی گمراہی میں ہی پڑے ہوئے ہو۔ اور وہ کہیں گے اگر ہم سنتے ہوتے، یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں نہ ہوتے۔ پس وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے، سو دوری ہے بھڑکتی ہوئی آگ والوں کے لیے۔"

﴿ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَ كُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾
رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قَالَ اخْسَـُٔوْا
فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ صلے
فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَ كُنْتُمْ مِّنْهُمْ
تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ
الْفَآئِزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ﴾

تو وہ کہیں گے، اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر غالب آ گئی اور ہم بھٹکے

ہوئے لوگ تھے۔(۱۰۶)اے ہمارے رب(ایک بار)ہمیں اس(آگ)سے نجات دے۔اگر ہم پھر بھی ایسا کریں تو بیشک ہم ظالم ہیں۔(۱۰۷)اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا اسی جہنم میں پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو ۔(۱۰۸)میرے بندوں میں سے ایک جماعت تھی جو دعا کرتے تھے کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے تو ہماری مغفرت فرمادے،اور ہم پر رحم کر،اور تو سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔(۱۰۹)تو تم ان کا مذاق اڑاتے تھے یہاں تک کہ ان کے پیچھے تم میری یاد بھی بھول گئے اور تم ان سے ہنسی مذاق کرتے رہے ۔(۱۱۰)آج ان کے اس صبر کا میں نے یہ پھل دیا ہے کہ آج یقیناً وہی کامیاب ہیں۔(۱۱۱)

منکروں کا اعتراف

اس آیت اور اس کے بعد والی دو آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ ڈانٹ سن کر کفار کہیں گے: ہم اپنے اختیار سے لذتوں اور نفسانی خواہشات کی تکمیل میں مصروف ہوئے اور یہ چیز ہم پر ایسی غالب آئی کہ ہم اس برے انجام تک پہنچ گئے اور انہی لذتوں کی وجہ سے ہم لوگ حق سے گمراہ ہو گئے تھے اور ہم نے تیرے نبی کو جھٹلا دیا اور تیری نافرمانیاں کیں۔اے ہمارے رب! ہمیں دوزخ سے نکال دے،اس کے بعد اگر ہم نے دوبارہ ویسے ہی کام کئے تو بیشک ہم اپنی جانوں پر ظلم کرنے میں حد سے بڑھنے والے ہوں

گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: دھتکارے ہوئے جہنم میں پڑے رہو کیونکہ یہ سوال کرنے کی جگہ نہیں اور مجھ سے جہنم سے نکال کر دنیا میں لوٹا دینے کی بات نہ کرو کیونکہ اب ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا۔

جہنمیوں کی فریاد

ان آیات میں جہنمیوں کی فریاد کا ذکر ہوا، اس مناسبت سے یہاں دو احادیث ملاحظہ ہوں،

(۱)۔۔حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ دوزخی لوگ جہنم کے داروغہ حضرت مالک (علیہ السلام) کو پکار کر کہیں گے اے مالک! تیرا رب (ہمیں موت دے کر) ہمارا کام پورا کر دے۔ حضرت مالک (علیہ السلام) ان سے کہیں گے کہ تم جہنم ہی میں پڑے رہو گے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فریاد کریں گے پکاریں گے اور کہیں گے: اے ہمارے ری! عزوجل، ہم پر ہماری بدبختی غالب آئی اور ہم گمراہ لوگ تھے، اے ہمارے رب! ہمیں دوزخ سے نکال دے پھر اگر ہم ویسے ہی کریں تو بیشک ہم ظالم ہوں گے۔ انہیں جواب دیا جائے گا کہ دھتکارے ہوئے جہنم میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔ اب ان کی امیدیں منقطع ہو جائیں گی اور اس وقت ندامت اور خرابی کی پکار میں مشغول ہوں گے۔

(۲)۔۔حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ دوزخی لوگ جہنم کے داروغہ حضرت مالک (علیہ السلام) کو پکاریں گے تو وہ چالیس برس تک انہیں جواب نہ دیں گے، اس کے بعد وہ کہیں گے کہ تم جہنم ہی میں پڑے رہو گے پھر وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں دوزخ سے نکال دے پھر اگر ہم ویسے ہی کریں تو بیشک ہم ظالم ہوں گے۔ اور انہیں دنیا سے دگنی عمر تک جواب نہ دیا جائے گا۔

اور دنیا کی عمر کتنی ہے اس بارے میں کئی قول ہیں: بعض نے کہا کہ دنیا کی عمر سات ہزار برس ہے، بعض

نے کہا بارہ ہزار برس اور بعض نے کہا کہ تین لاکھ ساٹھ برس۔ واللہ تعالیٰ اعلم اور آخری بیان کردہ وہ عمر بھی قطعی نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جہنمی پہلے تو داروغہ جہنم کو بلائیں گے چالیس سال تک اسے پکارتے رہیں گے لیکن کوئی جواب نہ پائیں گے چالیس برس کے بعد جواب ملے گا کہ تم یہیں پڑے رہو۔ ان کی پکار کی کوئی وقعت اور داروغہ جہنم کے پاس ہوگی نہ اللہ جل وعلا کے پاس۔ پھر براہ راست اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں گے اور کہیں گے کہ اے اللہ ہم اپنی بدبختی کی وجہ سے ہلاک ہو گئے ہم اپنی گمراہی میں ڈوب گئے اے اللہ اب تو ہمیں یہاں سے نجات دے اگر اب بھی ہم یہی برے کام کریں تو جو چاہے سزا کرنا اس کا جواب انہیں دنیا کی دگنی عمر تک نہ دیا جائے گا پھر فرمایا جائے گا کہ رحمت سے دور ہو کر ذلیل وخوار ہو کر اسی دوزخ میں پڑے رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو اب یہ محض مایوس ہو جائیں گے اور گدھوں کی طرح چلاتے اور شور مچاتے جلتے اور بھنتے رہے گے اس وقت ان کے چہرے بدل جائیں گے صورتیں مسخ ہو جائیں گی یہاں تک کہ بعض مومن شفاعت کی اجازت لے کر آئیں گے لیکن یہاں کسی کو نہیں پہچانیں گے جہنمی انہیں دیکھ کر کہیں گے کہ میں فلاں ہوں لیکن یہ جواب دیں گے کہ غلط ہے ہم تمہیں نہیں پہچانتے۔ اب دوزخی لوگ اللہ کو پکاریں گے اور وہ جواب پائیں گے جو اوپر مذکور ہوا ہے پھر دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے اور یہ وہیں سڑتے رہیں گے۔ انہیں شرمندہ اور پشیمان کرنے کے لیے ان کا ایک زبردست گناہ پیش کیا جائے گا کہ وہ اللہ کے پیارے بندوں کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کی دعاؤں پر دل لگی کرتے تھے وہ مومن اپنے رب سے بخشش ورحمت طلب کرتے تھے اسے رحمن الراحمین کہہ کر پکارتے تھے لیکن یہ اسے ہنسی میں اڑتے تھے اور ان کے بغض میں ذکر

رب چھوڑ بیٹھتے تھے اور ان کی عبادتوں اور دعاؤں پر ہنستے تھے جیسے فرمان ہے آیت (اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَكُوْنَ 29 ۝ صلے 83۔المطففین: 29) یعنی گناہ گار ایمانداروں سے ہنستے تھے اور انہیں مذاق میں اڑاتے تھے۔ اب ان سے اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کہ میں نے اپنے ایماندار صبر گذار بندوں کو بدلہ دے دیا ہے وہ سعادت سلامت نجات و فلاح پا چکے ہیں اور پورے کامیاب ہو چکے ہیں۔ [1]

﴿ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِی الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّیْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِیْمِ ﴿۱۱۶﴾ ﴾

پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم لوگ زمین میں کتنے سال رہے ہو۔ (۱۱۲) وہ کہیں گے ہم ایک دن رہے یا ایک دن سے بھی کم، آپ ان (فرشتوں) سے پوچھ لیجئے جو شمار کرنے والے ہیں۔ (۱۱۳) اللہ فرمائے گا تم بہت

۱۔ تفسیر ابن کثیر، سورہ المومنون

کمدت ٹھہرے تھے کاش تم یہ بات (اس وقت بھی) جانتے ہوتے۔(۱۱۴) کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹنے کر نہیں آؤ گے۔(۱۱۵) تو (ایسی بات سے) بہت بلند و بالا ہے اللہ جو حقیقی بادشاہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہی عرش کریم کا مالک ہے۔(۱۱۶)

دنیا کی زندگی بہت کم معلوم ہوگی

انسان کی بغاوت اور نافرمانی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے۔جس کے نتیجہ میں وہ سمجھتا ہے مرنے کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش نہیں ہونا۔ جہنمیوں کی حسرتوں میں اضافہ کرنے اور دنیا میں دی جانے والی مہلت کا احساس دلانے کے لیے۔اللہ تعالیٰ جہنمیوں سے استفسار فرمائیں گے۔ بتاؤ کہ تم دنیا میں کتنا عرصہ ٹھہرے تھے؟ جہنمی جہنم کی ہولناکیوں سے گھبرا کر کہیں گے کہ ہم دنیا میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہے۔اس کے ساتھ ہی فریاد کریں گے کہ الٰہی ہمیں کچھ یاد نہیں کہ ہم کتنی دیر ٹھہرے رہے۔آپ ان لوگوں سے استفسار فرمائیں جو گنتی کو جاننے والے ہیں۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ تم ایک دن یا اس کا کچھ حصہ نہیں ٹھہرے بلکہ ایک مدت تک ٹھہرے رہے۔اللہ تعالیٰ نے دنیا کی مدت کو قلیل مدت قرار دیا ہے اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی اور اس کی نعمتیں آخرت کے مقابلے میں قلیل ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جہنمیوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ تمہیں دنیا کی زندگی میں معمولی اختیارات اور تھوڑی سی مہلت دی گئی مگر تم نے پھر بھی اپنے رب کی نافرمانی کی۔اگر تم دنیا کی زندگی کو قلیل اور عارضی جانتے اور آخرت کی حقیقت کو سمجھتے تو

آج جہنم کے عذاب سے نجات پاتے۔

" حضرت مستورد بن شدادؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بیان کرتے ہوئے سنا اللہ کی قسم! دنیا کی مثال آخرت کے مقابلے میں اتنی سی ہے' جتنا کہ تم میں سے کوئی دریا میں اپنی انگلی ڈالے۔ پھر دیکھے کہ اس کے ساتھ کتنا پانی آیا ہے؟"۔ [1]

حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرے کندھے کو پکڑ کر فرمایا۔ دنیا میں اجنبی یا مسافر کی طرح رہو اور اپنے آپ کو اہل قبور میں شمار کرو۔ [2]

" حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ قیامت کے دن دوزخیوں میں سے ایک شخص کو لایا جائے گا' جو دنیا میں سب سے زیادہ عیش و آرام کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اسے دوزخ میں ایک غوطہ دیا جائے گا اس کے بعد اس سے پوچھا جائے گا۔ اے آدم کے بیٹے! کیا تو نے کبھی آرام دیکھا؟ اور تجھ پر نعمتوں کا کوئی دور گزرا؟ وہ کہے گا۔ اللہ کی قسم! کبھی نہیں' اے میرے رب! میں نے کبھی آرام نہیں پایا۔ پھر جنتیوں میں سے ایسے شخص لایا جائے گا' جس نے دنیا میں سب سے زیادہ تنگ زندگی گزاری ہوگی اسے جنت کی ایک جھلک دکھا کر پوچھا جائے گا' کیا تو نے کبھی تنگی دیکھی؟ کیا تجھ پر کبھی سختی کا وقت آیا؟ وہ جواب دے گا۔ اللہ کی قسم! مجھ پر کوئی تنگی نہیں آئی اور نہ ہی میں نے کبھی برا دن دیکھا۔" [3]

بعث بعد الموت کا انکار کرنے والے کافروں کو مزید ڈانٹ پلائی جا رہی ہے کہ کیا تم لوگ اس غلط فہمی میں

۱۔[رواہ مسلم: باب فَنَاءِ الدُّنْيَا وَبَيَانِ الْحَشْرِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ]

۲۔[رواہ البخاری: باب قول النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ]

۳۔[رواہ مسلم: باب صَبْغِ أَنْعَمِ أَهْلِ الدُّنْيَا فِي النَّارِ وَصَبْغِ أَشَدِّهِمْ بُؤْسًا فِي الْجَنَّةِ]

مبتلا ہو کہ ہم نے تمہیں بغیر کسی مقصد کے اور بے کار پیدا کیا ہے اور تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ ہمارے پاس لوٹ کر نہیں آنا؟ اللہ کی ذات اس سے بہت ہی بلند و بالا ہے کہ وہ کسی چیز کو بے کار پیدا کرے، ہم نے تو تمہیں اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد فرمایا کہ جو شخص اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کی بھی عبادت کرے گا، جس کی کوئی دلیل نہیں ہے، تو اسے اس برے عمل کا اپنے رب کے حضور کھڑے ہو کر حساب دینا ہوگا اور اسے اس برائی کا بدلہ مل کر رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کو پکارنا شرک ہے، اللہ تعالیٰ نے بار بار اس کی ممانعت کی ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ)[الاعراف:١٩٤] "بیشک جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہارے جیسے بندے ہیں، پس انھیں پکارو تو لازم ہے کہ وہ تمہاری دعا قبول کریں، اگر تم سچے ہو۔" اور فرمایا: (فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ)[العنکبوت:٦٥] "پھر جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو پکارتے ہیں، اس حال میں کہ اسی کے لیے عبادت کو خالص کرنے والے ہوتے ہیں، پھر جب وہ انھیں خشکی کی طرف نجات دے دیتا ہے تو اچانک وہ شریک بنا رہے ہوتے ہیں۔" اور فرمایا: (يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ، مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ)[الحج:٧٣، ٧٤] "اے لوگو! ایک مثال بیان کی گئی ہے، سو اسے غور سے سنو! بیشک وہ لوگ جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، ہرگز ایک مکھی پیدا نہیں کریں گے، خواہ وہ اس کے

لیے جمع ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے وہ اسے اس سے چھڑا نہ پائیں گے۔ کمزور ہے مانگنے والا اور وہ بھی جس سے مانگا گیا۔ انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جو اس کی قدر کا حق تھا۔ بیشک اللہ یقیناً بہت قوت والا ہے، سب پر غالب ہے۔" آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سکھایا کہ وہ ہر حال میں اپنے رب کی حمد و ثنا بیان کرتے رہیں اور اس سے مغفرت و رحمت کی دعا کرتے رہیں۔

الْمَلِكُ الْحَقُّ: پہلی صفت یہ ہے کہ وہ سچا بادشاہ ہے، اس کی بادشاہی حق اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ دوسرے بادشاہ نہ اپنی بادشاہی کے حقیقی مالک ہیں اور نہ ان کی بادشاہی حق اور باقی رہنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہتا ہے حکومت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے، جیسا کہ فرمایا: (قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ) [آل عمران:٢٦] "کہہ دے اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے۔" جب کوئی عقل مند آدمی بے مقصد کام نہیں کرتا تو سچا بادشاہ جو ساری کائنات کا اور بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اس کے متعلق تم نے کیسے گمان کر لیا کہ اس نے تمھیں عبث اور بے مقصد پیدا کر دیا ہے؟

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ: یہ دوسری صفت ہے، جس میں پیدا کرنے کی حکمت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ بادشاہی میں یکتا ہے، بلکہ اس کے سوا کوئی معبود ہے ہی نہیں، عبادت صرف اسی کا حق ہے، کس قدر نادان ہو کہ اس وحدہ لاشریک لہ معبود نے تمھیں اپنی توحید اور عبادت کے لیے پیدا فرمایا اور تم نے گمان کر لیا کہ

ہمیں پیدا کرنے کا کوئی مقصد ہی نہیں۔

رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ : عرش کا معنی تخت ہے۔ کسی چیز کے کریم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اس کی جنس کی اشیاء کی تمام خوبیاں اور کمالات موجود ہوں اور وہ ان سب سے بلند اور باشرف ہو، جیسے فرمایا: (اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ)[النمل:۲۹] "بیشک میری طرف ایک عزت والا خط پھینکا گیا ہے۔" اور فرمایا: (وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ)[الدخان:۲۶] "اور کھیتیاں اور عمدہ مقام۔" اور فرمایا: (كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ)[الشعراء:۷] "ہم نے اس میں کتنی چیزیں ہر عمدہ قسم میں سے اگائی ہیں۔" اور فرمایا: (وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا)[بني إسرائيل:۲۳] "اور ان سے بہت کرم والی بات کہہ۔" (ابن عاشور و راغب) اس آیت میں یہ اللہ تعالیٰ کی تیسری صفت ہے کہ وہ کائنات کی سب سے بڑی مخلوق عرش الٰہی کا مالک ہے، جو زمین و آسمان اور اس میں موجود ساری مخلوق کو محیط ہے اور سب سے بلند ہے، تو وہ باقی مخلوقات کا مالک کیوں نہ ہوگا۔

عرش الٰہی کو کریم (عزت و شرف والا) اس لیے فرمایا کہ کسی جگہ کی عزت اس کے رہنے والے کی وجہ سے ہوتی ہے، جیسے کہتے ہیں "فُلَانٌ مِنْ بَيْتٍ كَرِيْمٍ " کہ فلاں شخص باعزت گھر کا فرد ہے۔ کیونکہ اس گھر کے رہنے والے معزز ہوتے ہیں۔ عرش کی سب سے بڑی عزت اور اس کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ اس پر رب کریم مستوی ہے اور اس عرش ہی سے تمام احکامات اور ساری رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔

[3] پورے قرآن مجید میں "رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ " اسی مقام پر آیا ہے۔ "رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ " دو جگہ آیا ہے، سورہ توبہ (۱۲۹) اور نمل (۲۶) میں۔ یہاں عرش کی صفت کریم اس لیے آئی ہے کہ

یہاں اللہ تعالیٰ کے عیب سے منزہ ہونے اور دنیا اور آخرت میں اس کی صفت عدل کا بیان مقصود ہے، جب کہ سورہ توبہ اور نمل میں اس کی صفت قہر و جبروت کا بیان مقصود ہے۔ (بقاعی)

﴿ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ ﴾

اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے سو ان کا حساب اس کے رب کے پاس ہے، بیشک کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ (۱۱۷) اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دعا کیجیے اے میرے رب! مجھے بخش دے اور رحم فرما اور تو ہی سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔ (۱۱۸)

جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے اور کسی دوسرے کو اپنا حاجت روا، مشکل کشا اور بگڑی بنانے والا خیال کرتا ہے اس کے پاس ایسا کرنے اور سمجھنے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں بلاشبہ وہ عقل وفکر کا اندھا ہے اور اس کا حساب اللہ رب ذوالجلال والاکرام کے پاس ہے اور اس کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اس کے اس فیصلہ کا اعلان کر دیا گیا ہے کہ وہ ایسے کافروں کو کبھی فلاح نہیں دے گا۔ توحید الٰہی کی مکمل وضاحت ان چند الفاظ میں کر دی گئی اور اسی وضاحت کو جگہ جگہ مزید مثالیں دے کر سمجھایا گیا اور انہی اشارات واستعارات اور ان کی وضاحت کے لیے قرآن کریم کا تیسرا حصہ

خاص کر دیا گیا۔لیکن افسوس کہ آج بھی ہم میں سے کتنے ہیں جن کی جہالت روز روشن کی طرح عیاں ہے اور وہ اپنی جہالت پر فخر کرتے ہوئے غیر اللہ کے ناموں کے درود و وظیفے کرتے اور کراتے ہیں اور غیر اللہ کو حاجت روا و مشکل کشا سمجھتے اور بیان کرتے ہیں اور ان کے پاس آج بھی جہالت کی وہ سب سے بڑی دلیل موجود ہے کہ ہمارے باپ دادا ایسا ہی کرتے آئے ہیں' کیا وہ سب غلط تھے؟۔

پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے

سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک مصیبت زدہ شخص پر گزر ہوا جس کے کان میں تکلیف تھی۔سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے "افحسبتم" سے لے کر آخر سورت تک آیتیں پڑھ کر اس کے کان میں دم کیں تو وہ اچھا ہو گیا۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جب اس کا علم ہوا تو یہ فرمایا کہ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔اگر یقین والا مرد اس کو پہاڑ پڑھ دے تو وہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔

اخرجہ الحکیم والترمذی وابن المنذر وابونعیم فی الحلیۃ واخرون عن ابن مسعود۔[1]

تا قیامت: دعاؤں کا طلب گار

ڈاکٹر اسلامی ریسرچ اسکالر محمد طاہر بھٹی المالکی چک قاسمکا

ا۔(روح المعانی ص ٦٥ ج ١٨، وتفسیر قرطبی ص: ١٥٧، ج ١٢)